مادرِ جمہوریت

بیگم نصرت بھٹو

جی این مغل

مادرِ جمہوریت

بیگم نصرت بھٹو

جی این مغل

بھٹو لیگیسی فاؤنڈیشن

مادرِ جمہوریت

بیگم نصرت بھٹو

جی این مغل

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

اہتمام بشیر ریاض

پروڈکشن رانا عبدالرحمن - ایم سرور

کمپوزنگ محمد انور

پرنٹرز ایچ ایچ پرنٹرز، لاہور

اشاعت 2016ء

قیمت $:18 - £:15 - Rs:1400

ناشر بھٹو لیگیسی فاؤنڈیشن

158-C ماڈل ٹاؤن، لاہور

پاران ایم ایچ پنھور انسٽيٽيوٽ آف سنڌ اسٽڊيز، ڄامشورو.

Digitized by M. H. Panhwar Institute of Sindh Studies, Jamshoro.

تقسیم کار:

بُک ہوم

بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

فون: 042-37231518-37245072 فیکس: 042-37310854

bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com

www.bookhomepublishers.com

www.bhutto.org

انتساب

پاکستانی عوام کے نام!

www.bhutto.org

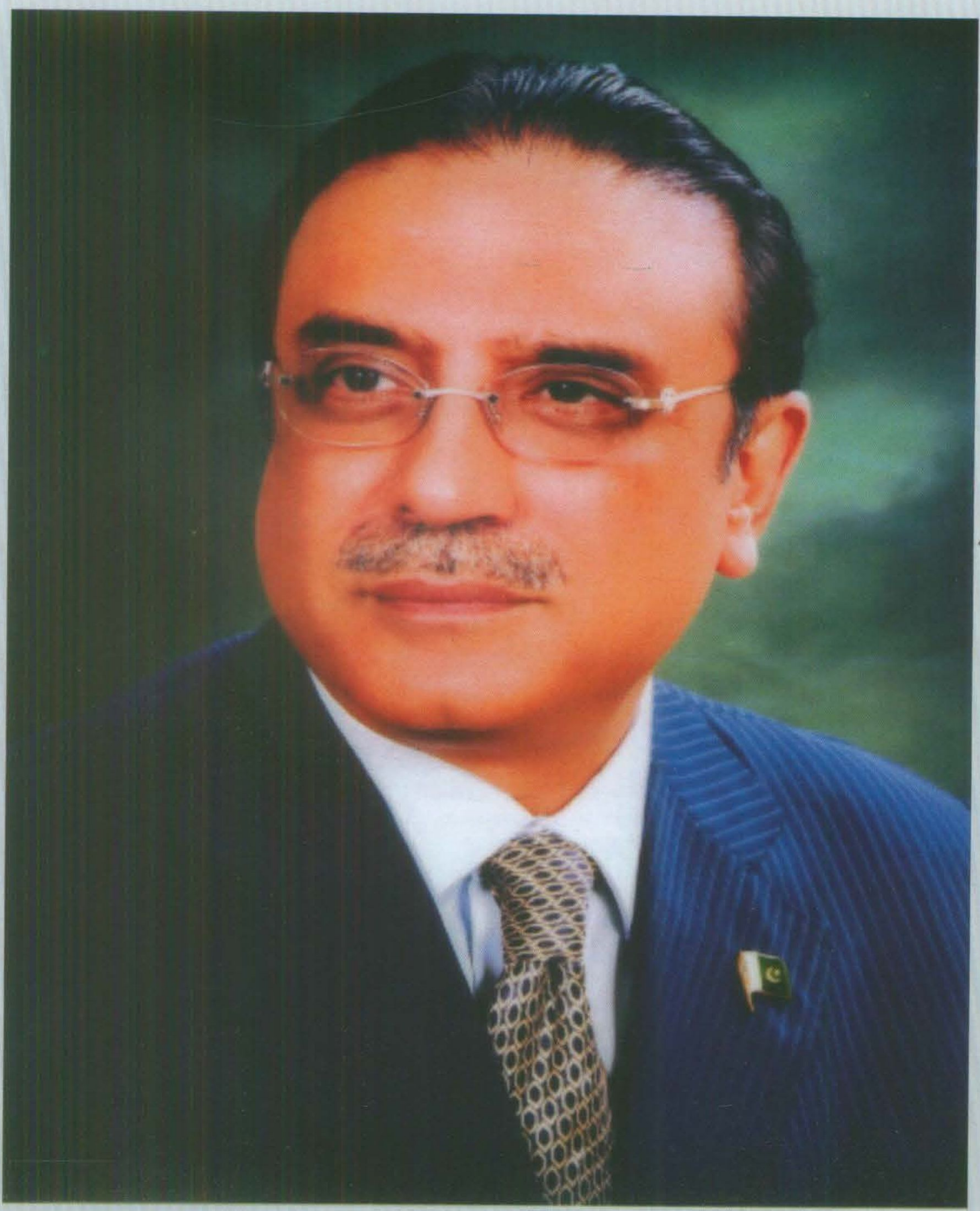

The Bhutto Legacy Foundation was founded by the Co-Chairman of the Pakistan People's Party Mr. Asif Ali Zardari with a view to spread the political philosophy and views of Quaid-e-Awam Zulfiqar Ali Bhutto and Mohtarma Benazir Bhutto Shaheed.

ء2009

بیگم نصرت بھٹو

شانہ بشانہ، قدم بہ قدم، رفاقت اور سوچوں کی ساعتیں

عوامی حقوق کی صبح کے انتظار میں زندگی پہ شام اترتی گئی

بیگم صاحبہ، جدوجہد کی آزمائشوں میں استقلال کی علامت

جنرل ضیا کے عہدِ ستم گر کی ایک ناقابلِ فراموش تصویر

''بیگم نصرت بھٹو''

اسلام آباد کے کوفے سے میں سندھ مدینے آئی ہوں
مت پوچھو کیا کھو آئی ہوں مت پوچھو کیا لائی ہوں
اسلام آباد کے کوفے سے میں سندھ مدینے آئی ہوں
کچھ منظر ہیں، کچھ یادیں ہیں، کچھ آنسو، کچھ فریادیں ہیں
کچھ لمحوں کی سوغاتیں ہیں، کچھ گھڑیوں کی رودادیں ہیں
کچھ سنگ زنوں کے تحفے ہیں، جو کچھ بھی ملا لے آئی ہوں
اسلام آباد کے کوفے سے میں سندھ مدینے آئی ہوں

یہ شعر راولپنڈی کی جیل میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے بعد مادر جمہوریت بیگم نصرت بھٹو کی سندھ واپسی پر پاکستان کے ممتاز انقلابی شاعر جوہر میر (جن کا نام میر قربان علی تھا) نے کہے تھے اور یہ سب سے پہلے پاکستان پیپلز پارٹی کے ترجمان رسالے ''نصرت'' کے پچھلے صفحہ پر زخمی بیگم بھٹو کی تصویر کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔ جوہر میر کو ان اشعار کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی، انہیں ملک بدر ہو کر امریکہ میں سیاسی پناہ حاصل کرنا پڑی جہاں انہیں زندگی کی آخری سانس تک امریکہ میں رہنا پڑا اور ان کا انتقال نیویارک میں 2004ء میں ہوا۔

فہرست

○ یادداشتوں کا باب 8

1- بیگم نصرت بھٹو: خاندانی پس منظر 28

2- ''بھٹو خاندان کی مختصر تاریخ'' 33

3- ''ذوالفقار علی بھٹو اور نصرت بھٹو کی شادی'' 39

4- بھٹو خاندان کی جدوجہد 44

5- بھٹو خاندان کی قربانیاں 50

6- بھٹو کی سیاست میں بیگم بھٹو کا کردار 62

7- عوامی سیاست کا دور 74

8- ایک اور سیاہ رات 91

9- مادرِ جمہوریت 116

10- بھٹو خاندان کی اولاد 158

www.bhutto.org

سیاسی جدوجہد

11- نشانِ پاکستان 166
12- ٹوٹ جائیں وہ ہاتھ جنہوں نے ماں پر گولیاں چلائیں 169
13- ''یہ دفتر ہے یا گودام؟'' 195
14- بیگم نصرت بھٹو......جرأت مند عظیم خاتون 205
15- چند یادیں! بیگم نصرت بھٹو 210
16- مادرِ جمہوریت، نشانِ پاکستان 214
17- عزم و ہمت کا پیکر 218
18- عوام کی طاقت ہمارے ساتھ ہے 222
19- جرأت و عظمت کو سلام 229
20- مزاحمت کی علامت 240
21- میری بیٹی کا خیال رکھنا 247
22- خاتونِ اوّل بیگم نصرت بھٹو سے خصوصی انٹرویو 255
23- ذوالفقار علی بھٹو کی گردن پر پھانسی کا کوئی نشان نہیں تھا 268
24- میر مرتضیٰ بھٹو سے انٹرویو 282

یادداشتوں کا باب

واجد شمس الحسن

نوعمری سے عمرِ عزیز کے ان ڈھلتے دنوں یا اترتی شاموں تک کی دو سے زائد دہائیوں کے دورانیئے میں بلاشبہ میں اپنے لیے ایک منفرد اعزاز محسوس کرتا ہوں، یہ کہ مجھے پاکستان کے مردوخواتین سیاست دانوں کی کہکشاؤں کو دیکھنے اور جاننے کے ناقابلِ فراموش مواقع دستیاب ہوئے!

پاکستان کے ان تاریخی مردوخواتین سیاسی شخصیات سے میرے باہمی روابط اس وقت قریب تر اور فیصلہ کن صورت اختیار کر گئے جس وقت میں نے صحافت کا کیریئر اپنا لیا، وہ بھی پاکستان میں جمہوریت پر مارے جانے والے پہلے شب خون کے دنوں میں جب ایوب خان نے جمہوریت کی گاڑی پٹڑی سے اتاری اور ملک میں پہلے مارشل لاء کا نفاذ عمل میں آیا، تو اس بچے کی سطح پر جو ابھی پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہا تھا، برصغیر کے مرد رہنماؤں کے جلو میں ایک برقع پوش خاتون کی موجودگی سے مجھے ہمیشہ اِک گونہ حیران کن سی مسرت کا احساس ہوتا۔ وہ تھی، مشہورِ زمانہ "بی اماں" مولانا محمد علی جوہر کی رفیقۂ حیات، برصغیر میں اس وقت کے ایک جید مسلم لیڈر!

یاد رہنا چاہیے، ہمارے بانی رہنما قائداعظم محمد علی جناحؒ کا ساری زندگی، مسلم آبادی

کے نصف، مسلمان عورتوں کے بارے میں، ایمان رہا کہ انہیں زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے دوش بدوش، پورے یقین و عزم کے ساتھ برابر کا کردار ادا کرنا چاہیے، چاہے وہ سیاست ہو، تجارت ہو، کاروباری میدان یا صنعتوں کی دنیا ہو، ڈاکٹری، تعلیم یا کاشتکاری کے شعبے ہوں، سرکاری حتیٰ کہ فوج میں جانے کی بھرپور جدوجہد کا راستہ بھی اپنائیں! اس تناظر میں آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی ایک رکن کے طور پر بی اماں، مسلم عورت کے طور پر قائداعظم کے نظریاتی ایمان کی علامت تھیں!

آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ پولٹ بیورو برطانوی غلامی اور ہندو تسلط کے خلاف تحریک آزادی کا قافلہ سالار تھا۔ بی اماں اس علامت اور کردار کے طور پر مسلم لیڈرشپ کے ایوان میں کوئی عمومی قد کاٹھ کی خاتون نہ تھیں، ان کی زبان سے نکلے الفاظ صف اول کی مرکزی مسلم قیادت کے لیے خصوصی سچائی اور حقیقت کا درجہ رکھتے تھے، ان رہنماؤں کے نزدیک بی اماں کے نظریات اور خیالات کو جداگانہ احترام کا مقام حاصل تھا۔ یہ برصغیر کی تقسیم سے پہلے کے منظر کی صرف ایک جھلک ہے، ابھی میں صرف چھ برس کے سن میں تھا جب ہم نے دہلی سے پاکستان ہجرت کی۔

جب میں 69 برس پیچھے مڑ کر پاکستان کی تصویر پر نگاہ ڈالتا ہوں، ہمیں متعدد بڑے رہنما یاد آتے ہیں، ان یادگار شخصیات نے پاکستان کی سیاست میں کوئی نہ کوئی نتیجہ خیز کردار ادا کیا۔

تاہم جمہوریت، انسانی حقوق، قانون کی حکمرانی اور آزادی اظہار کے حوالے سے چند نام ہی سامنے آتے ہیں۔ دوسری جانب اس صف میں خواتین رہنماؤں میں سے بھی بعض نام ہی لیئے جا سکتے ہیں۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناحؒ جنہیں پاکستانی احترام اور محبت سے ''مادرِ ملت'' پکارتے ہیں، وہ بھی اس صف میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں، حالانکہ وہ ڈینٹل سرجن کے طور پر تربیت یافتہ تھیں، وہ اپنے بھائی کی زندگی میں مسلسل ان کے ہم

رکاب رہیں۔ انہیں قائداعظم کی انتہائی قربت کے باعث پاکستانی سیاست کے اصل چہرے کا اندازہ اس گھڑی ہوا جب وہ اپنے بھائی کے بغیر سیاسی تگ وتاز سے دوچار ہوئیں!

قائداعظم محمد علی جناح ہی کی طرح مادرِ ملت بھی مکمل طور پر ایک نڈر اور بے باک خاتون لیڈر تھیں، وہ اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہ کرتیں، نہ ہی کسی فوجی آمر کی جانب سے جمہوریت سے بغاوت کو زیادہ دیر تک برداشت کرسکتی تھیں۔ جب پاکستان کی اپوزیشن کو خودساختہ فیلڈ مارشل ایوب خان سے انتخابی مقابلے کے لیے کوئی ''مرد'' نہ مل سکا، اپوزیشن رہنماؤں سمیت پوری قوم کی نظریں مادرِ ملت کی شخصیت پر مرتکز ہوگئیں۔ اپنی صحت کی کمزوری کے باوجود اس تاریخ ساز موقع پر مادرِ ملت نے ایوب خان کے مقابلے میں اس دور کی متحدہ حزب اختلاف کا صدارتی امیدوار بننا قبول کرلیا۔ ایوب خان سے انتخابی مقابلے میں مادرِ ملت کی شکست ایک لمبی کہانی ہے، کس طرح برہنہ دھاندلی سے کام لیا گیا۔ کس طرح اپنے مفاداتی خول میں بنیادی برائیوں کے ذریعے انتخابی نظام کا ڈرامہ رچایا گیا، دراصل جرنیل، خاکی اور غیر خاکی بیوروکریسی کا مخصوص ٹولہ، حق بالغ رائے دہی کے عوامی ووٹ پر یقین نہیں رکھتا تھا نہ ہی اس کا سامنا کرسکتا تھا، بس یہ طویل داستان اسی محور کے اردگرد گھومتی ہے۔ انہیں صرف اس انتخابی عملے کی وفاداری پر بھروسہ تھا جنہیں عوام کے ووٹوں کی گنتی کا ''فرض'' سونپا گیا، ایوب خان سے مادرِ ملت کی ''انتخابی شکست'' نے ملک میں بہت سی قوتوں کے بند کھول دیئے، انہیں روکا نہیں جا سکتا تھا، نتیجتاً تبدیلی کی لہر عہدِ رفتہ کے لیے صدائے موت کا گجر بن گئی!

مادرِ ملت کی اس انتخابی شکست کے بطن سے ابھرنے والے تُند رو سیلابی مدوجزر کے مشتعل نشیب وفراز نے پاکستان کے لیے دوررس نتائج واثرات کا دروازہ کھول دیا۔ 1965ء میں ایوب خان نے جب میدان میں جیتی ہوئی جنگ تاشقند کی میز پر ہاردی، اس وقت کا خوددار وزیرخارجہ ذوالفقار علی بھٹو اس توہین آمیز معاہدے کا حصہ بننے پر تیار نہ ہوا جس کی خوشی میں بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری نے اسی رات موت کو گلے لگا لیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو ایوب

کابینہ سے فوری طور مستعفی ہو گئے۔ بھٹو صاحب کا استعفیٰ اور ایوب خان کی قومی وقار و آن کے ساتھ شرمناک دھوکہ دہی نے پاکستانی عوام میں اس کی اجتماعی مخالفت کا طوفان برپا کر دیا۔

بھٹو صاحب ایوب خان کے غیض و غضب کا ہدف بن گئے۔ ایوب خان نے اپنے سرکاری ''شکاری کتے'' ان کا قصہ ہی ختم کرنے کے لیے ان کے تعاقب میں لگا دیئے۔

پاکستان میں قومی سیاست کا یہ وہ بدقسمت بلکہ منحوس موڑ ہے جہاں سے حکومت مخالف سیاستدانوں کی کردار کشی کے رسوا کن کلچر کی شروعات ہوئیں۔ جیل کی سلاخوں میں بند ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف جھوٹے اور خود ساختہ مصنوعی مقدمات کا ایک پہاڑ کھڑا کر کے ان کے شب و روز پریشان حالی کی ساعتوں میں ڈھال دیئے گئے۔ بھٹو صاحب کی زندگی کے اس نازک ترین سنگ میل نے ان کی اس وقت قطعی غیر سیاسی شخصیت، اور رفیقہ حیات بیگم نصرت بھٹو کو کثیر الجہات مسائل اور مشکلات میں مبتلا کر دیا۔ بیگم صاحبہ کو ایک ہی وقت میں نہ صرف چار چھوٹے بچوں کی پرورش اور نگرانی کا بار اٹھانا پڑا بلکہ قید و بند میں ایوب خان کے ''شکار'' اپنے خاوند کی زندگی بچانے کی جنگ بھی لڑنا پڑی، جبکہ وہ لوگ جو بھٹو صاحب کے دور اقتدار میں جانوروں کے جھنڈ کی طرح انہیں گھیرے رکھتے تھے ان کی اسیری اور ان کے ساتھ ایوب کے منتقمانہ اقدامات کے خلاف قانونی جنگ کی حمایت میں سامنے آنے کی جرات تک نہ کر سکے!

مقتدر اخبار نویس جی این مغل کے قلم سے بیگم نصرت بھٹو کی اعلیٰ ترین تحقیقی معیار کے ساتھ لکھی گئی سوانح کا ''پیش لفظ'' تحریر کرنا میرے لیے حد درجہ مسرت آگیں ہے، ''مادر جمہوریت'' کے موضوع ترین تاریخی عنوان سے جی این مغل کی یہ تحریری کاوش بیگم صاحبہ کی جدوجہد پر رقم شدہ بیانیوں اور یادوں کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہے، وہ جدوجہد جو پاکستان کے نازک حالات کی تاریخ کو اپنی سمندر جیسی وسعت میں سمیٹے ہوئے ہے! جی این مغل نے ایک تاریخی خدمت انجام دی ہے، میرے دوست جناب بشیر ریاض، چند بلکہ معدودے چند یادگار لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، ہمیشہ ہوں گے، ان کی ذاتی، فکری، صحافتی، سیاسی اور بہ حیثیت

پارٹی دانشور ممتاز شخصیت کا پہلا باب اس صدی میں عالم اسلام اور پاکستان کے عظیم المرتبت عالمی لیڈر اور قائد عوام کے عبقری عہد میں وا ہوا، ابھی تک بشیر ریاض کی حیات مستعار کے یہ ابواب جاری ہیں۔ یہ ابواب عبارت ہیں، بھٹو لیگیسی کے تعمیراتی حیرت کدے میں قیام پذیر اُن کی گراں قدر خدمات سے!

تاریخ انسانی اور جمہوری طرز زندگی کے ارتقاء اور جلا کے لیے بھٹو کے جاں فشا اور سوز دروں پر مبنی عوامی ریکارڈ کے تذکرے اور 'حق بحقدار رسید' کے حوالے سے حرف طباعت پر مدت مدید سے ایک واجب الادا قرض تھا، بشیر ریاض نے اسے اتارنے میں اپنے شب و روز کا ہر سانس داؤ پر لگا دیا، قابل قدر کتابوں اور تاریخی دستاویز کی مسلسل اشاعت نے حرف طباعت پر بھٹوز کا یہ ''قرض'' ایسے چکایا گیا جیسا کہ عرض کیا، ''حق بحقدار رسید!''

مجھے یقین ہے میری نسل کے افراد کو جی این مغل کی یہ کتاب تاریخ پاکستان کے ان گرم پانیوں کے عہد میں اٹھائے گئے چھوٹے چھوٹے قدموں کی یادوں میں لے جائے گی جس عہد کی جمہوری جدوجہد کے ہم خود بھی عینی شاہد ہیں!

پاکستان کے نشیب و فراز کے حوالے سے بیگم نصرت بھٹو کی زندگی پر لکھا گیا یہ یادگار مجموعہ نئی نسلوں کے لیے حوصلہ افزا امیدوں کے نئے چراغ روشن کرے گا خصوصاً خواتین اس سے بے پناہ متاثر ہوں گی۔ عزم راسخ کے ناقابل شکست جذبے اُن کا زادِ راہ بنیں گے، جس صنف کو پاکستان میں برابری اور احترام کے اس مقام تک پہنچنے میں ابھی ایک طویل سفر طے کرنا ہے جس مقام کو اسلام اور نبی ﷺ نے ان کا استحقاق قرار دیا ہے۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی زندگی میں مختلف ذاتی اور اجتماعی مواقع پر قومی تعمیر میں عورتوں کو مردوں کے برابر کی حصہ دار قرار دیا۔ مختلف شعبہ حیات میں مستعدی اور تیزی کے ساتھ ترقی کرنے میں انہیں مردوں کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا ہوگا۔ ان کے یہ ناقابل فراموش الفاظ آج بھی ہمارے کانوں میں گونجتے اور دلوں پہ دستک دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا ''اگر ہم اپنی مسلم آبادی کے 50 فیصد

یعنی خواتین کو، زندگی کے ہر شعبے میں اپنے ساتھ لے کر نہیں چلتے تب ہم پہ مقدر کے دروازے بند ہو جائیں گے، نہ کوئی ترقی و تعمیر ہو سکے گی نہ مستقبل کی نسلیں بہتر طریقے سے پروان چڑھائی جائیں گی۔'' قائداعظم کے سچے پیروکار شہید ذوالفقار علی بھٹو، تاریخ ساز رفیقہ حیات بیگم نصرت بھٹو، ان کی ''پیاری ترین بیٹی'' نے قائداعظم کے نشان زدہ اس راستے پر چلنے کا اپنے آپ سے عہد باندھ لیا اور پاکستانی عورتوں کی خودمختاری کے نغمے تخلیق کرنے میں کسی قسم کی کوئی کسر نہ چھوڑی۔

بانی پاکستان کی جانب سے عورتوں کے لیے مختص کردار ادا کرنے کے تناظر میں تقدیر نے بیگم نصرت بھٹو کا انتخاب کیا، نوعمری کے اس ابتدائی سے معصوم مراحل میں جب مجھے اپنے ارد گرد وقوع پذیر حالات اور اونچ نیچ کا ابھی ادھورا سا ہی شعور تھا، حقیقتاً اس گزرے وقت کے جس مشاہدے کی سچائی آج بھی میرے اندر حیات آمیز اور حیات آموز سنسناہٹ پیدا کر دیتی ہے، وہ گھڑی ہے جب ہم نے 1947ء میں پاکستان کی قدم بوسی کی، رضا کاروں کی مخصوص سفید یونیفارم میں ملبوس جواں سال خواتین ورکرز، جن میں شاید غالب اکثریت کا تعلق کالج طالبات سے تھا، مہاجرین کی دیکھ بھال، ان کے کھانے پینے کے انتظامات، جہاں تک ممکن ہو ان کے آرام و آئش کا تسلسل برقرار رکھنا، ان کے فرائض تھے، اس وقت تک جب تک ان میں سے ہر فرد یا گروپ پناہ گزیں کیمپوں میں نہ پہنچ جائے۔ میں اپنے گھرانہ میں سب سے چھوٹا تھا۔ خاندان کے سربراہ اور میرے والد سید شمس الحسن کی رہنمائی میں ہم نے پاکستان کے نیلے آسمان کی ''زیارت'' کی تھی، ان نوجوان رضا کاروں نے ہی ہمارے والد کی سربراہی میں ہمارا بھی استقبال کیا تھا۔

انسانی خدمت کے پرعظمت اتھاہ جذبے میں ڈوبی ہوئیں یہ رضا کار کالج طالبات ''وومن نیشنل گارڈز'' کی رکن تھیں جس کا قیام بیگم رعنا لیاقت علی خان کی ان تھک مساعی کا شجر سایہ دار تھا، پاکستان کے پہلے وزیراعظم کی اہلیہ کی زیر قیادت اس وفد میں طویل القامتی میں

سب سے نمایاں، غیر معمولی سرخ و سفید رنگ کی ایک خاتون، جس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، وہاں موجود سب کی توجہ کا ''مرکز ثقل'' رہیں۔ یہ تو بہت برسوں بعد کا قصہ ہے جب کسی میگزین کی ورق گردانی کے دوران میں نے بیگم رعنا لیاقت علی خان کے ساتھ اس ہستی کی تصویر دیکھی اور یہ بیگم نصرت بھٹو کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ جنہیں ذوالفقار علی بھٹو کے سہرے کی کلی بلکہ پھول بننے کے بعد بیگم بھٹو کہلایا جانا تھا۔ خیر اس سمے کی نصرت خانم کی توانا ذات، بے آسرا دبے خانماں مہاجرین کے لیے ان کی محبت اور تحفظ کے زندہ جاوید احساسات نے انہیں ایک منفرد انداز کی ممتاز ترین رضا کار کا روپ دیدیا۔ جو ہر وقت ان مہاجرین کی مدد پر کمر بستہ ہو۔ جیسا کہ مقدر کے ازلی کھیل کی مسلسل کہانی ہے، نصرت خانم بعدازاں ایک ایسی نوجوان اور غیر معمولی شخصیت کے طور پر ابھریں، ان دکھی، اجڑے لوگوں کی خدمت، حفاظت اور ہمدردی سے بھرپور نگرانی کا ایسا منظر تشکیل دیا جس کے بعد کسی دوسرے کو کسی ضرورت مند کے بارے میں کسی یاددہانی کی کوئی گنجائش باقی ہی نہ رہتی۔ دراصل پاکستان کے وہ شب و روز سرتاپا لمحۂ امتحان تھے۔ مہاجرین کے کثیر انبوہوں سے بھری ہوئی ٹرینیں تقسیم ہند کے نتیجے میں بھارت سے پاک سرزمین پہ بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ مجھے بلا کسی ابہام کے واضح طور پر یاد آتا ہے، امتحان و آزمائش کی اس گھڑی میں نصرت خانم نے لیڈر شپ کی غیر معمولی صلاحیتوں کا ثبوت دیا جس نے کسی قسم کے بھی ظاہری وسائل سے تہی دست ایک نوخیز قوم میں دہشت ناک حالات کے باوجود زندگی کرنے کی نئی جوت جگا دی، عزم کے ناقابل شکست پہاڑ ایستادہ کر دیئے۔ نصرت خانم اور ان جیسی برتر خالق رضا کاروں کو، بعدازاں محترمہ فاطمہ جناح اور بیگم رعنا لیاقت علی خاں نے قلباً ان مطلوبہ الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا جس کی یہ رضا کار نوجوان طالبات یا خواتین مستحق تھیں۔ مہاجرین کے پس منظر میں نصرت خانم اور وومن نیشنل گارڈز کی ان طالبات و خواتین کی عظیم الشان خدمات پر قائداعظم محمد علی جناح کا سر بھی فخر سے بلند ہو گیا جو متاثرہ افراد اور خاندانوں کے لیے سرانجام دی گئیں۔ ان کی اس ہمالیاتی کارکردگی کی تصدیق

کرتے ہوئے ہی بانی پاکستان نے دنیا کو بتایا۔

''کسی قسم کے حالات کی کسی قسم کی بھی ہولنا کی چیلنجز اور مشکلات، ایسی قوم پر غلبہ نہیں پا سکتیں جس کے میدان کارزار میں نصرت خانم جیسی خواتین موجود ہوں۔'' واقعہ یہ ہے، تاریخ میں بہت کم خواتین ایسی ہیں جنہوں نے بیگم نصرت بھٹو کی طرح زمانے کی پیشانی پر ابدی نشانات چھوڑے ہوں، نصرت بھٹو جن کی تاریخ پیدائش 23 مارچ 1929ء تھی۔ تقسیم کے بعد برصغیر کی تاریخ میں نصرت بھٹو نمایاں، بہادر اور جرأت مند خواتین میں شمار کی جائیں گی، ایسی ہستیاں جو روز روز جنم نہیں لیتیں!

جیسا کہ وہ مقدر کا شاہکار ایک خاتون تھیں، قدرت نے اُن کی تاریخ پیدائش کے لیے 23 مارچ کا دن چنا، یہ وہ دن ہے جب ہم یوم جمہوریہ پاکستان مناتے ہیں، وہ دن جو ہمیشہ پاکستان کے جسم و جاں کا حصہ رہے گا۔ یہ ایک تاریخی اتفاقیہ لمحہ ہے جب قدرت نے، 1929ء میں 23 مارچ کے دن اصفہانیوں کو ایک نعمت سے سرفراز فرمایا، بے حد فیض رساں اور چاندنی جیسی روشنی بکھیرتی بیٹی، نصرت خانم کی صورت میں عطاء فرمائی، جسے ذوالفقار علی بھٹو جیسی کوہ پیکر شخصیت کی ہم سفر اور بے نظیر بھٹو جیسی عزیز ترین بیٹی کی ماں بننا تھا۔ بے نظیر بھٹو، جنہیں پاکستان کے اعزاز و وقار کے کھلتے شگوفے کے طور پر وطن کی بلندیوں پر کھلنا تھا۔ عالم اسلام کا ممتاز ترین رہنما جو اشرافیہ کے مقابلے میں عورتوں سمیت غریب عوام اور اقلیتوں کی آزادی، خودمختاری اور حقوق کا چیمپئن تھا، ان طبقات کے وجود اور حقوق کی نفی کے پیامبروں سے نبرد آزما ایک شہ زور جنگجو!

بیگم نصرت بھٹو، نسباً ایرانی کرد جن کا شجرہ نسب ملت اسلامیہ کے عظیم ہیرو مدبر اور مجاہد صلاح الدین ایوبی سے جا ملتا ہے، انہیں مبداء فیض نے نوعمری ہی سے برداشت، ثابت قدمی، پختہ قوت ارادی اور جرأت کے خزانوں سے بھر دیا تھا۔ وہ سونے کا چمچہ منہ میں لیے ایک بڑے ایرانی کاروباری کے ہاں پیدا ہوئیں جس کے آباؤ اجداد کراچی میں بس گئے تھے۔ جن کے

وسیع وعریض کاروبار کا نیٹ ورک برِ صغیر کی حدود سے باہر بھی پھیلا ہوا تھا۔ سچائی اور صاف گوئی کی صفات سے بہرہ ور بیگم نصرت بھٹو نے کراچی میں ذوالفقار علی بھٹو کی شکل میں اپنا شریک حیات منتخب کیا۔ یہ پہلی نظر کی محبت تھی جس نے دونوں کو رشتہ ازدواج کے بندھن میں باندھ دیا، بندھن کی یہ ڈوری ان کی شہادت کی خوشبوؤں تک ساتھ گئی، ٹوٹی نہیں، نصرت بھٹو، بھٹو صاحب کے ساتھ اپنی بے مثال وفاداری پر کسی بھی نوعیت کے سمجھوتے کی آلودگی سے پاک ومنزہ رہیں!

بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ ذوالفقار علی بھٹو کی شادی ان کی زندگی کا ایک فیصلہ کن موڑ تھا۔ گو بھٹو صاحب خود بھی ایک سر برآوردہ شجرہ نسب کے نوعمر ہونہار سپوت تھے، بہرحال گھریلو زندگی میں بیگم صاحب نے انہیں ایسا استحکام اور سکون بہم پہنچایا جس کی بنا پر وہ اپنے خون کے آخری قطرے تک قوم کی خدمت کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو مجتمع کر سکے۔۔۔۔ وہ عہد جو انہوں نے بچپن میں بانئ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے نام لکھے گئے ایک خط میں ان سے باندھا تھا۔

جب وہ سب سے کم عمر وزیر کی حیثیت سے ایوب خان کی کابینہ کا حصہ بن گئے تا آنکہ انہوں نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے استعفیٰ دیدیا۔ ان کی باصلاحیت بیوی نے ان کے چاروں بچوں بے نظیر، مرتضےٰ، صنم اور شاہنواز کی پرورش و پرداخت میں قابل تعریف کردار ادا کیا۔ بھٹو صاحب کے پیروکاروں اور پروانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی عوامی سطح پر بہترین میزبانی کر کے بھٹو صاحب کو سیاسی قوت فراہم کی۔

برداشت کی عظمت بیگم نصرت بھٹو کے خون کا حصہ تھا۔ والد کی تربیت کے صدقے اعلیٰ تعلیم کا حصول ان کی اہم ترین ترجیح رہی۔ قدرت نے آزمائش کی یہ چادر بیگم صاحب کو اوڑھا دی جس میں وہ بھٹو خاندان کے بچوں کو محفوظ کر لیں، انہیں یوں پروان چڑھائیں جو بھٹوز کی جدّ کے لیے قابل فخر سرمایہ ثابت ہوں۔

وزیر خارجہ کی رفیقہ حیات ہونے کے باوجود انہوں نے بچوں کے معاملے میں بطور

ماں اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کبھی بھی کوئی بوجھ محسوس نہ کیا۔ بچوں کی پرورش و پرداخت کے سلسلے میں ان کا دن رات ایک کر دینا شاید بھٹو کے بچوں کا نہایت درجہ تعلیم یافتہ ہونا بھی تھا۔ مذہبی عقیدے جیسی مستقل مزاجی اور کمٹ منٹ کی یہ روایت بیگم صاحبہ کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں آج بھی قائم رکھے ہوئے ہیں۔

عالم اسلام کے سرمایہ افتخار صلاح الدین ایوبیؒ کی وارث نسل کی عظمت کردار اور جرأت کی سچائی نے اس وقت اپنے رخ انور سے دنیا کو روشن کر دیا جب بیگم نصرت بھٹو اور بھٹو کے سیاسی پروانوں نے ظلم و جبر کے پیکر ضیاء الحق کی غیر آئینی حکمرانی اور فوجی اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی اس تبدیلی کے قافلہ سالار کی حیثیت رکھتی تھی کہ عوام ہی ملک کے اصل مالک و خود مختار ہیں۔ جس کے باعث بیگم صاحبہ کو پاکستانی عورتوں کو مردوں کے برابر لانے میں بھی ہر قسم کی مدد ملی، راہیں استوار ہوئیں۔ بیگم بھٹو نے ثابت قدمی کا چراغ روشن رکھا، ہر طرح کے جبر و ستم میں گھر ہونے کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری جدوجہد کا شعلہ بجھنے نہ دیا۔

مصائب زدہ لوگوں کے لیے بے لوث قربانی کی جھلکیاں تو میں نے نوعمری میں دیکھیں، جب میں نے جرنلزم کو بطور پیشہ اپنایا تب سے بیگم نصرت بھٹو کی شخصیت کے دوسرے پہلو کا علم ہوا خصوصاً 1965ء کی جنگ میں تاشقند معاہدے کے بعد اور وہ پہلو تھا ایک بے خوف، پرعزم اور ثابت قدم لیڈر ہونے کا!

اصولوں کی بنیاد پر ایوب خان سے بھٹو صاحب کی علیحدگی نے ان پہ اور ان کے خاندان پر جہنم کے دروازے کھول دیئے۔ پاکستان کے ممتاز ترین وزیر خارجہ کے طور پر انہوں نے کشمیر اور قومی مفادات کے معاملے میں ایوب خاں کی بے وفائی میں شریک بننے کے بجائے ایوب خان سے ٹکر لینے کو ترجیح دی!

اپنے متعدد ہم عصر سیاستدانوں کے برعکس جنہوں نے ایوب خاں کے پہلے فوجی شب

خون کے سامنے ہتھیار ڈالنے اور سمجھوتہ کرنے کو ترجیح دی، یہ بیگم نصرت بھٹو ہی تھیں جنہوں نے اسیری کے باعث ایوب سے بغاوت کے سبب اپنے اسیر خاوند کی عدم موجودگی میں ایوب خان کو چیلنج کرنے کی جرأت کا مظاہرہ کیا۔

انہوں نے لیڈر کے بغیر عوام کی قیادت کرنے کا بیڑا اٹھا کر اپنی زندگی کے شاید تلخ ترین وقت کو دعوت دیدی جبکہ ان کے شوہر جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھے۔ یہ بیگم صاحبہ ہی تھیں جنہوں نے ایسے وقتوں میں پی پی پی کو زندہ اور پارٹی اور تبدیلی کی حرکیات کو قائم رکھا جس کا حاصل عوامی پذیرائی تھا۔

واقعہ یہ ہے، ہماری قومی تاریخ میں چند ہی ایسی خواتین ہیں جنہوں نے زمانے کی پیشانی پر انمٹ نقوش چھوڑے ہوں۔ تقسیم کے بعد کی تاریخ میں وہ ان سب سے نمایاں بہادر اور جرأت مند خاتون کے طور پر سامنے آئیں جنہوں نے فوجی آمروں کے جبر و ظلم کا سامنا کیا، سو کہا جا سکتا ہے، کہا جانا چاہیے اور تسلیم کرنا چاہیے، بیگم صاحبہ کے پائے کی شخصیات روز روز پیدا نہیں ہوتیں!

بھٹو شہید اپنی رفیقہ حیات کی فولادی صلاحیتوں سے پوری طرح آگاہ تھے چنانچہ یہی وجہ ہے انہوں نے ایوب دور کے اپنے ایام اسیری کے دورانئے میں بیگم صاحبہ کو پاکستان پیپلز پارٹی کے قائمقام چیئرمین کی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے منتخب کیا۔ بھٹو صاحب کو پورا شعور تھا، بیگم نصرت بھٹو ایک ایسی پرعزم خاتون ہیں جو تمام مشکل چیلنجوں کا سینہ تان کر سامنا کر سکتی تھیں اور بیگم صاحبہ توقعات سے کہیں بڑھ کر بھٹو صاحب کے معیار پر پورا اتریں، پاکستان پیپلز پارٹی کا علم بلند رکھنے کے مشن پر وہ ایک چٹان کے مانند کھڑی رہیں، پس پردہ جمہوریت دشمن قوتوں کے باوجود، وہ اپنی قیادت کے پرچم تلے پی پی پی کو متحد رکھنے کی سعی و جہد کرتی رہیں۔

بیگم صاحبہ کے لیے اپنی سیاسی جدوجہد کے دوران میں جنرل ضیاء کی حکمرانی کے

آتش بار دور کی نفی کرنا مشکل ترین چیلنج تھا۔ جنرل ضیاء جو پاکستان کی تاریخ میں سب سے بدترین اور ظالم ترین فوجی آمر تھا۔ضیاء نے پاکستانی عوام کا جمہوری حق غصب کرنے کے لیے پورے ملک میں خوف و دہشت کا سماں باندھ دیا۔بیگم نصرت بھٹو کی تاریخی سعی و جہد سے عوام نے جمہوریت کو اپنی زندگیوں کے ذاتی نصب العین کا درجہ دیدیا، انہوں نے بے رحم قومی آمر کی گولیوں کے سامنے اپنے سینے کھول دیئے۔ چہروں پر مسکراہٹیں، دلوں میں بے خوفی کی شمعیں جلائے ''بھٹو ہمارا قائد ہے، ہم ضیاء کے مقابلے میں ہتھیار ڈالنے کے بجائے موت کو ترجیح دیں گے'' کے فلک شگاف نعرے لگاتے۔

ہزاروں لوگوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا، انہیں سرعام ٹکٹکیاں لگا کر کوڑے مارے گئے، قید کے طویل عرصے میں وہ ایک نہ ختم ہونے والے تشدد کا عذاب سہتے رہے۔

وہ آزمائش کے زمانے تھے، انتہائی مشکلات اور آزمائشوں کے شب و روز۔ پارٹی کے رہنما جو کمزور تھے یا جن میں جرأت کی کمی تھی انہوں نے لاتعلق ہو جانے میں عافیت کا راستہ اختیار کرلیا۔بعض نے خفیہ قوتوں کے ساتھ ہاتھ ملا لیے، اپنے گھربار اور اپنی کھالیں بچانے کے لیے ''حفاظتی نظر بندی'' کے نام پر انہوں نے ڈکٹیٹر کے سائے میں اپنے گھربار اور اپنی زندگیوں کے لیے پناہ تلاش کرلی۔

امتحانی و ابتلا کے اس ناقابل فراموش عہد میں بھی عوام نے بیگم صاحبہ کی جدوجہد کے نتیجے میں دنیا کے سامنے ایک سچائی ثابت کردی، یہ کہ وہ اپنے قائد اور جمہوریت کی خاطر اپنی زندگیوں کی قربانی دینے سے گریز نہیں کریں گے۔

بیگم صاحبہ نے اس عہد میں قربانی کی تاریخ کا ایک یادگار باب لکھا، بے یار و مددگار عوام کے ہاتھوں ایک ذہنی مریض آمر کے خلاف ڈٹ جانے کی عوامی شرکت، شجاعت اور مزاحمت کی تاریخ رقم کروادی۔

عوامی احتجاج کے انہی دنوں میں ایک بدقسمت موقع پر قذافی سٹیڈیم میں غضب ناک

پولیس کی جانب سے، جو انہیں قتل کرنے پر مامور کی گئی تھی، بیگم صاحبہ پر شدید لاٹھی چارج کیا گیا جس سے ان کا سر پھٹ گیا، خون کی ندی رواں ہوگئی، سفاک ڈکٹیٹر نے ان کا مناسب علاج معالجہ کروانے کی اجازت ہی نہ دی۔ کئی روز تک وہ کسی بھی قسم کی بھی نگہداشت کے بغیر رہیں، سر سے اُسی طرح خون بہتا رہا۔ سر کی چوٹ ایسا گہرا گھاؤ ہوتا ہے جس کا بروقت مداوا نہ ہونے کی صورت اس کے زخم رستے رہتے اور جسم کے اس حصے پر غیر فعالیت کے اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں اور بیگم صاحبہ کے ساتھ عملاً یہ المیہ بیت گیا۔

مطلوبہ طبی علاج معالجہ تک رسائی کی اجازت نہ ملنے کے باعث ان کی صحت رفتہ رفتہ گرتی رہی، کئی سال بعد اس صورت حال کے آثار نمودار ہوئے، سر پر براہ راست پڑنے والی پولیس ضربوں کے بعد وہ ان تمام طویل برسوں کے دوران میں شدید سر درد اور خود فراموشی کے جھٹکوں سے دوچار ہوتی رہیں۔

یہ ان کی صاحبزادی بی بی شہید کے دوسرے دور حکومت 1993ء،1996ء کے دورانئے کا واقعہ ہے جب بیگم صاحبہ کی یادداشت پر خود فراموشی کے یہ دورے تشویشناک حد تک سامنے آنے لگے۔ متعدد نوعیتوں کے میڈیکل ٹیسٹ کروانے پر شدید سر درد اور خود فراموشی کے اسباب کا پورے طور پر پتہ چل گیا لیکن اس وقت تک مناسب وقت پر مطلوبہ علاج معالجے تک رسائی نہ دینے کی سفاکانہ آمریت کے نتیجے میں ان پر دماغی بیماری الزائمر (Alzheimer`s) کا حملہ ہوگیا تھا۔

وہ اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں گفتگو کرنے سے قاصر ہوگئی تھیں۔ ان کی زندگی کا عظیم المیہ لہو اترتے، آبشار کی مانند تھا، گو وہ بظاہر تنومند اور اپنی گلابی رنگت کی حسین وضع قطع ہی کا نمونہ دکھائی دیتی تھیں، مگر ان کے سانسوں سے جڑے رشتوں پر کون سی قیامتیں بیت گئی تھیں، بولنے سے عاجز و درماندہ ہستی، عظیم المیے کی اس اشک آلود جہت سے بے خبر ساعتوں میں اپنی گھڑیاں بتا رہی تھی۔ انہیں اپنے رفیق زندگی ذوالفقار علی بھٹو اور اپنی بیٹی بے نظیر بھٹو پر گزر جانے

والی ہولناک تباہیوں کا کوئی علم نہ تھا۔

بیگم صاحب سے میری آخری ملاقات دسمبر 2006ء میں دبئی میں ہوئی۔ وہ اتنی ہی جاذب نظر اور پرکشش دکھائی دیں جیسے ہمیشہ سے تھیں لیکن وہ آسمان کی بلندیوں کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھا کئے جبکہ میں بالکل ان کے قریب کھڑا تھا۔

دکھی، خالی الذھن، چہرے پہ وہی شریفانہ وقار و دبدبہ!

چہرے کے خطوط میں نا قابل فراموش واقعات اور دکھ سے بھری کہانیوں کی ہر لکیر دیکھی جا سکتی بلکہ ان لکیروں میں اس قوم کی داستان بھی پوشیدہ تھی جو اول روز سے ہی قیامت خیز دھاروں میں مبتلا رہی۔ مجھے انہیں اس حالت میں دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا تاہم میں جانتا تھا، بخوبی آگاہ تھا، بیگم نصرت بھٹو کی زندگی اپنی جاں سے عزیز رشتوں کے مصائب و آلام کی تصویر کشی، غیر جمہوری حکمرانوں کے جرائم اور خباثتوں کا مجموعہ تھی، ان غیر جمہوری حکمرانوں کے وہ جرائم اور خباثتیں جنہوں نے پاکستان کا چہرہ مسخ کر کے رکھ دیا۔

ایوب خان کے خلاف ان کی سیاسی جدوجہد تن تنہا کارنامہ تھا جس میں پاکستانی عوام نے جی جان سے ان کے قیادت کے شانہ بشانہ تن، من، دھن سے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔

ایوب خاں کے خلاف اس سیاسی جنگ کے میدان سے بیگم نصر بھٹو ذات پات، مذہب، رنگ اور نسل سے بالا عوامی حقوق اور جمہوریت کے ایک بے مثال جنگجو کی حیثیت سے ابھریں۔

ایوب خان کے بعد بیگم نصرت بھٹو کی دوسری آزمائش پہلے سے بھی بدتر تھی، زندگی کی ہر شے سے بھی زیادہ گھمبیر، انہیں نہ صرف اپنے خاوند کی زندگی بچانے کی لڑائی لڑنا تھی بلکہ ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کو بھی قائم رکھنا تھا۔ دونوں کی زندگیاں تاریخ انسانی کے شقی القلب ترین ڈکٹیٹر کے ہاتھوں ہلاکت کے کنارے پر تھیں۔

یہ دراصل نصرت بھٹو کے استقلال کردار، نظریاتی آدرشوں پر یقین کا امتحان تھا۔ وہ

نظریاتی مقاصد اور آدرش جو ان کے شوہر ذوالفقار علی بھٹو کو اپنی رگ جاں سے بھی عزیز تھے! جمہوری اجتماعیت، عوام کی طاقت، وفاق، آئین، اور پارلیمنٹ کی بالادستی اور قومی ترقی کے لیے مساوات کے ایک ایسے نظام کا قیام جو ہر پاکستانی کو یکساں مواقع فراہم کرنے کا علمبردار ہو، ایسا سماجی اور اقتصادی نظام جس کی بنیاد اسلام نے رکھی ہے۔

جنرل ضیاء الحق کا شب خون اور 5 جولائی 1977 کی صبح مارشل لاء کے نفاذ، منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو، ان کی پوری کابینہ، پی پی اور پی این اے کے دیگر رہنماؤں کی گرفتاریاں، ان سب حضرات کو ایک ہی جگہ نظر بند کر دیا گیا، سوائے ذوالفقار علی بھٹو کے جنہیں حفاظتی نظر بندی کی ایک نئی مصیبت کے جال میں مری لے جایا گیا۔۔۔ایک مشکوک منصوبہ۔

جنرل ضیاء نے 90 دن کے اندر صاف شفاف اور غیر جانبدار انتخابات کے انعقاد کا وعدہ کیا لیکن اس وعدے کے بعد اس نے اقتدار سے چمٹے رہنے کے لیے ہر احمقانہ، مجرمانہ اور غیر آئینی حرکت کی تا آنکہ 17 اگست 1988ء کو اسے ایک قدرتی ناگہانی نے حکمرانی کی کرسی اور وردی سے نجات دلا دی یا کرسی اور وردی کو اس سے نجات دلوا دی!

بیگم نصرت بھٹو کو اس وقت گھبراہٹ یا حواس باختگی کا شکار ہو جانا چاہیے تھا جب اس جنرل ضیاء کے احکامات پر جسے بھٹو صاحب نے آؤٹ آف ٹرن ترقی دے کر آرمی چیف کے عہدے پر فائز کیا تھا، فوجیوں نے گرفتار کر لیا۔ لیکن نصرت بھٹو کا ضمیر اسی بھربھری مٹی سے نہیں گندھا گیا تھا۔ وہ صلاح الدین ایوبی کی نسلی وراثت کی امین تھیں، عظیم کرد مدبر حکمران اور جنگجو! انہوں نے اپنے حواس مکمل طور پر مجتمع رکھے، بچوں پر آغوش مادر کا محفوظ سائبان تان دیا، اس سمے 18 برس کی بی بی شہید نے، جو تمام بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں، حالات کے ان بے پناہ تاریک ترین لمحوں کے ساتھ نازل ہوئی آفت اور انجانے مستقبل پر چھائی غیر یقینی گھٹاؤں میں اپنی والدہ کے دوش بدوش مزاحمت کا علم اٹھا لیا۔

کسی بھی قسم کی سیاسی سرگرمیوں کی اجازت نہ تھی اور بقول جنرل ضیاء کے ''نظر بند

رہنماؤں کو ذہنی سکون کے لیے حفاظتی نظر بندی میں رکھا گیا ہے تا کہ سیاسی تصادم کے باعث ملک میں خانہ جنگی کی طرف بتدریج بڑھتے ہوئے خدشے پر قابو پایا جا سکے اور پھر ضیاء کی مری میں، جہاں بھٹو صاحب کو نظر بند رکھا گیا تھا، ملاقات ہوئی، اس نے بھٹو صاحب سے 90 دن کے اندر غیر جانبدارانہ اور شفاف انتخابات کے انعقاد کا وعدہ کیا، وعدہ جو ضیاء نے اپنے آخری سانس تک پورا نہ کیا۔

وہ کیسے انتخابات منعقد کرا سکتا تھا؟ اسے بخوبی علم تھا، وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا، سو فیصد حد تک یقیناً نہیں، وہ جانتا تھا ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی ہمیشہ سے کہیں زیادہ اکثریت سے انتخاب جیت جائیں گے، اسے آئین سے غداری کے جرم میں پھانسی کے رسّے پہ جھولنا پڑے گا۔ اور ذوالفقار علی بھٹو نے آئین کے آرٹیکل 6 کے تحت اسے اس انجام کی یاددہانی بھی کرا دی تھی۔

ضیاء اور منتخب حکومت کے خلاف اس آئینی غداری کے جرم میں اس کے ساتھ شریک جرنیل نوے دنوں میں انتخابات کرانے کے معاملے میں عوام کے ساتھ فریب کاری کے مختلف امکانات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ''بھٹو کے معاملے میں کیا کیا جائے'' کی الجھن میں تھے جس کا وجود ان کے لیے کہیں زیادہ مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ کھلے عام تو بھٹو کے بارے میں اپنی سکیموں میں سے کوئی سکیم سامنے نہیں لا سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی جگہ فرض کر لیا کہ بھٹو کی کردار کشی اور پی این اے کی جانب سے ان پر کیچڑ اچھالنے کی مہموں سے وہ بھٹو کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتے تھے۔

جرنیلوں کو ابھی ماحول پوری طرح کھنگالنا تھا۔ بھٹو اور پی این اے کے دوسرے رہنماؤں کو 30 دن کی حفاظتی نظر بندی کے بعد رہا کر دیا گیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی طرح پی این اے کے بعض لیڈرز بھی ضیاء کے ساتھ گٹھ جوڑ کر چکے تھے۔ رہائی کے بعد انہیں نوے دن میں الیکشن کے مسئلے پر ایسے حالات پیدا کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی جو نوے دن کا انتخابی وعدہ ملتوی

کرانے کا جواز فراہم کر سکیں۔

رہائی کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے ریل کے ذریعہ راولپنڈی سے کراچی جانے کا فیصلہ کیا۔

وہ ان عوام میں اپنے مقام کا اندازہ لگانا چاہتے تھے جن کے لیے انہوں نے اپنا دن رات ایک کر دیا تھا۔ جہاں اور جس سٹیشن پر بھی یہ ٹرین رکی ہزاروں لوگ پاکستان پیپلز پارٹی کے جھنڈے اور بھٹو کی تصاویر کے پلے کارڈز اٹھائے اپنے محبوب رہنما کی ایک جھلک دیکھنے کو اس سٹیشن پر ایک سیلابی ریلے کی طرح امڈ آئے۔

ضیاء کو انٹیلی جنس ایجنسیوں نے اپنی رپورٹوں میں عوامی ہجوموں کی تعداد کم کر کے بتائی۔ اسے کہا گیا، ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی مقبولیت کی سچائی کا حقیقی راز کراچی پہنچنے پر کھلے گا۔ پاکستان کا سب سے بڑا تجارتی اور اقتصادی حب، جہاں پر بھٹو کے مخالف بلکہ جانی دشمن تاجروں کا قبضہ تھا اور جو مارشل لاء کی ''بی'' ٹیم کے طور پر ''بدنام زمانہ'' جماعت اسلامی کا سیاسی گڑھ تھا۔

کراچی کینٹ سٹیشن پر عوام کے بینظیر اور عظیم الشان ہجوم نے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ مات کر دیئے کہ یہ کراچی وہی تھا جسے بھٹو سے نفرت کی علامت بنا کر پیش کیا جا رہا تھا۔ واقعہ یہ ہے، یہ آسمان سے نازل تقدیر کا تیر تھا جس نے ضیاء اور اس کے ٹولے پر پیشاب خطا ہونے کی حد تک کپکپی طاری کر دی۔ قریب قریب 5 لاکھ لوگوں کا جذبات سے بھرپور سمندری جم غفیر آسمانوں کی پہنائیوں تک نعرہ زن تھا ''بھٹو، ہم تمہارے ساتھ ہیں'' عوامی مقبولیت کا ناقابل یقین سیلاب نام نہاد جنگ آزمودہ جرنیلوں کے اس ٹولے کی پتلونیں گیلی کر گیا۔

جرنیلوں کے ٹولے نے ملک کا قومی اور سیاسی ماحول پوری طرح کھنگال لیا تھا، ماحول کا یہ پانی ضیاء اور جرنیل جنتا کے لیے زہریلا تھا، اب ذوالفقار علی بھٹو کو بذریعہ ٹرین کسی سفر کی اجازت نہیں دی جائے گی، انہیں دوسری دفعہ جس شدید دھچکے سے دوچار ہونا پڑا، وہ پہلی بار سے

بھی کہیں بدترین تھا۔ جب بھٹو صاحب اپنی رہائی کے بعد لاہور ایئر پورٹ پر اترے، سارا شہر اپنے غیر متنازعہ قومی قائد کے لیے چشم براہ، اپنی قبولیت کے سدا بہار پھولوں سمیت وہاں موجود تھا، ایئر پورٹ کے درودیوار ''جیئے بھٹو'' کے فلک شگاف نعروں سے کانپ گئے، جب اس حوالے سے میڈیا نے سوال اٹھائے ضیاء کے چمچوں سے کوئی جواب نہ بن پڑا، آئی ایس آئی کے جنرل جیلانی نے بتایا، عوامی مجمع عمومی اندازے کے مطابق کم ازکم 8 اور 10 لاکھ کے مابین تھا۔ جبکہ آزاد ذرائع کے مطابق عوام کی تعداد کسی صورت بھی 15 یا 20 لاکھ سے کم نہ تھی۔ متوقع انتخابی نتائج نے ضیاء کی راتوں کی نیند حرام کردی، ان نتائج کا تصور ضیاء کے لیے خوف و دہشت کے آسیبی فنامنے میں ڈھل گیا۔ ضیاء اور اس کے ٹولے کا تصور دن کی روشنی میں بھی ان کے بُرے انجام کی خبر دے رہا تھا۔

آگے کیا ہوگا؟ ضیاء اور جنتا کے ساتھی جرنیل قوم پر مسلط شدہ اپنی سیاہ بختی چھوڑنے پر قطعاً آمادہ نہیں تھے۔ چنانچہ بھٹو سے نجات کے لیے ان پر سیاسی مخالف کے قتل کا جھوٹا مقدمہ تراشا گیا، انہیں ان کے آبائی گاؤں نوڈیرو سے لاہور لایا گیا جہاں اس مقدمے کی ایف آئی آر کا اندراج ہوا تھا۔ لاہور ہائی کورٹ میں ان دنوں ایک سچے اور کھرے جج جسٹس محمد صمدانی موجود تھے، انہوں نے قتل کے سلسلے میں عائد کردہ الزامات میں کسی بھی نوعیت اور سطح کا رتی بھر وزن بھی نہ دیکھتے ہوئے بھٹو صاحب کو ضمانت پر رہا کردیا۔

ضیاء بھٹو صاحب کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے رکھنے کے مسئلہ پر مایوسی کا شکار ہوگیا، بھٹو صاحب کو دوبارہ گرفتار کرلیا گیا لیکن اس دفعہ بھٹو صاحب سے نفرت کے تیز دھار کردار جسٹس مولوی مشتاق کا انتخاب کیا گیا جسے جسٹس انوارالحق کے سپریم کورٹ جانے کے بعد بھٹو صاحب نے قائمقام چیف جسٹس مقرر کیا تھا۔ مولوی مشتاق نے اپنے انتقامی جذبے کا آغاز اس سے کہیں زیادہ بے باک اور قابل احترام جج کی جانب سے لی گئی بھٹو کی ضمانت منسوخ کرنے سے

کیا، بعدازاں اس مولوی مشتاق اوراس بنچ میں شامل دوسرے ججوں نے بھٹو کو سزائے موت کا فیصلہ سنایا، یہ فیصلہ ضیاء اس کے ٹولے اور فوج کی ''جیگ برانچ'' میں ڈرافٹ کیا گیا تھا۔اس دوران میں سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دگی گئی، ایک بار پھر جرنیل ٹولے کو سخت مایوسی سے پالا پڑا، جہاں کہیں پاکستان پیپلز پارٹی کے زیراہتمام جلسہ منعقد ہوتا عوام بے مثال جوش وخروش اورشرکت سے بیگم صاحبہ کا استقبال کرتے،عوام کی یہ بھرپور شمولیت اور تائید سرکاری ایجنسیوں اورخود پارٹی کے لیے باعث حیرت تھی، لاکھوں لوگوں کی پی پی پی کے جلسوں میں سیلابی آمد اور تعداد جو اپنے اسیر قائد کے حوالے سے بیگم صاحبہ کو سننا چاہتے تھے، اس واقعہ نے جنرل ضیاء اور اس کے ٹولے کی نیندیں حرام کردیں۔

پھراب کیا کیا جائے؟ بالآخر انہوں نے سوسروں والے سانپ جیسا متبادل منصوبہ پٹاری سے نکالا۔اولاً انہوں نے پی پی کو تقسیم یا توڑنے کے لیے پی پی کے اندر اپنے ایجنٹ داخل کردیئے، جن کا مشن بیگم نصرت بھٹو کی بطور قائمقام چیئر پرسن پاکستان پیپلز پارٹی نامزدگی کو چیلنج کرکے پی پی میں انارکی پیدا کرنا تھا۔ ثانیاً جماعت اسلامی اور چند دوسری جماعتوں کو انتخاب سے پہلے احتساب کا نعرہ دیا گیا، اس سب کا مقصد اس وعدہ سے انحراف یا عہد سے پھر جانے کا راستہ ڈھونڈھنا تھا جس کا اعلان جنرل ضیاء نے خانہ کعبہ کے مقدس مقام پر کیا تھا۔

ثالثاً جنرل ضیاء کے ٹولے نے دائیں بازو کے رجعت پسند عناصر اور جماعتوں پر مشتمل ایک سول سیٹ اپ کے قیام کا منصوبہ تیار کیا جس کا مقصد عوام اور حکومت کے درمیان پل کے طور پر کام کرنا تھا تا کہ جب بھی الیکشن منعقد ہوں، یہ سیٹ اپ اپنا کردار ادا کر سکے۔

فوجی حکمرانی کے چہرے پر سولین حکومت کے اس مصنوعی غازے سے لدی پھندی سیاسی مسخروں کی بینڈ ویگن میں صرف چندایک جماعتوں نے ہی سواری کی جبکہ دوسری طرف بیگم نصرت بھٹو اور بےنظیر بھٹو کو بھٹو صاحب کی جان بچانے کے لیے ان کی جانب سے سپریم کورٹ

میں دائر کردہ اپیل کی قانونی جنگ میں الجھا دیا گیا، یہ اپیل جسٹس انوار الحق کی سربراہی میں قائم کردہ بنچ سن رہا تھا جنہیں چیف جسٹس محمد یعقوب علی کو فارغ کرنے کے بعد سپریم کورٹ کا چیف جسٹس لگایا جا چکا تھا، جسٹس محمد یعقوب علی نے نصرت بھٹو بنام حکومت پاکستان کے مشہور زمانہ کیس جس میں بیگم صاحبہ نے مارشل لاء کے نفاذ اور اس کے دائرہ کار کو چیلنج کیا تھا، بیگم نصرت بھٹو کے حق میں ایسا فیصلہ دیا جو بیگم صاحبہ کے موقف کے حق میں جاتا تھا۔ جسٹس انوار الحق جنرل ضیاء کے سامنے مکمل طور پر مغلوب ہو گئے۔ جن کے نزدیک قبر ایک اور افراد دو تھے، بھٹو یا وہ! ظاہر ہے اس نے آئین خود کو پھانسی پر جھولنے کے لیے نہیں روندا تھا، چنانچہ اس کے سامنے بھٹو کو قتل کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ باقی بچا ہی نہیں تھا۔

بیگم نصرت بھٹو
خاندانی پس منظر

اس بات کی گواہی اس خطے کی تاریخ بھی دے گی کہ اگر یہ کہا جائے کہ 23 مارچ 1929ء نہ فقط پاکستان کی تاریخ کا ایک انقلابی موڑ ثابت ہوا بلکہ دو پڑوسی اسلامی ملکوں پاکستان اور ایران کی سیاست اور تاریخ کا سنگم بھی ہے' تو اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ 23 مارچ 1929ء وہ دن ہے جب ایران کے مشہور اصفہانی خاندان کی نصرت خانم کے نام سے ایک بیٹی کا تحفہ پاکستان کو ملا' یہی بچی نصرت خانم بعد میں بیگم نصرت بھٹو کے طور پر اس خطے کی تاریخ کا انمٹ حصہ بنیں اور پھر اس عظیم خاتون کو مسلم دنیا مگر تیسری دنیا کے عظیم عوامی قائد ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی بیوی ہونے کا اعزاز حاصل ہوا' پہلے مرحلے میں انہیں اپنے شوہر ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے معاون کے طور پر اس ملک کے عوام کی خدمت کرنی تھی مگر آمریت کے ہاتھوں ان کے شوہر اور پاکستان کے پہلے منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی حکومت جنرلوں کے ہاتھوں الٹے جانے اور ان کو پھانسی دینے کے بعد پاکستان میں جمہوریت کی بحالی اور آمریت کو شکست دینے کے لئے ایک عظیم الشان عوامی تحریک کی قیادت بھی کرنا تھی۔

نصرت اصفہانی نے ایران کے شہر اصفہان کے ایک امیر اصفہانی خاندان میں آنکھیں کھولیں' ان کے والد مرزا محمد نجف ایک امیر بیوپاری تھے' وہ پاکستان اور ہندوستان کی آزادی

سے پہلے ہندوستان کے شہر ممبئی میں بیوپار کی خاطر رہائش پذیر ہوئے' بعد میں ان کا خاندان آزادی کے بعد پاکستان ہجرت کر کے کراچی میں آباد ہوا' نصرت خانم نے تعلیم اپنے آبائی ملک ایران کی ''یونیورسٹی آف اصفہان'' میں حاصل کی جہاں انہوں نے 1950ء میں بیچلر آف آرٹس (بی اے) کی ڈگری حاصل کی' اسی دوران نصرت خانم اپنے والد سے ملنے ممبئی بھی آتی جاتی رہتی تھیں' ممبئی میں نصرت خانم کی سب سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو کی بہن منور الاسلام سے ملاقات ہوئی اس وقت ذوالفقار علی بھٹو کے والد سر شاہنواز بھٹو بھی ممبئی میں رہائش پذیر تھے' بعد میں نصرت خانم اپنے والد اور خاندان کے ساتھ پاکستان کے شہر کراچی منتقل ہو گئیں' ان کی رہائش کلفٹن میں اس وقت وہاں قائم فارن آفس کی عمارت اور مشہور ماہوٹا پیلس کے قریب تھی' قدرت نے نصرت خانم (بیگم نصرت بھٹو) کو پیدائش سے ہی کئی خصوصیتوں سے نوازا تھا' وہ شروع سے بہادر' پرعزم' پکے ارادے والی اور مضبوط کردار کی مالک خاتون تھیں' شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بیگم نصرت بھٹو نسلی طور پر کرد تھیں جو اسلامی دنیا اور خاص طور پر عرب دنیا میں مارشل ریس (جنگجو نسل) کے طور پر مشہور تھے' بیگم نصرت بھٹو کے خاندان کا کرد نسل سے تعلق رکھنے والے اسلامی دنیا کے مشہور بہادر جرنیل صلاح الدین ایوبی سے تعلق تھا' اسلامی دنیا کا کون سا فرد ہوگا جو صلاح الدین ایوبی کی بہادری اور فتوحات سے بے خبر ہوگا۔ صلاح الدین ایوبی پہلے مسلمان جنرل تھے جنہوں نے بحیرہ روم کے یورپی جنگجوؤں کا مقابلہ کیا جب صلاح الدین ایوبی کی طاقت عروج پر تھی تو اس وقت اس کی سلطنت میں مصر' شام' میسوپوٹیما' حجاز' یمن اور شمالی امریکہ کے دیگر حصے شامل تھے۔ صلاح الدین ایوبی کے دور کا ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ ایوبی فوج نے صلاح الدین کی ذاتی قیادت میں 1187ء میں ہاتن کی فیصلہ کن جنگ میں یورپی جنگجوؤں کو شکست فاش دی اور اس طرح مسلمانوں کی طرف سے یورپی جنگجوؤں سے فلسطین واپس لے لیا جس پر انہوں نے 88 سال قبل قبضہ کیا تھا' ان فتوحات کی وجہ سے صلاح الدین ایوبی مسلم' عرب' ترک اور کردش ثقافت میں ایک انتہائی ممتاز حیثیت اختیار کر گئے' صلاح الدین ایوبی 1193ء میں دمشق میں انتقال کر گئے

اور وہ اُمیّوں کی مسجد کے پاس مقبرے میں دفن ہیں۔

یہ شاید اسلام کے غیر معمولی ہیرو، مدبر اور عظیم سپاہی صلاح الدین ایوبی کی نسل ہی کی دین تھی کہ بیگم نصرت بھٹو بچپن سے بے پناہ ترس کھانے والی، حوصلے مند، نڈر، پرعزم اور باہمت خاتون ثابت ہوئیں، اس کی ایک مثال ان کا وہ کردار ہے جو پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے آنے والے لٹے پٹے مہاجروں کی دن رات خدمت کے دوران نمودار ہوا، انسانی ذات کے لئے ان کا پیار ایک ایسی نوجوان خاتون میں منتقل کر دیا جس نے ایک ایسے وقت میں جب ہر طرف چیلنج تھے وہ نہ گھبرائیں اور نہ ہی تھکن کا شکار ہوئیں، جیسے ہی ہندوستان سے لٹے مہاجروں سے بھری ٹرینیں کراچی پہنچتیں تو نصرت اصفہانی ان کی خدمت کے لئے سب سے آگے ہوتی تھیں، اس وقت محترمہ فاطمہ جناح نے وومن نیشنل گارڈز بنائی، نصرت اصفہانی نیشنل گارڈز کے پلیٹ فارم سے دن رات ان مہاجرین کی خدمت میں کوشاں رہیں، نصرت اصفہانی وومن نیشنل گارڈز کی ایک بے غرض اور مخلص کارکن کی حیثیت میں ہندوستان سے لٹ کر آنے والے لاکھوں مہاجرین کے لئے شروع کی گئی امدادی کارروائیوں میں تن من دھن سے حصہ لیتی رہیں۔ ان امدادی کارروائیوں کے ذریعے ان مہاجرین کو کھانا فراہم کرنا، ان کو جائے پناہ فراہم کرنا اور ان کی ایسے مدد کرنے کا فرض بجا لایا جا رہا تھا جب نہ فقط کراچی مگر سارے پاکستان میں نہ مطلوبہ وسائل تھے نہ کسی نظام کا کوئی بنیادی ڈھانچہ تھا، نہ مناسب انتظامی سیٹ اپ تھا، نہ ٹھہرانے کے لئے گھر تھے، نہ ہزاروں بیمار لوگوں کے علاج کا بندوبست تھا، سوائے اس کے کہ نصرت خانم کی طرح بے لوث عوامی خدمت کار دن رات ان پریشان حال لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے متحرک تھے، اس بحرانی دور میں نصرت اصفہانی ایک قدآور شخصیت کی حیثیت میں ان لوگوں کی خدمت کے لئے ہر وقت موجود تھیں، انہوں نے قیادت اور بے لوث خدمت کی غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا، اس حقیقت کو بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی بہن محترمہ فاطمہ جناح اور پاکستان کے پہلے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کی بیگم رعنا لیاقت علی خان نے بھی

تسلیم کیا اور اس جذبے کی تعریف کی، ساتھ ہی قائداعظم محمد علی جناح کو بھی ان بہادرانہ خدمات پر فخر تھا جو نصرت خانم اور ایسی دوسری خواتین نے سرانجام دیں، ان عظیم الشان خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے قائداعظم نے کہا کہ چاہے کیسی بھی مشکلات ہوں کیسے بھی چیلنج ہوں، وہ ایسی قوم کو شکست نہیں دے سکتے جس میں نصرت خانم جیسی نوجوان خواتین موجود ہوں۔

بیگم نصرت بھٹو کی ولادت مالی اور ثقافتی طور پر ایک امیر ایرانی بیوپاری کے گھر میں ہوئی جس کے آباؤ اجداد کراچی میں آباد ہو گئے تھے اور ان کے پھلتے پھولتے بیوپار کی شاخیں سارے برصغیر میں پھیلی ہوئی تھیں، بہرحال یہ بات غور طلب ضرور ہے کہ حالانکہ بیگم نصرت بھٹو کا تعلق ایرانی نسل سے تھا اس کے باوجود انہیں حال ہی میں آزاد ہونے والے ملک پاکستان سے اتنا لگاؤ کیوں تھا اور ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان اور اس کے ایک بڑے شہر کراچی آنے والے پریشان حال مہاجرین کی خدمت اس غیر معمولی جذبے سے کیوں کی خود قائداعظم محمد علی جناح کو اس بات کا احساس تھا اسی لئے نصرت خانم کا نام لیکر ان کی اور ایسی دوسری خواتین کی قائداعظم نے تعریف کی، اس کے لئے ایران اور پاکستان کی تاریخ اور خود نصرت اصفہانی کے آباؤ اجداد اور ان کے پڑ دادا صلاح الدین ایوبی کی اسلام کے لئے کی گئی جدوجہد کو مدنظر رکھنا پڑے گا، اس میں تو کوئی شک نہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا اور برصغیر ہندوستان کے مسلمانوں کے ایک الگ وطن کے حصول کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا لہٰذا دنیا بھر کے مسلمانوں کو پاکستان سے جذباتی لگاؤ تو تھا، مگر اس سے ہٹ کر بھی ایران اور پاکستان کے مسلمانوں کے درمیان کئی تاریخی عوامل تھے، خود ایران میں جس طرح اسلام کو قبول کیا گیا وہ ایک الگ تاریخ ہے، اسلام کے آنے سے پہلے ایران کے لوگوں کا مذہب آتش پرست تھا، مگر ایران کے آتش پرستوں نے جس طرح اسلام کو قبول کیا اس کی مثال ملنا بھی مشکل ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایران کے آتش پرستوں نے اسلام کو بہتر اور برتر سمجھ کر دل سے قبول کیا، ویسے بھی ایران اور برصغیر کے مسلمانوں کے درمیان تجارتی رابطے صدیوں سے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا میں واحد سپر

پاور مسلمان تھے' یاد رہے کہ ایک ہی دور میں مسلمانوں کی تین وسیع سلطنتیں تھیں مثال کے طور پر بغداد میں صفوی اسلامی سلطنت تھی' ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت تھی اور ترکی میں سلطنت عثمانیہ تھی' اس طرح یورپ سے انڈونیشیاء تک مسلمانوں کی سلطنتیں تھیں' ہندوستان کے شہنشاہ جہانگیر کی رانی نور جہاں بھی ایرانی نسل کی تھیں' مغلوں کے دور میں ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی تھی' جب سندھ میں تالپوروں کی حکومت تھی تو اس وقت سندھ کی سرکاری زبان بھی فارسی تھی' یہ سارے عنصر تھے جن کی وجہ سے ایران اور پاکستان یا ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیان نہ فقط مذہبی' تجارتی مگر گہرے ثقافتی تعلقات تھے' ایران کے جو بیوپاری خاندان ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ بیوپار کرتے تھے ان میں اصفہانی خاندان پیش پیش تھا جس کی ایک فرد نصرت اصفہانی تھیں' یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان بنا اور ہندوستان سے پریشان حال مہاجرین کے جتھوں پر جتھے آئے تو کراچی میں ان کی خدمت میں جو لوگ آگے آگے تھے ان میں خاص طور پر نصرت اصفہانی بھی تھیں' لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب پاکستان بنا تو پاکستان اور اسلام سے محبت نوجوان نصرت خانم کے خمیر کا حصہ بن چکی تھی۔

بھٹو خاندان کی مختصر تاریخ

بھٹو خاندان کب اور کہاں سے منتقل ہو کر سندھ کے علاقے لاڑکانہ میں آ کر آباد ہوا؟ اس سلسلے میں حاصل کی گئی تفصیلات کے مطابق نسلی طور پر بھٹو خاندان اصل میں راجپوت تھے۔ تفصیلات کے مطابق حصار کے راجپوت مسلمانوں کی ایک شاخ جب آج سے تقریباً تین سو سال قبل ایک مذہبی خاندان کی محبت وعقیدت سے مغلوب ہو کر سندھ میں آ کر آباد ہوئی تو گویا ایک نئے مزاج کی بنیاد رکھ دی گئی' ایسا مزاج جس کے عناصر میں ایک طرف راجپوتوں کی روایتی جرات' بے باکی اور دلیری شامل تھی تو دوسری طرف اسلامی مزاج کی حق پرستی' جہاں بینی ودانائی موجود تھی' نسل در نسل یہ عناصر ایک دوسرے میں بہتر سے بہتر انداز میں تحلیل ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ میران تالپور کے عہد میں اس خاندان میں ایک اور عنصر کا اضافہ ہوا' اس خاندان سے ربط وضبط اور قربت کے باعث بھٹو خاندان میں آداب حکمرانی بھی آ گئے' یہ اور بات ہے کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کے والد گرامی سر شاہنواز جب عملی زندگی میں داخل ہوئے تو انداز حکمرانی بدل چکے تھے' اس وقت برصغیر میں حالات ایک عظیم تاریخی کروٹ بدلنے سے پہلے اپنے مضمحل قوا کو خوابیدگی سے آزاد کرانے کے لئے جھٹکے دے رہے تھے۔

سر شاہنواز 1920ء میں لاڑکانہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے صدر منتخب ہوئے' مجموعی حالات پر نظر ڈال لی جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھٹو خاندان دنیا کے ان چند

www.bhutto.org

خاندانوں میں شمار ہوتا ہے جن کی مثال ملنا مشکل ہے' یہ بات کتنی عجیب ہے کہ جس طرح ذوالفقار علی بھٹو اوران کے خاندان کے باقی افراد بشمول بیگم نصرت بھٹو اوران کی اولاد نے آخری دم تک عوام کے حقوق کے لئے جدوجہد کی' اسی طرح ان کے بڑوں کا بھی وقت کی طاقتور قوتوں سے ٹکراؤ ہوا اور انہوں نے بھی اصولوں پر مفاہمت نہیں کی' شاید بہت کم لوگوں کو پتہ ہو کہ میر مرتضٰی بھٹو شہید کے دادا کا نام بھی میر مرتضٰی بھٹو تھا' شہید میر مرتضٰی بھٹو کی جنگ اپنے باپ' والدہ اور بہن کی قیادت میں جنرل ضیاء الحق کی آمریت سے رہی' اسی طرح ان کے دادا میر مرتضٰی بھٹو کی جنگ بھی اس دور کے سامراج اور انگریز حکمرانوں کے اعلیٰ حکام سے ہوئی۔ اس جنگ کے دران دادا میر مرتضٰی بھٹو کو سندھ اور پنجاب سے افغانستان ہجرت کرنا پڑی' اس دور میں اس علاقے سے تعلق رکھنے والے واحد شخص میر مرتضٰی بھٹو تھے جنہوں نے انگریز سامراج کے مظالم سے تنگ آ کر ہجرت کر کے افغانستان میں پناہ لی جب افغانستان کے اس وقت کے بادشاہ کو پتہ چلا کہ سندھ کے نواب خاندان کے ایک فرد نے برصغیر پر حکومت کرنے والے برطانوی سامراج کے مظالم سے تنگ آ کر ان کے ملک میں پناہ لی ہے تو ان کی بادشاہ سے ملاقات کرائی گئی جنہوں نے میر مرتضٰی بھٹو کو ایک شاہی خاندان کے فرد جیسا پروٹوکول دیا اور انہیں کابل میں رہنے کے لئے محل نما مکان دیا گیا جہاں وہ کئی سال رہے۔

جناب مرتضٰی بھٹو نے کیوں ملک بدری قبول کی' پہلے کافی عرصے تک سندھ اور بعد میں پنجاب میں روپوش ہو کر مشکلات کی زندگی گزاری' آخر کار انگریز سامراج کے کارندوں نے انہیں سندھ اور پنجاب میں بھی برداشت نہیں کیا لہٰذا مجبور ہو کر انہیں ہجرت کرنی پڑی اور افغانستان میں پناہ لی' غلام مرتضٰی خان بھٹو کو یہ سب صعوبتیں کیوں برداشت کرنی پڑی؟ یہ بھی واضح رہے کہ اس دوران سندھ میں میر غلام مرتضٰی خان بھٹو کی ساری جائیداد انگریزوں نے ضبط کر لی' اس سلسلے میں نسل در نسل جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس کے مطابق علاقے کا کلکٹر ایلفرڈ مے فیو تھا جو برطانوی سامراج کی حکمرانی کے ابتدائی دنوں کے افسران کی طرح انتہائی سخت

مزاج اور ظالم افسر تھا' شروع میں غلام مرتضٰی خان بھٹو کے اس انگریز افسر سے بہت ہی قریبی تعلقات تھے' یہاں تک کہ غلام مرتضٰی بھٹو کا انگریز کلکٹر کے یہاں آزادانہ آنا جانا تھا' غلام مرتضٰی خان بھٹو اور اس انگریز افسر کے درمیان تعلقات کیوں خراب ہوئے' اس کے مختلف اسباب بتائے جاتے ہیں' اس سلسلے میں ایک سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ کچھ دیگر حاسد جاگیرداروں نے غلام مرتضٰی بھٹو کے خلاف انگریز کلکٹر کے کان بھرے جبکہ دیگر حلقوں کی طرف سے یہ بات سامنے آئی کہ انگریز کلکٹر کو شک ہو گیا کہ اس کی بیوی کے غلام مرتضٰی بھٹو سے تعلقات ہو گئے ہیں' بہرحال مختلف اسباب کی بنا پر غلام مرتضٰی خان بھٹو اور انگریز کلکٹر کے درمیان تعلقات خراب ہوتے گئے' یہاں تک کہ انگریز کلکٹر نے غلام مرتضٰی بھٹو کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے' بات یہاں تک ختم نہیں ہوئی، انگریز کلکٹر نے علاقے کے وکیلوں کو وارننگ دی کہ کوئی بھی غلام مرتضٰی بھٹو کی وکالت کرنے کی کوشش نہ کرے۔

جناب غلام مرتضٰی خان نے انگریز حاکم کے اس چیلنج کو قبول کیا اور اپنے ایک دوست کے ذریعے لاہور ہائی کورٹ کے سینئر بیرسٹر سر ولیم ہنری رٹیکن کو ایک ہزار روپیہ یومیہ پر اپنا وکیل مقرر کیا' یہ فیس بعد میں بارہ سو روپے روز ہو گئی' اس زمانے میں یہ کسی بھی وکیل کے لئے سب سے زیادہ فیس تھی' اس فیس کی گرانقدری کا اندازہ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ اس دور کا ایک سو روپیہ آج کے دس ہزار روپے کے برابر قدر و قیمت رکھتا تھا' سر ولیم نے شکارپور آ کر جناب غلام مرتضٰی خان بھٹو کے مقدمے کی پیروی کی' یہ مقدمہ سیشن کورٹ میں بیس روز تک جاری رہا چونکہ یہ مقدمہ محض ایک سازش کے تحت قائم کیا گیا تھا لہٰذا الزام ثابت نہ کیا جا سکا اور غلام مرتضٰی خان بھٹو باعزت بری کر دیئے گئے' اس کے علاوہ ان پر ایک مقدمہ ایک سرکاری افسر کے فرائض کی بجا آوری میں مداخلت کے جرم میں بھی قائم کیا گیا لیکن جناب بھٹو اس میں بھی باعزت بری ہو گئے لیکن مقدمات کا یہ سلسلہ تو ہندوؤں اور انگریز حاکموں کی سازش کی وجہ سے شروع ہوا تھا لہٰذا ان میں کسی ثبوت یا شہادت کی کیا ضرورت تھی' ظاہر ہے کہ کرنل ایلفرڈ اور اس کے سازشی ساتھی

جناب غلام مرتضٰی خان کی اس باعزت بریت پر خوش نہ تھے‘ ان کی تو کوشش یہ تھی کہ اس باوقار مسلمان شخصیت کو بے آبرو کیا جائے۔ لہٰذا کرنل ایلفر ڈ نے بغیر کسی بنیاد کے دفعہ ایک سو دس کے تحت ان کے تازہ وارنٹ جاری کر دیئے‘ جناب غلام مرتضٰی خان بھی ایک افسر کے ہاتھوں بے عزت ہونے یا شکست تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے‘ انہوں نے جب دیکھا کہ کلکٹر تمام قانونی واخلاقی آداب کو پس پشت ڈال کر انہیں بے عزت کرنے پر تلا ہوا ہے تو انہوں نے بھی گرفتار نہ ہونے کا عہد کیا اور روپوش ہو گئے۔ کرنل ایلفر ڈ بھی موقع کی تاک میں تھا‘ اس نے روپوشی کا فائدہ اٹھا کر بھٹو خاندان کی تمام املاک کو بحق سرکار ضبط کر لیا۔ جناب غلام مرتضٰی خاں بھٹو نے اپنے دونوں لڑکوں شاہنواز بھٹو اور علی گوہر بھٹو کو اپنے ایک قریبی دوست وکیل غلام محمد کے حوالے کیا اور خود پنجاب چلے آئے اور دل میں عہد کر لیا کہ خواہ کچھ ہو جائے وہ اس انگریز کلکٹر کے سامنے سر نہیں جھکائیں گے‘ وہ اپنے اس عہد پر پورے اترے اور جب تک وہ انگریز ریٹائر ہو کر واپس برطانیہ نہیں چلا گیا وہ اس کے ہاتھ نہیں لگے‘ اس دوران انہوں نے بے پناہ تکالیف سے روپوشی کی زندگی گزاری چونکہ ایلفر ڈ بھی ہر قیمت پر انہیں نشانہ انتقام بنا کر اپنی انا کو تسکین دینا چاہتا تھا‘ اس لئے اس کے جاسوس پورے ہندوستان میں جناب غلام مرتضٰی بھٹو کی تلاش میں پھیل گئے‘ ان جاسوسوں سے بچنے کے لئے جناب غلام مرتضٰی خان بھٹو نے ایسا بھیس بدلا کہ وہ سارے وسائل کے باوجود ان کا سراغ نہ لگا سکے۔

جب ایلفر ڈ واپس چلا گیا تو جناب غلام مرتضٰی خان بھٹو نے فیصلہ کیا کہ اب کراچی جا کر قانونی ذرائع سے ان جھوٹے مقدمات کا مقابلہ کریں گے کیونکہ اب کرنل ایلفر ڈ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے دھاندلی کے امکانات ختم ہو گئے تھے لیکن اس کے چلے جانے کے باوجود اس کے جاری کردہ وارنٹ علاقہ پولیس کے پاس موجود تھے اور ان کے دشمن اب بھی یہ کوشش کر رہے تھے کہ انہیں ان وارنٹوں کی بنیاد پر گرفتار کرا کے ان کی توہین کی جائے لیکن جناب غلام مرتضٰی خان بھٹو مخالفین کو یہاں بھی شکست دینا چاہتے تھے‘ چنانچہ انہوں نے بھیس بدل کر کراچی کا سفر

اختیار کیا' ادھر پولیس نے ان کے گاؤں اور کراچی کو جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی اور بڑی احتیاط کے ساتھ تمام مسافروں کی چیکنگ کی جاتی تھی' غلام مرتضیٰ خان کو بھی اس کارروائی کا علم تھا چنانچہ انہوں نے دریائے سندھ سے پہلے ہی اتر کر پیدل کنارے کنارے سفر کیا اور کافی دور سے جہاں پولیس کا خیال تک نہ تھا کشتی کے ذریعے دریا پار کر لیا' اسی دوران انہوں نے سیہون شریف سے اپنے دوست وکیل غلام محمد کو ساتھ لیا اور ان دونوں نے کراچی کی ٹرین پکڑ لی لیکن دریا پار کر کے بھی ان کی مشکلات ختم نہ ہوئیں' ان دنوں سندھ کے اندرونی علاقوں میں پلیگ کا مرض پھیلا ہوا تھا اور کراچی میں داخل ہونے والی تمام ٹرینوں کے مسافروں کو ملیر پر روک کر کیمپوں میں رکھا جاتا اور ان کا معائنہ کر کے قرنطینہ میں ڈال دیا جاتا' چنانچہ انہیں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ ملیر کے عارضی کیمپ میں روک لیا گیا' جناب غلام مرتضیٰ خان کو اس پر تو کوئی گھبراہٹ نہ تھی لیکن خدشہ یہ تھا کہ کہیں علاقہ پولیس کو ان کی خبر نہ ہو جائے' ہر چند وہ ''دیال سنگھ'' کے بھیس میں تھے لیکن ان کا راجپوت مسلمانوں والا جاہ وجلال اور شخصیت کا بارعب انداز' پگڑی' کنگھا' کچھ' کڑا اور کرپان کے ہوتے ہوئے بھی نہیں چھپ رہا تھا' چنانچہ انہوں نے کیمپ سے جلد نکلنے کا ایک منصوبہ بنایا اور کراچی پہنچ گئے۔

اس خاندان کو ابتداء ہی سے سازشوں کا شکار ہو کر مصائب وتکالیف کا مقابلہ کرنا پڑا' ظاہر ہے سر شاہنواز بھٹو بھی جو اس سازش کی وجہ سے خاندان پر پڑنے والی مصیبتوں کا براہ راست بچپن ہی میں نشانہ بن گئے تھے اس کے اثرات لئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے اور اس خاندانی تجربے کے اثرات جناب ذوالفقار علی بھٹو کی ذات سے بھی الگ نہیں کیے جا سکتے یہی صورتحال محترمہ بے نظیر بھٹو' میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو کو بھی بھگتنی پڑی۔ 1931ء کی گول میز کانفرنس میں سندھ کے مسلمانوں کا جو چار رکنی وفد منتخب کیا گیا' سر شاہنواز بھٹو اس کے قائد تھے' ہر چند ان کا مرکزی مشن یہی تھا کہ وہ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کا مطالبہ دلائل و براہین کی روشنی میں پوری شدت کے ساتھ اٹھائیں لیکن ان کی خدمات کے پیش نظر گول میز کانفرنس میں پیش ہونے والے

اہم مسائل پر سوچ بچار کرنے والی چار کمیٹیوں میں انہیں مسلمانان ہند کے نمائندہ کے طور پر شریک کیا گیا۔ سر شاہنواز بھٹو کو اپنے اس مطالبے میں مسلمانان ہند کی تائید تو 1929ء ہی میں حاصل ہو چکی تھی، لندن میں قائداعظم کے ساتھ متعدد ملاقاتوں کے بعد ان کے عزائم مزید بلند ہو گئے، جب کانفرنس کے دوران سندھ کے مسئلے کو ٹالنے کی کوشش کی گئی تو سر شاہنواز نے لنچ کے دوران وزیراعظم میکڈانلڈ کا ہاتھ اپنی گرفت میں لیکر تمام حاضرین اور مندوبین کی موجودگی میں سندھ کے مسئلے کو نظر انداز کرنے پر احتجاج کیا اور وزیراعظم برطانیہ کو وعدہ کرنا پڑا کہ شام کے اجلاس میں وہ اس مسئلے پر اظہار خیال کر سکیں گے، شام کے اجلاس میں سر شاہنواز بھٹو نے پورے جذبے اور دلائل کے ساتھ سندھ کے مسلمانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے علیحدہ صوبہ بنانے کے حق میں بھرپور دلائل دیئے اور مندوبین کو اپنے نقطہ نظر کا قائل کر لیا اور کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ سندھ کی علیحدگی کا جائزہ لینے کے لئے ایک سب کمیٹی تشکیل دی جائے جس کے سربراہ لارڈ رسل ہوں۔

سر شاہنواز بھٹو تمام مخالفتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آخر کار 24 دسمبر 1932ء کو یہ اعلان کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ آئندہ جو بھی وفاق تجویز ہوگا اس میں سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ کی حیثیت دے دی جائے گی مگر وہ اس پر مطمئن نہ ہوئے اور برطانوی حکومت پر دباؤ جاری رکھا۔ 1936ء کی گول میز کانفرنس میں انگریز نے سندھ کو عملی طور پر علیحدہ صوبہ بنانے کا مسئلہ باقاعدہ ایجنڈے میں شامل کر لیا اور کانفرنس کے اختتام پر سر شاہنواز بھٹو ایک فاتح کی حیثیت میں وطن واپس آئے، سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تجویز عملاً تسلیم کر لی گئی تھی۔

''ذوالفقار علی بھٹو اور نصرت بھٹو کی شادی''

نصرت اصفہانی ابھی 11 سال کی تھیں جب وہ اپنے والد کے پاس ممبئی آئی ہوئی تھیں، وہاں ان کی پہلی ملاقات بھٹو خاندان کے افراد سے ممبئی کے نزدیک ایک سیاحتی مرکز کھنڈالہ میں ہوئی، اس ملاقات کے بعد ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی بہن منور الاسلام سے نصرت اصفہانی کی دوستی ہوگئی اور دونوں مسلسل ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں، اسی دوران ان کا خاندان کراچی منتقل ہوگیا جہاں نصرت اصفہانی نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے سینٹ جوزف کالج میں داخلہ لے لیا جہاں وہ اپنی بہن بہجت اور فرح ناز اصفہانی کی والدہ سیدہ اختر زہرہ اصفہانی کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے لگیں، نصرت اصفہانی کی ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے ساتھ دوسری ملاقات بھٹو کی بہن منور الاسلام کی شادی کی تقریب میں 1949ء میں ہوئی، اس وقت نصرت اصفہانی وومن نیشنل گارڈ میں کیپٹن تھیں، وہاں نصرت اصفہانی کو فوجی یونیفارم میں دیکھ کر ان سے بہت متاثر ہوئے، ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے نصرت اصفہانی سے شادی کی خواہش 1951ء میں ظاہر کی جب وہ ابھی انگلینڈ کی آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کررہے تھے مگر نصرت اصفہانی اس مرحلے پر ذوالفقار علی بھٹو صاحب سے شادی کرنے کے لئے راضی نہیں ہوئیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو صاحب پہلے ہی شادی شدہ تھے مگر ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے نصرت اصفہانی کو شادی کے لئے راضی کرنے کے لئے کوشش ترک نہیں کی، ایک دن انہوں نے نصرت خانم کے والد مرزا محمد نجف سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی اور وضاحت کی کہ ان کی شادی ان

کے خاندان میں اس وقت کی گئی جب ابھی ان کی عمر 14 سال تھی' انہوں نے بتایا کہ ان کی پہلی بیگم سے کوئی اولاد نہیں' ان ملاقاتوں کے دوران ذوالفقار علی بھٹو جنہیں پیار سے ذلفی کہا جاتا تھا نے مرزا صاحب کو یقین دلایا کہ وہ نصرت کو ساری زندگی خوش رکھیں گے' اس وضاحت کے بعد مرزا محمد نجف مطمئن ہو گئے اور انہوں نے اپنی بیٹی کو قائل کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو سے شادی کرنے میں کوئی خرابی نہیں ہے' ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے اپنی پہلی بیوی امیر بیگم کو بتایا کہ وہ دوسری شادی کرنے جا رہے ہیں' جب 1951ء میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب اور نصرت اصفہانی کی شادی ہوگئی تو امیر بیگم کے والد نے دونوں میاں اور بیوی کو رات کے کھانے پر مدعو کیا' اس طرح یہ ان کی زندگی کی بہترین ابتداء تھی' باقی زندگی کے دوران بیگم نصرت بھٹو اور ان کی اولاد کو کبھی بھی امیر بیگم کی طرف سے شکایت کا موقع نہیں ملا بلکہ ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی شہادت اور بے نظیر بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو کے درمیان اختلافات پیدا ہو جانے کے بعد بے نظیر بھٹو نوڈیرو میں امیر بیگم کے بنگلے میں ہی رہائش اختیار کرتی تھیں اور جب بے نظیر بھٹو ملک کی وزیراعظم تھیں تو لاڑکانہ کے المرتضیٰ کی بجائے نوڈیرو کے اس بنگلے کو پرائم منسٹر ہاؤس قرار دیا گیا تھا۔

بہرحال شاید یہ بات کم لوگوں کو پتہ ہو کہ ذوالفقار علی بھٹو صاحب اور بیگم نصرت بھٹو کی شادی کرانے میں قومی اسمبلی کے سابق اسپیکر اور کٹر مسلم لیگی الٰہی بخش سومرو کا بڑا اہم کردار تھا۔ اس سلسلے میں جب الٰہی بخش سومرو سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ذوالفقار علی بھٹو صاحب سے ان کی دوستی اس وقت سے تھی جب ان دونوں کی عمریں تقریباً دس سال کی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے خاندان اور ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے خاندان کے بہت گہرے رشتے تھے' اس حد تک کہ بقول الٰہی بخش سومرو ان کے چچا شہید اللہ بخش سومرو جو انگریز دور میں سندھ صوبے کے پہلے وزیراعظم بنے اور ان کے والد مولا بخش سومرو جو قومی اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں' ذوالفقار علی بھٹو کے والد سر شاہنواز بھٹو سے جھک کر ملتے تھے کیونکہ دونوں سومرو صاحبان کے والد سر شاہنواز بھٹو کے دوست تھے۔ مولا بخش سومرو جو الٰہی بخش سومرو کے والد تھے' ذوالفقار علی بھٹو کے بڑے بھائی امداد بھٹو کے گہرے دوست تھے' 1937ء میں ہونے والے انتخابات میں سر شاہنواز بھٹو لاڑکانہ سے انتخابات ہار گئے' اس کے بعد سر شاہنواز بھٹو سیاست سے اتنے دلبرداشتہ ہوئے کہ

لاڑکانہ چھوڑ کر انہوں نے ممبئی میں سکونت اختیار کر لی' وہ سال میں ایک بار لاڑکانہ آتے تھے تاکہ زمین کا حساب کتاب کر سکیں' یہ بات بھی ریکارڈ کی ہے کہ بھٹو خاندان کے ایک اہم فرد دودو بھٹو نے انگریزوں پر ایک بہت بڑا احسان کیا تھا جس کی وجہ سے انگریز حکام سر شاہنواز بھٹو کی بہت عزت کرتے تھے' اس زمانے میں انگریز سونا گدھوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے تھے' ایک بار سونے سے بھرا ہوا ایک گدھا گم ہو گیا جسے دودو بھٹو کے لوگ تلاش کر کے لائے اور سونے سے بھرا ہوا یہ گدھا انگریز حکام کے حوالے کر دیا' اسی دوران الٰہی بخش سومرو کے چچا شہید اللہ بخش سومرو انگریز حکام کی مخالفت کے باوجود سندھ کے پہلے منتخب وزیر اعظم بن گئے' اس حیثیت میں شہید اللہ بخش سومرو نے ممبئی کے گورنر کو لکھا کہ سر شاہنواز بھٹو ان کے سینئر ہیں لہٰذا انہیں کوئی اہم عہدہ دیا جائے لہٰذا سر شاہنواز بھٹو کو پبلک سروس کمیشن فار ممبئی اینڈ سندھ کا ممبر بنایا گیا۔

واضح رہے کہ اس وقت سندھ کو ممبئی پریزیڈنسی کے ماتحت کیا ہوا تھا' بہرحال بعد میں سر شاہنواز بھٹو نے ممبئی پریزیڈنسی سے سندھ کی ماتحتی ختم کر کے اس کی صوبائی حیثیت بحال کرنے کے لئے سندھ میں شروع کی گئی تحریک کی قیادت کی اور تحریک کامیاب ہونے کے بعد سندھ کی ایک الگ صوبے کی حیثیت بنی' بعد میں سر شاہنواز بھٹو کی خدمات جونا گڑھ ریاست کے راجہ نے حاصل کیں اور جب پاکستان آزاد ہوا تو اس وقت وہ جونا گڑھ کے چیف ناظم تھے' اس دوران جب بھی سر شاہنواز بھٹو لاڑکانہ آتے تو اپنی بیوی کو ساتھ لاتے مگر اپنے بیٹے ذلفی کو ساتھ نہ لاتے' الٰہی بخش سومرو نے بتایا کہ ان کی ذوالفقار علی بھٹو سے دوسری ملاقات 14-15 سال کے بعد امریکا میں ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ ذوالفقار علی بھٹو کیلی فورنیا یونیورسٹی میں اور وہ خود کولمبیا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ دونوں کے دوستوں کے بتانے کے بعد ہماری آپس میں ملاقات ہوئی' بعد میں ذوالفقار علی بھٹو برکلے یونیورسٹی میں منتقل ہو گئے' وہ مجھ سے نیویارک یونیورسٹی میں ملنے آئے تھے' وہاں میں انٹرنیشنل ہاسٹل میں تھا' اس وقت ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو سندھی نہیں آتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ بھٹو نے برکلے یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد لندن برطانیہ میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ الٰہی بخش سومرو کا کہنا تھا کہ وہ

پاکستان میرے بعد لوٹے اور مجھ سے یہاں بھی ملتے تھے' اس وقت ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی کراچی میں کوئی کمپنی نہیں تھی اور کہتے تھے کہ کس کے ساتھ شام گزاری جائے۔ الٰہی بخش سومرو نے بتایا کہ اس وقت کراچی میں واحد پیلس ہوٹل تھا جہاں کراچی کی اپر کلاس کی فیملیز شام گزارنے آتی تھیں' لہٰذا انہوں نے کہا کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے ساتھ پیلس ہوٹل لے جانے لگے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت نصرت بھٹو کا خاندان کراچی کے ممتاز بیوپاری خاندانوں میں شامل ہوتا تھا' لہٰذا ان کا خاندان بھی اکثر شامیں پیلس ہوٹل میں گزارتا تھا جن میں بیگم نصرت بھٹو بھی شامل ہوتی تھیں۔

الٰہی بخش سومرو نے کہا کہ نصرت بھٹو نہ فقط قد آور مگر انتہائی پروقار شخصیت کی مالک تھیں' ان پر خاص طور پر ساڑھی بہت جچتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ان کی نصرت بھٹو کے خاندان سے پہلے ہی سے میل ملاقات تھی لہٰذا جب ذوالفقار علی بھٹو ساتھ ہوتے تھے تو بشمول نصرت بھٹو ان کے خاندان کے دیگر افراد سے بھی پیلس ہوٹل میں دعا سلام ہوتی تھی' نصرت بھٹو کو دیکھنے کے بعد بھٹو ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے اور ان میں دلچسپی لینے لگے اور آخر کار خواہش ظاہر کی کہ وہ ان سے شادی کرنا چاہتے ہیں' اس دوران ان کی نصرت بھٹو کے خاندان سے بھی ملاقاتیں ہوئیں' ایک دن ذوالفقار علی بھٹو میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ نصرت بھٹو اچھی خاتون ہیں' وہ مجھ سے شادی کر رہی ہیں' چلو اور ان سے میرا نکاح کراؤ' نکاح کے لئے دو گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ الٰہی بخش سومرو بتاتے ہیں کہ میں تو ایک گواہ تھا لہٰذا میں نے ایک اور دوست خیر محمد جونیجو کو دوسرے گواہ کے طور پر ساتھ لیا اور کلفٹن میں ذوالفقار علی بھٹو کے گھر گئے' وہاں کہا گیا کہ کسی مولوی کو ساتھ لے جائیں لہٰذا میں نے سندھ کلب کی مسجد کے مولوی کو ساتھ لیا اور نصرت خانم کے والد کے گھر پہنچ گیا وہاں ان کے والد سے ملاقات ہوئی' وہ نہ فقط عمر رسیدہ تھے بلکہ ان کی نظر بھی کمزور تھی' ان کے علاوہ گھر میں باقی سب خواتین تھیں' جب ہم نے بتایا کہ ہم نکاح کے لئے مولوی لے آئے ہیں تو انہوں نے اعتراض کیا کہ یہ مولوی اہلسنت سے تعلق رکھتا ہے جبکہ نصرت کا نکاح فقط کسی شیعہ مولوی سے پڑھایا جائے گا' اس کے بعد الٰہی بخش سومرو نے کہا کہ وہ بولٹن مارکیٹ گئے جہاں ان کی ملاقات ایک دوسرے دوست مظفر وفائی سے ہوئی جس

سے انہوں نے پوچھا کہ امام بارگاہ کہاں ہے۔ انہوں نے کہا کہ شیعہ مولوی اتنی آسانی سے آپ کے ساتھ نکاح پڑھانے نہیں جائیں گے۔

انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ سندھ مدرسہ جائیں وہاں سنیوں کی مسجد بھی ہے تو شیعوں کا امام بارگاہ بھی ہے' وہاں امام بارگاہ سے مولوی کو نکاح کے لئے لے جائیں' اس کے بعد الٰہی بخش سومرو سندھ مدرسہ کے امام بارگاہ پہنچے وہاں مغرب کی نماز ہونے کے بعد وہ امام بارگاہ کے مولوی سے ملے اور ان سے مقصد بیان کیا' اسے 25 ہزار روپے بھی دیئے' اس کے بعد وہ مولوی صاحب الٰہی بخش سومرو کے ساتھ بیگم نصرت بھٹو کے والدین کی رہائش گاہ پر آئے اور نصرت بھٹو اور ذوالفقار علی بھٹو کا نکاح پڑھایا' نکاح نامے پر الٰہی بخش سومرو اور خیر محمد جونیجو نے گواہان کے طور پر دستخط کیے' نکاح کے بعد بقول الٰہی بخش سومرو کے وہ اور خیر محمد جونیجو باہر آئے تو پیچھے دولہا اور دلہن بھی تھے' ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ نکاح تو پڑھوالیا اب کہیں لے چلو' اس کے بعد الٰہی بخش سومرو دولہا اور دلہن کو پیلس ہوٹل لے آئے' پیلس ہوٹل میں ان کے چچازاد بھائی رحیم بخش سومرو کا مستقل طور پر ایک کمرہ ہوتا تھا' الٰہی بخش سومرو نے بتایا کہ وہ پیلس ہوٹل کے منیجر کے پاس گئے اور ان سے رحیم بخش سومرو کے کمرے کی چابی لی جو انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے حوالے کی اور کہا کہ اب آپ جتنے دن چاہیں اس کمرے میں رہیں۔ شادی کے بعد یہ نوجوان جوڑا ہنی مون منانے کے لئے پہلے پیرس اور بعد میں روم روانہ ہوا اور بعد میں آکسفورڈ آ گیا جہاں ذوالفقار علی بھٹو ہاسٹل میں رہنے لگے جبکہ بیگم نصرت بھٹو ہوٹل میں رہنے لگیں' اس وقت ذلفی نصرت بھٹو کو ''نصرتم'' کہہ کر مخاطب ہوتا تھا۔ ''نصرتم'' کے معنی ''میری نصرت'' تھا۔ دونوں کی پہلی اولاد 1953ء میں ہوئی' بیٹی کا نام بے نظیر بھٹو رکھا گیا' پہلی بیٹی کی پیدائش پر دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے۔

بھٹو خاندان کی جدوجہد

یہ اعلان کہ ''بھٹو خاندان یہ جنگ نسل در نسل لڑیگا'' پاکستان کی اس وقت کی سب سے بڑی سیاسی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر مین بیگم نصرت بھٹو نے اس وقت کیا جب ان کے شوہر اور پاکستان کے پہلے منتخب عوامی وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو جنرل ضیاء الحق کی مارشل لاء حکومت میں پھانسی دیدی گئی تھی اور بعد میں اسلام کے اصولوں کے تحت عدت کی مدت پوری کرنے کے بعد کراچی میں اپنی خاندانی رہائش گاہ 71 کلفٹن میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر کے صحافیوں کے سوالات کے جوابات دیئے۔ اس موقع پر ایک صحافی نے ان سے سوال کیا کہ کیا آپ کو امید کی کوئی کرن نظر آ رہی ہے؟ جواب میں بیگم نصرت بھٹو نے اس صحافی کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ پوچھ رہے ہیں کہ مجھے امید کی کوئی کرن نظر آ رہی ہے...... مگر بھٹو صاحب تو نہیں رہے۔'' اتنا کہنے کے بعد وہ چند سیکنڈ تک پریس کانفرنس میں بیٹھے ان صحافیوں کو گھور کر دیکھتی رہیں، اس مرحلے پر بیگم نصرت بھٹو کی آنکھوں میں اس چمک کی جھلک نظر آئی جو کبھی کبھار کسی جلسے میں تقریر کے دوران یا کسی پریس کانفرنس میں خطاب کے دوران کسی خاص نکتے کی وضاحت کرتے وقت ذوالفقار علی بھٹو کی آنکھوں میں آتی تھی۔ بیگم نصرت بھٹو اچانک انتہائی سنجیدہ ہو گئیں اور انتہائی پر عزم اور پر اعتماد لہجے میں کہا کہ ''جی ہاں بھٹو صاحب نہیں رہے مگر یہ جنگ جاری رہے گی'' اور اب اس جنگ میں عوامی قوتوں کی سپہ سالار میں ہوں، اگر میں اس جنگ کا نشانہ بنی تو عوام کی قیادت بے نظیر بھٹو کریں گی، اگر اسے بھی نشانہ بنایا گیا تو میر

(میر مرتضیٰ بھٹو) آگے آئیں گے' اگر میر بھی نشانہ بنے تو شاہنواز اس جنگ کی قیادت کریں۔ اتنا کہنے کے بعد بیگم نصرت بھٹو کچھ سیکنڈوں کے لئے رکیں اور پھر گرجدار آواز میں کہا کہ ''جنٹلمین! سنیں! میں کم سے کم یہ یقین دلاتی ہوں کہ بھٹو خاندان یہ جنگ نسل در نسل لڑیگا۔'' اس کے بعد بیگم نصرت بھٹو 70 کلفٹن میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ پریس کانفرنس میں موجود صحافی حیران ہوگئے کہ یہ کیسی ماں تھی جس نے اعلان کیا کہ عوام کے حقوق اور جمہوریت کی بحالی کے لئے لڑی جانے والی اس جنگ میں وہ خود تو کیا اس کے بچے بھی وطن پر قربان ہونے کے لئے تیار ہیں اور پھر بہرحال یہ بھی اپنی جگہ تاریخی حقیقت ہے کہ یہ کیسے بچے تھے جنہوں نے اپنی ماں کے اس وعدے کا کیا پاس رکھا کہ ایک ایک کر کے شہید ہوگئے اور آج بیگم نصرت بھٹو کی اس پرامید پیشگوئی کے عین مطابق بھٹو خاندان کی دو نسلیں اس جنگ میں قربانی دیکر لاڑکانہ کے ایک قصبے گڑھی خدا بخش کے قبرستان میں سوئی ہوئی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ دور میں بھی دنیا کے مختلف ملکوں میں ایسے بہادر سیاسی خاندانوں نے جنم لیا جو اپنے اپنے ملکوں کی اصل حکمران قوتوں کے ریاستی جبر یا جمہوریت دشمن اور عوام دشمن قوتوں کی طرف سے شروع کیے گئے سیاسی جبر کا نشانہ بنے جبکہ کچھ ملکوں کے سیاسی خاندان تو اپنے ملکوں کی جمہوریت دشمن حکمران قوتوں اور عالمی سامراج کے مشترکہ جبر کا نشانہ بنے' ان خاندانوں کے ایک یا دو سے بھی زیادہ افراد اس جبر کے نتیجے میں اپنی جان یا جانیں کھو بیٹھے مگر سچی بات یہ ہے کہ جب ایسے سیاسی خاندانوں کی قربانیوں اور جرأت کا موزانہ کیا جائے گا تو اس میں بھٹو خاندان کا نام سرفہرست ہوگا' ہوسکتا ہے کہ اس حوالے سے کوئی مورخ عالمی تاریخ مرتب کرے تو وہ بھٹو خاندان کو عالمی جبر کا مقابلہ کرنے والے سب سے زیادہ بہادر اور قربانیاں دینے والے خاندان کی صف اول میں جگہ دے۔

اگر گذشتہ سو سال کی عالمی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ہمارے سامنے ایسے خاندانوں میں امریکا کا کینیڈی خاندان' ہندوستان کا نہرو خاندان' سری لنکا کا سریما بندرانائیکے خاندان' بنگلا دیش کے شیخ مجیب الرحمان اور پھر پاکستان کا بھٹو خاندان نظر آتے ہیں۔

امریکا کے 35 ویں صدر جان ایف کینیڈی کو 22 نومبر 1963ء کو کسی نامعلوم شخص نے

گولی مار کر قتل کر دیا جب وہ اپنی بیگم' ٹیکساس کے گورنر جان کونالی اور اس کی بیگم کے ساتھ ٹیکساس کے شہر ڈیلاس کے علاقے ڈیلی پلازہ کے پاس سے گزر رہے تھے' بعد میں جان ایف کینیڈی کو قتل کرنے والے شخص اوسوالڈ کو کسی اور فرد جیک روبی نے پراسرار طور پر قتل کر ڈالا۔ جان ایف کینیڈی کے قتل کی تحقیقات کے لئے وارن کمیشن بنایا گیا جس کی تحقیقات کے نتیجے میں یہ انکشاف کیا گیا کہ اسے ایک فرد اوسوالڈ نے قتل کیا حالانکہ ابتدائی طور پر امریکہ کے عوام کی اکثریت نے اس کمیشن کی رپورٹ کو تسلیم نہیں کیا' 1966ء اور 2003ء کے درمیان عوام کی رائے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ امریکہ کے 80 فیصد عوام کی رائے ہے کہ جان ایف کینیڈی کو ایک سازش کے تحت قتل کیا گیا۔ عالمی طور پر اکثر مبصر یہ رائے رکھتے ہیں کہ کینیڈی کی پالیسیوں سے امریکہ کی اصل اسٹیبلشمنٹ خوش نہیں تھی لہٰذا انہیں سیاسی منظر سے ہٹانے کے لئے ان کی جان لینے کا فیصلہ کیا گیا' بعد میں جو واقعات ہوئے اس سے اندازہ ہوا کہ امریکہ کی اصل طاقتور قوتیں نہ صرف جان ایف کینیڈی بلکہ پورے کینیڈی خاندان سے ناخوش تھیں اور نہیں چاہتے تھے کہ ان کے خاندان کا کوئی فرد امریکہ کا صدر بنے' اس کی ایک واضح مثال جان ایف کینیڈی کے چھوٹے بھائی رابرٹ کینیڈی کا لبرل سیاسی کردار اور صدارتی الیکشن کے دوران ان کا بھی مارا جانا ہے' وہ امریکا کی ڈیموکریٹک پارٹی کے ممبر تھے اور ملک بھر میں امریکی لبرل ازم کی علامت کے طور پر مشہور تھے' 1968ء کے صدارتی انتخابات میں وہ ڈیموکریٹک پارٹی کے صدارتی امیدوار تھے وہ خاص طور پر سیاہ فام' ہسپانوی اور کیتھولک ووٹروں کے ووٹ حاصل کرنے کی مہم پر تھے' الیکشن کے دوران رابرٹ کینیڈی نے کیلی فورنیا میں اپنے مقابل امیدوار سینیٹر یوجین میکارتھی کو شکست تو دی مگر تھوڑے ہی عرصے میں انہیں قتل کر دیا گیا' اس کے بعد کینیڈی خاندان کا کوئی فرد صدارتی امیدوار بننے کی ہمت نہ کر سکا' حالانکہ جان ایف کینیڈی کے تیسرے چھوٹے بھائی ٹیڈ کینیڈی ایک طویل عرصے تک امریکا کے سینیٹر رہے۔ اس طرح پے در پے اپنے خاندان کے دو افراد کی قربانی دینے کے بعد کینیڈی خاندان نے شاید امریکہ کی صدارت سے خود کو دور رکھنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔

ہمارے سامنے ہندوستان کے نہرو خاندان کی مثال بھی ہے' ہندوستان کے پہلے وزیر

اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو تو قدرتی موت مرے' مگر ان کی بیٹی مسز اندرا گاندھی جو ہندوستان کی طاقتور وزیراعظم تھیں انہیں قتل کردیا گیا' اس کے بعد ان کے بڑے بیٹے راجیو گاندھی بھی ہندوستان کے وزیراعظم بنے مگر انہیں بھی قتل کردیا گیا جبکہ مسز اندرا گاندھی کے چھوٹے بیٹے سنجے گاندھی پہلے ہی ایک ہوائی حادثے میں انتقال کر گئے تھے' اس کے بعد نہرو خاندان میں سے راجیو گاندھی کی بہو سونیا گاندھی میدان میں تھیں مگر انہوں نے ہندوستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے میں جلدی نہیں کی' ان کے بجائے ہندوستان کے وزیراعظم من موہن سنگھ بنے' البتہ کچھ عرصے کے بعد سونیا گاندھی کانگریس کی صدر بنیں' مگر ان کی طرف سے یا ان کے بیٹے یا بیٹی نے ابھی تک سامنے آ کر ہندوستان کی سیاست میں کلیدی کردار ادا کرنے سے گریز کیا' اسی طرح ہمارے سامنے بنگلا دیش کی بھی مثال ہے جہاں بنگلہ دیش کے بانی شیخ مجیب الرحمان کو ایک فوجی انقلاب کے دوران قتل کردیا گیا' مگر کچھ عرصے کے بعد ان کی بیٹی شیخ حسینہ واجد سیاست میں آئیں اور عوامی لیگ کی قیادت کرنے لگیں' وہ اب تک ایک سے زیادہ بار بنگلہ دیش کی وزیراعظم بن چکی ہیں مگر ان کو بھی ایک دوسری خاتون رہنما خالدہ ضیاء کا مقابلہ کرنا پڑا' خالدہ ضیاء' جنرل ضیاء الرحمان کی بیوہ ہیں جنہوں نے شیخ مجیب کے خلاف فوجی انقلاب کی قیادت کی اور ملک کے سربراہ بننے کے بعد بنگلا دیش نیشنلسٹ پارٹی کی بنیاد ڈالی' بعدازاں جنرل ضیاء الرحمان بھی ایک فوجی انقلاب کی کوشش کے دوران قتل کردیئے گئے' اس کے بعد ان کی پارٹی کی قیادت بھی ان کی بیوی خالدہ ضیاء کررہی ہیں' وہ بھی اب تک ایک سے زیادہ بار ملک کی وزیراعظم بن چکی ہیں' اب تک دونوں خاتون رہنماؤں حسینہ واجد اور خالدہ ضیاء کے درمیان سیاسی مقابلہ جاری ہے۔

اسی طرح سری لنکا میں سری ماوو بندرا نائیکے جو اپنے شوہر سالومن بندرا نائکے جو ملک کے وزیراعظم تھے' کے قتل کیے جانے کے بعد ملک کی وزیراعظم بنیں' اس طرح وہ دنیا کی پہلی خاتون وزیراعظم کے طور پر تاریخ میں یاد کی جاتی ہیں' ان ملکوں کے ان سیاسی خاندانوں کے برعکس بھٹو خاندان کی تاریخ انتہائی لرزا دینے والی ہے' ایک طرف ریاستی جبر نے بھٹو خاندان حتیٰ کہ اس خاندان کی خواتین بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بےنظیر بھٹو پر بھی جبر کے سارے انداز

آزمائے جبکہ دوسری طرف مگر خاندان کے مرد اور خواتین نے انتہائی جرات' بہادری سے اور عوام کے ساتھ اپنے عہد سے آمریت کا بھرپور مقابلہ کیا' ان میں سے ایک کے بعد دوسرا شہید ہوتا گیا مگر آمریت کے سامنے ہتھیار نہیں پھینکے گئے' یہ تو اب تاریخ کا حصہ ہے کہ پاکستان کے پہلے منتخب عوامی وزیراعظم کا فوجی جنرلوں نے کیسے تختہ الٹا اور اس کے بعد اسے ایک ایسے عدالتی مقدمہ کے ذریعے پھانسی دی گئی جسے بین الاقوامی جیوری قتل کا مقدمہ ماننے کے بجائے مقدمہ کا قتل قرار دیتے رہے ہیں' ذوالفقار علی بھٹو کے بعد پاکستان میں عوامی سیاست کی باگ ڈور بیگم نصرت بھٹو نے سنبھالی اور ان کی بیٹی بے نظیر بھٹو ملک کے اندر آمریت کے خلاف اس جنگ میں ان کے ساتھ تھیں جبکہ ان کے دو بیٹے ملک سے باہر پاکستان پر مسلط اس آمریت کے خلاف جدوجہد کرتے رہے' اس جنگ کے دوران سب سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو کے چھوٹے بیٹے شاہنواز بھٹو کو فرانس کے شہر نائس میں 18 جولائی 1985ء کو زہر دیکر قتل کرایا گیا' شاہنواز بھٹو کے قاتلوں کے بارے میں ہر ایک واقف ہے' اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو کے بڑے بیٹے میر مرتضیٰ بھٹو کی باری آئی' ستم ظریفی یہ ہوئی کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو اپنی بڑی بہن بے نظیر بھٹو کی حکومت میں کراچی میں ان کی خاندانی رہائش گاہ 70 کلفٹن کے سامنے پولیس کے گھیرے میں ہونے والی فائرنگ کے دوران قتل کیا گیا' یہ دن بھٹو خاندان اور خاص طور پر ایک ماں بیگم نصرت بھٹو کے لئے تو منحوس ترین دن تھا مگر وقت بتائے گا کہ یہ دن پاکستان کی تاریخ کا بھی ایک منحوس ترین دن تھا کیونکہ میر مرتضیٰ بھٹو کو اپنے ملک اور اپنی دھرتی کے لئے ایک انتہائی اہم کردار ادا کرنا تھا۔

آخر کار دنیا کی پہلی مسلم خاتون وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی نہیں بخشا گیا اور انہیں پاکستان کے ایک اور آمر حکمران جنرل پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں 27 دسمبر 2007ء میں اس وقت قتل کیا گیا جب وہ راولپنڈی کے ایک بڑے عوامی جلسے سے خطاب کرنے کے بعد جلسہ گاہ سے باہر آ رہی تھیں' اس سے پہلے دبئی سے کراچی پہنچنے پر اکتوبر 2007ء میں لاکھوں کے عوام کے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے جب وہ قائداعظم کے مزار کی طرف رواں دواں تھیں تو ان پر خودکش حملہ کیا گیا مگر، وہ خود تو معجزانہ طور پر بچ گئیں مگر ملک بھر سے آئے پی پی کے کارکنوں کی

ایک بڑی تعداد اس خودکش حملے میں اپنی جانیں گنوا بیٹھی۔ مجھے اے این پی کے مرکزی رہنما افراسیاب خٹک نے ایک بار کراچی میں ایک دوست صحافی کے گھر پر ملاقات کے دوران بتایا کہ یہ منصوبہ راولپنڈی سے پہلے پشاور کے دورے میں اسی طرح ان کو خودکش حملے کے ذریعے شہید کرنے کے سلسلے میں بھی بنایا گیا مگر اس منصوبے پر عمل نہ ہوسکا' اس طرح بھٹو خاندان میں جن کا دونسلوں سے تعلق تھا اس عوامی جنگ میں شہید کر دیئے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے حکمران جنرلوں کو خبردار کیا تھا کہ وہ عوام کے حقوق کی خاطر جان قربان کر دیں گے مگر یاد رکھیں کہ آمریت کے لئے زندہ بھٹو سے مردہ بھٹو زیادہ خطرناک ثابت ہوگا' انہوں نے اس وقت یہ بھی کہا تھا کہ اگر مجھے قتل کیا گیا تو میں دریائے سندھ کے اس پار سندھ کے قصبے میں قبر سے عوام کے مارچ کی آواز سنتا رہوں گا' مگر یہاں تو بھٹو خاندان کے دیگر افراد جن میں بیگم نصرت بھٹو' محترمہ بے نظیر بھٹو' میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو بھی شامل ہیں۔

دریائے سندھ کے اس پار اپنی قبروں میں عوام کے مارچ کی آواز سن رہے ہیں اور عوام کا آج بھی مقبول نعرہ ''جیئے بھٹو'' ہے اور ان کے سیاسی ہیرو اب بھی بھٹو خاندان کے افراد یعنی ذوالفقار علی بھٹو' مادرِ جمہوریت بیگم نصرت بھٹو' شہید بے نظیر بھٹو اور بہادر نوجوان میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو ہیں' سچی بات یہ ہے کہ عوامی قوتوں اور عوام دشمن قوتوں کی جنگ ابھی تک جاری ہے اور لوگوں کی نظروں کا مرکز اب بھی گڑھی خدا بخش بھٹو کا وہ قبرستان ہے جہاں بھٹو خاندان کے یہ بہادر افراد شہید ہو کر سوئے ہوئے ہیں اور ایک دن عوام کے فتح مارچ کی چاپ سننے کے لئے بے چین ہوں گے۔

بھٹو خاندان کی قربانیاں

کیا ذوالفقار علی بھٹو نے زیادہ بہادری کا مظاہرہ کیا یا بیگم نصرت بھٹو نے ایک خاتون ہوتے ہوئے زیادہ بہادری' بے نظیر بھٹو اس سلسلے میں اپنے ماں باپ سے آگے تھیں یا ان کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو نے زیادہ بہادری کا مظاہرہ کیا اور زیادہ قربانیاں دیں' اسی طرح اگر بھٹو خاندان کے لئے ان کے سیاسی پیروکاروں نے جو قربانیاں دیں ان کا جائزہ لیا جائے تو ایک لمحہ کے لئے یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ بھٹو خاندان نے زیادہ بہادری کا مظاہرہ کیا یا ان کے سیاسی پیروکاروں نے' یہ کام مورخوں کا ہے' سیاست کے طالب علموں کے لئے تو یہ کہنا آسان ہے کہ بھٹو صاحب کی شہادت نے شمع روشن کی' بعد میں وہ سب اس کے پروانے بنے جنہوں نے ایک کے بعد ایک اپنی جانوں کے نذرانے اس مملکت خداداد پاکستان کے لئے دیئے۔

اگر پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی چیئرمین اور پاکستان کے پہلے عوامی وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے سے بات شروع کی جائے تو ایک واقعہ تو اس وقت ملک کے سارے اخبارات میں شائع ہوا تھا اور تاریخ کا حصہ ہے' یہ واقعہ اس وقت ہوا جب 1970ء کے انتخابات کے دوران انتخابی مہم کے دوران جب وہ پیر پگارا کے گڑھ سانگھڑ میں عام جلسے سے خطاب کرنے کے لئے جا رہے تھے تو سانگھڑ کے نزدیک درختوں میں چھپے ہوئے مسلح لوگ جن کے بارے میں

بتایا گیا کہ وہ پیر پگارا کے مرید تھے اس طرح حملہ آور ہوئے کہ لگتا تھا کہ بھٹو صاحب سمیت ان کے قافلے کا کوئی فرد زندہ نہیں بچے گا' ذوالفقار علی بھٹو' مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ اور میر رسول بخش تالپور پر جب فائرنگ ہو رہی تھی تو بھٹو صاحب نے گاڑی رکوائی اور کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلے اور زوردار آواز میں کہنے لگے کہ میرے لوگوں پر گولیاں کیوں چلاتے ہو' ذوالفقار علی بھٹو میں ہوں' گولیاں چلانا ہے تو مجھ پر چلائیں' یہ سن کر گولیوں کی بوچھاڑ بھٹو صاحب پر کر دی گئی مگر اسی دوران کاروں کے جلوس میں دیگر گاڑیوں سے پی پی کارکن بھاری تعداد میں باہر نکلے اور گولیوں سے ڈرے بغیر کارکنوں نے بھٹو صاحب کا گھیراؤ کر کے انہیں نیچے گرا دیا اور ان کے اوپر ڈھال بن گئے حالانکہ بھٹو چیختے رہے کہ میرے اوپر سے ہٹو' اسی دوران جب وہاں بڑی تعداد میں پی پی کے حامی جمع ہو گئے تو پگارا کے مسلح لوگ درختوں سے اتر کر جنگل میں غائب ہو گئے' گولیوں سے بھٹو صاحب تو بچ گئے مگر گولیاں لگنے سے پی پی کے بڑی تعداد میں کارکن شدید زخمی ہو گئے جن میں سے ایک زخمی کارکن چل بسا۔

مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ سندھی کے ممتاز شاعر بھی تھے' دوسرے دن حیدرآباد سے اس وقت شائع ہونے والی پی پی کے ترجمان سندھی اخبار ڈیلی ہلال پاکستان میں اس واقعہ کے حوالے سے مخدوم طالب المولیٰ کا ایک قطعہ شائع ہوا جس کے معنی کچھ اس طرح تھے ''ہم نے یہ تو سنا تھا کہ فلاں شخص شیر کا بیٹا ہے مگر شیر کا باپ پہلی بار دیکھا ہے۔'' مجھے یاد ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو راولپنڈی جیل میں تھے اور ان کا مقدمہ سپریم کورٹ میں چل رہا تھا ایک دن مجھے اور میرے ایک دوست صحافی کو معلوم ہوا کہ پاکستان کے ممتاز سیاستدان میاں ممتاز محمد خان دولتانہ جن کا تعلق پنجاب سے تھا کراچی آئے ہوئے ہیں اور باتھ آئی لینڈ کے ایک بنگلے میں مقیم ہیں یہ معلوم ہونے کے بعد میں اور میرا یہ ساتھی صحافی دوست دولتانہ صاحب سے ملاقات کے لئے ان کے بنگلے پر گئے تاکہ ان سے سیاست پر بات چیت کر کے اپنے اخباروں کے لئے خبر مل جائے' ملاقات کے دوران جب دولتانہ صاحب کو پتہ چلا کہ میں سندھی ہوں تو انہوں نے میرے ہاتھ

پکڑ لئے اور کہنے لگے کہ آپ سندھی ہیں آپ ذوالفقار علی بھٹو صاحب سے ملاقات کر کے ان سے منوائیں کہ وہ ملک سے باہر چلے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کی کچھ جنرلوں سے بات ہوئی ہے اور میں نے ان کو قائل کرنے کی کوشش کی ہے کہ بھٹو کو نہ ماریں اس سے ملک برباد ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ جنرل بھٹو کی جان بخشی کے لئے تیار ہیں مگر ان کی شرط یہ ہے کہ وہ ملک سے باہر چلے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ جنرل اس وقت تو اس بات کے لئے تیار ہیں جبکہ بعد میں شاید اس بات کے لئے بھی تیار نہ ہوں۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے بیگم نصرت بھٹو کے ذریعے بھٹو صاحب کو پیغام بھیجے وہ یہ پیشکش قبول کر کے ملک سے باہر چلے جائیں۔

ممتاز دولتانہ نے کہا کہ میں نے یقین دہانی بھی کرائی کہ چند سالوں کے بعد میں جب وہ پاکستان آئیں گے تو لاکھوں لوگ ان کا استقبال کریں گے مگر انہوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ بھٹو صاحب نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور بیگم بھٹو کے ذریعے مجھے کہلا بھیجا ہے کہ میں تاریخ کے ہاتھوں تباہ ہونے کے بجائے جنرلوں کے ہاتھوں تباہ ہونے کو ترجیح دیتا ہوں' اس وقت ہم صحافیوں کو یہ خبریں بھی مل رہی تھیں کہ جب ذوالفقار علی بھٹو جنرل ضیاء کی قید میں تھے تو لیبیا کے اس وقت کے سربراہ کرنل قذافی اور پی ایل او کے اس وقت کے سربراہ یاسر عرفات نے بیگم نصرت بھٹو کے ذریعے راولپنڈی جیل میں مقید ذوالفقار علی بھٹو کو پیشکش کی کہ وہ خصوصی جہاز کے ذریعے کمانڈوز بھیج کر جیل سے ان کو رہا کرا کے پاکستان سے باہر لانا چاہتے ہیں مگر بھٹو صاحب نے اپنی بیگم کی وساطت سے ان کی ان پیشکشوں پر ان کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح ملک سے باہر بھاگنے سے انکار کر دیا۔ بھٹو صاحب نے اپنے ان دوستوں کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ بھگوڑا کہلوانا پسند نہیں کریں گے' بعد میں یہ اطلاع حکومت کو بھی کسی طرح مل گئی جس کے بعد بھٹو صاحب کی جیل کی کوٹھڑی کی چھت پر مستقل طور پر ڈیوٹی دینے کے لئے کمانڈوز متعین کیے گئے' اس دوران ایک غیر متوقع واقعہ یہ بھی ہوا کہ ہندوستان کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ساری دنیا کے مسلمان ملکوں کے سربراہوں کو ایک خط لکھ کر استدعا کی کہ وہ

پاکستان کے فوجی سربراہ جنرل ضیاء الحق پر دباؤ ڈالیں کہ وہ بھٹو صاحب کی جان نہ لیں' یہ انکشاف ہندوستان کے ایک سینئر صحافی نے اس وقت کیا جب وہ دہلی سے اسلام آباد جاتے ہوئے ایک رات کے لئے کراچی میں رکے تو کراچی پریس کلب کی اس وقت کی گورننگ باڈی کی طرف سے ان کو کھانے پر بلایا گیا تھا' ہندوستان کے سینئر صحافی نے وہاں موجود صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ ان کو یہ بات لیبیا کے سربراہ کرنل قذافی نے نہ فقط خود بتائی بلکہ ایک فائل لاکر ان کے حوالے کی جس میں وزیراعظم اندرا گاندھی کا وہ خط موجود تھا' اس خط میں وزیراعظم اندرا گاندھی نے لکھا تھا کہ تیسری دنیا کے لئے ضروری ہے کہ بھٹو صاحب زندہ رہیں اور ان کی جان بچائی جائے۔

جہاں تک بیگم نصرت بھٹو کا تعلق ہے تو ان کی قربانی اور بہادری کا ایک قصہ تو ملک کے تمام اخبارات میں شہ سرخیوں اور زخمی بیگم نصرت بھٹو کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوا تھا' یہ واقعہ قذافی اسٹیڈیم لاہور میں ہوا جہاں وہ ایک کرکٹ میچ دیکھنے کے لئے آئیں' بیگم نصرت بھٹو پر نظر پڑتے ہی اسٹیڈیم میں بیٹھے ہزاروں تماشائی احتراماً کھڑے ہوگئے اور پرجوش انداز میں ''جئے بھٹو'' کے نعرے لگانے لگے' انتظامیہ اور پولیس یہ سب کچھ برداشت نہ کرسکی اور پہلے تو اسٹیڈیم میں موجود عوام پر لاٹھی چارج کیا مگر بعد میں وہ بیگم نصرت بھٹو پر بھی لاٹھیاں برسانے لگے جو عوام کے نعروں کا فرط مسرت میں ہاتھ ہلا کر جواب دے رہی تھیں' بیگم نصرت بھٹو کے سر' چہرے اور بدن پر اتنی لاٹھیاں برسائی گئیں کہ ان کا سارا بدن اور خاص طور پر چہرہ اور سر لہولہان ہوگئے اور وہ زمین پر گر پڑیں جہاں سے انہیں کارکنوں نے اٹھا کر اسپتال میں داخل کرایا۔ ذوالفقار علی بھٹو پنڈی جیل میں تھے اس دوران فوجی عدالتیں بنائی گئیں' ایسی ایک فوجی عدالت کراچی کی ایم پی ایز ہاسٹل کے ایک کمرے میں قائم کی گئی' ایک مقدمہ ذوالفقار علی بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو کے خلاف دائر کیا گیا تھا جس کی سماعت کے لئے بیگم نصرت بھٹو کو طلب کیا گیا تھا چونکہ ایک دن پہلے کراچی کی پریس کو مطلع کیا گیا تھا کہ دوسرے دن بیگم نصرت بھٹو اس مقدمہ میں حاضر ہونے کے لئے صبح

سویرے ایم پی ایز ہاسٹل پہنچیں گی لہٰذا اخباری رپورٹرز کی بھی ایک بڑی تعداد ایم پی ایز ہاسٹل پہنچ گئی تو وہاں بیگم نصرت بھٹو' مخدوم امین فہیم و دیگر پی پی رہنما اور کارکنوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ بیگم نصرت بھٹو کو عدالت نے صبح 9 بجے حاضر ہونے کے لئے کہا تھا' انہوں نے انتظار والے ہال میں پی پی رہنماؤں' کارکنوں اور اخباری رپورٹرز کے ساتھ ساڑھے نو بجے تک انتظار کیا پھر اپنی گھڑی میں ٹائم دیکھنے کے بعد مخدوم امین فہیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مخدوم صاحب فوجی عدالت نے ہمیں 9 بجے صبح حاضر ہونے کے لئے کہا تھا اب اس وقت ساڑھے نو بجے رہے ہیں' ان کو ٹائم کی جو قدر ہے وہ خود دیکھ رہے ہیں جبکہ ہمیں ٹائم کی قدر ہے' میں اس سے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتی' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں' ان کے ساتھ مخدوم امین اور دیگر موجود لوگ بھی کھڑے ہوئے' بیگم نصرت بھٹو پورے وقار اور اعتماد کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتیں اس کمرے کی طرف بڑھنے لگیں جسے فوجی عدالت قرار دیا گیا تھا' اس وقت اس کمرے کا دروازہ بند تھا اور باہر کوئی بھی گارڈ موجود نہیں تھا۔

بیگم نصرت بھٹو نے دروازے کے پاس پہنچ کر زور سے دروازے کو لات ماری' دروازے کے دونوں حصے زور سے کھلے اور پھر واپس بند ہو کر پھر کھل گئے اور بیگم نصرت بھٹو اندر کمرے میں داخل ہو گئیں اور ساتھ ہی مخدوم امین اور ہم صحافی بھی عدالت کے کمرے میں داخل ہو گئے' فوجی عدالت ایک بریگیڈیئر اور ایک ایڈیشنل جج پر مشتمل تھی' ہم اندر داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ بریگیڈیئر اور ایڈیشنل جج کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور کاندھے سے کاندھا ملا کر باتیں کر رہے تھے' بیگم نصرت بھٹو اور ہمیں اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر ہمیں حیرت سے دیکھنے لگے' اس سے پہلے کہ بریگیڈیئر بات کرتے بیگم نصرت بھٹو نے گرجدار آواز میں کہا کہ آپ نے ہمیں 9 بجے صبح کو حاضر ہونے کے لئے کہا تھا جبکہ اس وقت 10 بجنے کو ہیں' آپ کو ٹائم کی یہ قدر ہے اور کیا عدالتیں اس طرح چلائی جاتی ہیں' بیگم نصرت بھٹو کو غصے میں بات کرتے ہوئے دیکھ کر بریگیڈیئر نے بیگم نصرت بھٹو کو انگریزی میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''صبر کریں' صبر کریں' یہ

عدالت ہے۔'' یہ سن کر بیگم نصرت بھٹو نے مزید گرجدار آواز میں انتہائی حقارت سے کہا کہ ''یہ عدالت ہے؟'' ابھی بیگم نصرت بھٹو بول ہی رہی تھیں تو بریگیڈیئر نے اعلان کیا کہ ہم سماعت ملتوی کررہے ہیں اور بیگم نصرت بھٹو کو مخاطب ہوکر کہا کہ ہم جلد آئندہ سماعت کی تاریخ سے آپ کو آگاہ کریں گے۔ یہ سن کر بیگم نصرت بھٹو اس کمرے سے باہر نکل آئیں اور ان کے ساتھ مخدوم امین اور ہم صحافی بھی کمرے سے باہر نکل آئے' جہاں تک شہید بے نظیر بھٹو کا تعلق ہے تو جب بے نظیر بھٹو جیل میں بھٹو صاحب سے ملنے جاتی تھیں تو بھٹو صاحب خاص طور پر تاکید کرتے تھے کہ اگر مجھے پھانسی دیدی جاتی ہے تو لوگوں کی موجودگی میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے چاہئیں۔

دنیا نے دیکھا کہ بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد بے نظیر بھٹو کی آنکھوں میں کبھی بھی آنسو نہیں دیکھے گئے' پھانسی کے بعد 70 کلفٹن میں بے نظیر بھٹو تعزیت کرنے کے لئے آنے والوں سے ملاقات کرتی تھیں، اس مرحلے پر کراچی کے صحافیوں کی ڈیوٹی 70 کلفٹن میں ہوتی تھی' ہم اخباری رپورٹر اس بات کے گواہ ہیں کہ بے نظیر بھٹو سے تعزیت کے لئے آنے والے پی پی رہنما' کارکن روتے ہوئے اور اپنا سر پیٹتے ہوئے بھٹو صاحب کے غم میں نڈھال ہوجاتے تھے تو محترمہ ان کو تسلی دینے کے لئے اٹھ کر ان کے سر پر ہاتھ رکھتی تھیں اور اکثر ان کو ماؤزے تنگ کا یہ قول دہراتے ہوئے سنا گیا ''ہمیں اپنے غم کو طاقت میں تبدیل کرنا ہوگا'' اس سارے عرصے کے دوران ایک بار بھی ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے گئے ہمیشہ جدوجہد جاری رکھنے کی تلقین کرتی تھیں بہرحال 70 کلفٹن کے کچھ ملازمین انتہائی رازداری سے بتاتے تھے کہ محترمہ لوگوں کی موجودگی میں تو نہیں روئیں مگر رات کو اپنا کمرہ بند کرنے کے بعد سر تک دیوار سے ٹکراتی تھیں۔ کراچی کے رپورٹرز نے محسوس کیا کہ شام کو محترمہ بے نظیر بھٹو سے تعزیت کے لئے آنے والوں میں شاید ایجنسیوں کے بھیجے ہوئے لوگ بھی ہوتے تھے جو بھٹو صاحب کی باتیں اس طرح بیان کرتے تھے کہ کربلا کا سماں بندھ جاتا تھا' وہ شاید اس وجہ سے کرتے تھے کہ بے نظیر بھٹو اپنے

آنسو نہ روک سکیں مگر بے نظیر بھٹو کی آنکھوں میں پھر بھی آنسو نظر نہ آتے' وہ اپنے آنسو ضبط کر کے ان کو بھی صبر سے برداشت کی تلقین کرتی تھیں' جب بے نظیر بھٹو جنرل پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں دبئی سے کراچی لوٹیں تاکہ عوام سے مل کر ان کو متحرک کر کے حکومت کو عام انتخابات کرانے کے لئے مجبور کیا جا سکے تو ان کے بہادری کے ایسے قصے ہیں جن پر ایک الگ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ بھٹو خاندان کے قریبی ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جس روز محترمہ کو دبئی سے ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی روانہ ہونا تھا اس سے ایک دن پہلے ان کی چھوٹی بہن صنم بھٹو خاص طور پر بے نظیر بھٹو سے ملنے کے لئے لندن سے دبئی آئیں اور انہوں نے ان کے کسی خاندانی دوست کے گھر پر ایک بند کمرے میں بڑی بہن سے کوئی تین گھنٹے تک ملاقات کی' اس ملاقات کے دوران صنم بھٹو نے بے نظیر بھٹو پر زور دیا کہ وہ اس وقت پاکستان نہ جائیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کی اطلاعات کے مطابق اس بار آپ پاکستان واپس گئیں تو آپ کو بھی وہی عناصر قتل کرا دیں گے جو ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے ذمہ دار تھے مگر بے نظیر بھٹو نے اپنی چھوٹی بہن سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ ان کی اطلاعات درست نہیں ہیں' اس پر دونوں بہنوں کی بحث ڈیڑھ دو گھنٹوں تک جاری رہی' اس پر صنم بھٹو خاموش ہو گئیں۔

بے نظیر بھٹو کی کراچی واپسی بھی کم تاریخی واقعہ نہیں تھا' بے نظیر بھٹو کو کراچی ایئرپورٹ سے جس ٹرک پر چڑھ کر قائداعظم کے مزار تک جانا تھا اس کی چھت پر پردہ نما ایک بڑا بلٹ پروف آویزاں کیا گیا تھا جس کے پیچھے کھڑے ہو کر انہیں ان کے استقبال کے لئے آنے والے لوگوں کا ہاتھ ہلا کر جواب دینا تھا' کراچی ایئرپورٹ آنے کے بعد ہوائی جہاز سے اترنے کے بعد انہوں نے ہاتھ اٹھا کر وطن واپسی پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا' اس وقت ان کی آنکھوں سے آنسو رواں دواں تھے' بعد میں جب وہ شاندار انداز میں آراستہ ٹرک کی چھت پر پہنچیں تو سب سے پہلے انہوں نے یہ بلٹ پروف ہٹانے کا حکم دیا' اس مرحلے پر ٹرک پر موجود پارٹی کے سارے مرکزی رہنماؤں نے محترمہ کو سمجھایا کہ یہ بلٹ پروف بہت ضروری ہے کیونکہ اطلاعات

ہیں کہ آپ پر اور آپ کے اس جلوس پر خودکش حملہ ہوسکتا ہے' مگر محترمہ نہیں مانیں اور انتہائی جذباتی انداز میں کہنے لگیں کہ میرے یہ سارے ورکر تو بغیر کسی ایسے تحفظ کے آسمان کے نیچے کھڑے ہیں اور میں بلٹ پروف کا سہارا لوں؟ ''نہیں یہ نہیں ہوسکتا'' آصف زرداری جو دبئی سے ٹیلی فون پر محترمہ سے اور دیگر پارٹی رہنماؤں سے رابطے میں تھے وہ یہ سب کچھ معلوم کرکے پریشان ہوگئے اور خود ٹیلی فون پر محترمہ سے بات کی اور ان پر زور دیا کہ ان کے تحفظ کے لئے یہ بلٹ پروف بہت ضروری ہے اور اسے نہ ہٹایا جائے مگر انہوں نے ان کی بھی نہیں سنی۔ شاید کراچی نے اتنا بڑا اجتماع پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا' لوگ ملک بھر سے حتیٰ کہ آزاد کشمیر' گلگت بلتستان اور علاقہ غیر سے بھی ان کا استقبال کرنے اور ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے' ہوائی اڈے جانے والے سارے راستے بارہ بجے سے عوام کے جمِ غفیر کے پاؤں تلے تھے' ہر طرف لوگوں کے سر ہی سر نظر آرہے تھے۔

بہرحال وہ منحوس گھڑی بھی آئی جب پہلے ایک خودکش بمبار کا حملہ ہوا اور اس کے بعد ٹرک کے آس پاس ایک اور دھماکہ ہوا' محترمہ معجزانہ طور پر اس وقت ٹرک کے Bootom میں بنے ہوئے کمرے میں تھیں' ٹرک کے باہر قیامت برپا تھی' ہر طرف خون اور چیخوں کی آوازیں تھیں اس صورتحال میں بھی جیئے بھٹو کے نعروں کی گونج نہیں تھمی' دیکھنے والوں نے دیکھا کہ زخمی جیالے ہاتھوں میں ہاتھ دیکر ٹرک کے گرد جمع ہوگئے تاکہ محترمہ بےنظیر بھٹو کو کوئی گزند نہ پہنچے حالانکہ ٹرک کے اردگرد لاشوں کے انبار لگ چکے تھے' یہ وقت تھا جب اس بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا کہ بھٹو خاندان کے لوگوں کو عوام سے زیادہ محبت ہے یا عوام اور کارکنوں کو بھٹو خاندان کے افراد سے زیادہ محبت ہے' اس وقت پی پی کارکنوں اور پروانوں میں فرق کرنا مشکل ہورہا تھا' بم کے گولے پھٹ رہے تھے ایک طرف لاشیں تھیں تو دوسری طرف درجنوں زخمی خون میں لہولہان ٹرک کے ارگرد پڑے ہوئے تھے' اس دہشت ناک صورتحال کے باوجود پی پی کارکن ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پروانوں کی طرح اس ٹرک کی طرف اپنی قائد کی حفاظت کے لئے بڑھ

رہے تھے جس میں ان کی قائد تھیں، اس مرحلے پر پولیس کے محافظ آگے بڑھے اور چند پی پی رہنماؤں کو ساتھ لیکر ٹرک کے اندر بے نظیر بھٹو کے گرد جمع ہو گئے اور زبردستی انہیں ٹرک سے نیچے اتار کر پولیس کی ایک گاڑی میں لا کر بٹھایا گیا جب بے نظیر بھٹو پولیس کی حفاظت میں ٹرک سے نکل کر بلاول ہاؤس لے جانے کی کوششوں کی مزاحمت کرتی دیکھی گئیں اور چیختی رہیں کہ میں اپنے کارکنوں کو اس حالت میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی، اس مرحلے پر پی پی کے کئی مرکزی رہنما آگے آئے اور محترمہ کو بلاول ہاؤس واپس جانے پر مجبور کیا۔ بلاول ہاؤس پہنچنے کے بعد اطلاعات کے بعد حکومت کی طرف سے اعلیٰ سطح پر محترمہ بے نظیر بھٹو کو متنبہ کیا گیا کہ چونکہ ان کی زندگی کو خطرہ ہے لہٰذا وہ حکومت کی اجازت کے بغیر بلاول ہاؤس سے باہر نہ جائیں۔

دوسرے دن ان اطلاعات کے باوجود کہ بے نظیر بھٹو کے بلاول ہاؤس سے باہر جانے پر حکومت اور پارٹی کی طرف سے پابندی عائد کی گئی ہے کراچی کے اکثر رپورٹر صبح کو ہی بلاول ہاؤس کے باہر جمع ہو گئے کہ دیکھیں بلاول ہاؤس کی طرف سے کیا سرگرمی ہوتی ہے، تقریباً 11 بجے صبح کو صحافیوں نے دیکھا کہ ایک گاڑی جس کی کھڑکیوں پر کالے پردے چڑھے ہوئے ہیں بلاول ہاؤس کے گیٹ سے باہر آئی اور ساتھ ہی پیچھے ایک اور کار بھی تھی، جب پہلی کار صحافیوں کے قریب گزری تو پتہ چلا کہ اس گاڑی میں بے نظیر بھٹو موجود ہیں، یہ معلوم ہوتے ہی صحافی موٹر سائیکلوں پر اور جن کے پاس گاڑیاں تھیں ان میں سوار ہو گئے اور یہ کاریں اور موٹر سائیکلیں بے نظیر بھٹو کی گاڑی کے پیچھے ہولیں، محترمہ کی گاڑی سیدھی قائداعظم کے مزار پر پہنچی وہاں پر وہ گاڑی سے باہر آ کر پی پی کے رہنماؤں کے ساتھ مزار پر پہنچیں اور فاتحہ پڑھی، یہاں ان کی میڈیا سے مختصر گفتگو بھی ہوئی، وہاں سے محترمہ کی یہ کار بمعہ صحافیوں کی ان گاڑیوں کے جناح اسپتال پہنچی، وہاں پہنچتے ہی وہ اسپتال کے مختلف وارڈز میں داخل ہو گئیں جہاں پی پی کے کئی زخمی کارکن زیر علاج تھے کسی کی ٹانگ بندھی ہوئی تھی تو کسی کا بازو تو کوئی بے ہوش تھا، مگر جس جس زخمی پی پی کارکن کی نظر بے نظیر بھٹو پر پڑی وہ زخمی ہوتے ہوئے بھی اٹھنے کی کوشش کرنے لگا اور پر جوش

انداز میں جئے بھٹو کے نعرے گونج اٹھے، محترمہ اسپتال میں داخل ایک ایک زخمی کارکن کے پاس گئیں اور مزاج پرسی کرنے کے ساتھ ان کو تسلی بھی دیتی رہیں۔ شاید بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہو کہ اس خودکش حملے میں ملک بھر سے آئے ہوئے جو بھی پی پی کارکن اپنی جان گنوا بیٹھے تھے ان کو پارٹی کی طرف سے گڑھی خدا بخش لا کر شہیدوں کے قبرستان میں دیگر شہیدوں کے ساتھ دفن کیا گیا، جناح اسپتال کے بعد بے نظیر بھٹو ان کی پارٹی کے گڑھ لیاری پہنچیں، بے نظیر بھٹو کی لیاری پہنچنے کی خبر آگ کی طرح فوری طور پر سارے لیاری میں پھیل گئی اور چند منٹوں میں سارا لیاری باہر راستوں پر تھا جن میں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے سب شامل تھے، لوگ خوشی کے آنسو بھی رو رہے تھے تو خوشی میں ڈانس بھی کر رہے تھے، بے نظیر بھٹو لیاری کی عورتوں، بچوں اور بچیوں سے گلے ملیں، اس طرح کوئی ایک دو گھنٹوں تک وہ لیاری میں تھیں، محترمہ کچھ گھروں میں بھی گئیں، پتہ نہیں اس وقت محترمہ بے نظیر بھٹو لیاری کی گود میں تھیں یا لیاری محترمہ کی گود میں تھا، باہمی رشتوں کا یہ ایک انمول مظاہرہ تھا، اس کے گواہ لوگ تھے یا نہیں مگر آسمان اور زمین ضرور تھے، جہاں تک مرتضٰی بھٹو اور شاہنواز بھٹو کا تعلق ہے تو ان کی بہادری اور عوام و جمہوریت کے ساتھ لگن کی اس سے زیادہ اور کیا مثال مل سکے گی کہ انہوں نے ملک میں جمہوریت بحال کرنے اور آمریت کو شکست دینے کے لئے انتہائی مشکل راستہ اختیار کیا اور ایک ایسے مشن پر نکل پڑے جس میں سروں کی قربانی لینی تھی یا دینی تھی، میر مرتضٰی بھٹو کے سلسلے میں ایک واقعہ کا میں عینی گواہ ہوں جس رات کو جناب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی اس کے دوسرے دن صبح کو ہم چند صحافی بھٹو صاحب کی ہمشیرہ بیگم منور الاسلام کے گھر پہنچ گئے وہاں پہنچنے کے بعد پتہ چلا کہ بھٹو صاحب کی بہن فجر کے وقت یہ اطلاع ملنے کے بعد کہ بھٹو صاحب کو پھانسی دیدی گئی ہے بے ہوش ہیں اور ڈاکٹر ان کو ہوش میں لانے کی کوششیں کر رہے تھے، ہم وہاں موجود تھے تو وہاں لندن سے میر مرتضٰی بھٹو کا ٹیلی فون آیا انہوں نے منور الاسلام کے بچوں کو بتایا کہ انہوں نے کراچی کی ٹکٹ لے لی ہے اور وہ کراچی آنے والی پہلی فلائٹ سے کراچی آ رہے ہیں، یہ سن کر ایک ایک کر کے منور

الاسلام اور ان کے بچے باری باری ٹیلی فون پر میر مرتضیٰ بھٹو کو منع کرتے رہے کہ وہ پاکستان واپس نہ آئیں کیونکہ ان کی جان کو بھی خطرہ ہے' اس مرحلے پر دوسری طرف سے مرتضیٰ بھٹو غصے میں چیخ چیخ کر بول رہے تھے' ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ ہم صحافی بھی ان کی یہ آواز سن رہے تھے' وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ آپ مجھے پاکستان لوٹنے سے کیسے روک سکتے ہیں' میرے والد کو شہید کر دیا گیا ہے اور میری والدہ اور میری بہن جنرلوں کے قبضے میں ہیں' ایسے مرحلے پر وہ باہر کیسے رہ سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے دنیا کی کوئی طاقت پاکستان واپس لوٹنے سے نہیں روک سکتی' اس وقت وہاں پی پی کی ایک مرکزی رہنما اور قومی اسمبلی کی سابقہ ڈپٹی اسپیکر ڈاکٹر مسز اشرف عباسی بھی موجود تھیں' وہ آگے بڑھیں اور ٹیلی فون اپنے ہاتھ میں لیکر زوردار آواز میں میر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میرے پاس آپ کے لئے بیگم نصرت بھٹو کا ایک پیغام ہے جو میں آپ کو دینا چاہتی ہوں' انہوں نے کہا کہ مجھے بیگم نصرت بھٹو نے کہا تھا کہ بھٹو صاحب کی پھانسی چڑھنے کے بعد اگر مرتضیٰ بھٹو پاکستان لوٹنے کا فیصلہ کرے تو اس کو واضح طور پر یہ پیغام دیجئے گا کہ اگر اس مرحلے پر تم پاکستان آئے تو میں تجھے ماں کا دودھ نہیں بخشوں گی۔ یہ سننے کے بعد میر خاموش ہو گئے' بیگم اشرف عباسی نے کہا کہ بیگم نصرت بھٹو نے کہا ہے کہ آپ برطانیہ میں ہی رہیں اور صنم بھٹو اور شاہنواز بھٹو کا خیال رکھیں۔

جہاں تک پی پی کے کارکنوں اور بھٹو کے عقیدتمندوں کی قربانیوں کا تعلق ہے تو یہ بھی ایک الگ تاریخ ہے' کیا دنیا کی موجودہ تاریخ میں کوئی ایک ایسی مثال ہے کہ کارکنوں نے اپنے قائد کی جان بچانے کے لئے خود کو جلا کر خودکشی کر لی' ان قربانیوں کے راولپنڈی کا لیاقت باغ' سڑکیں اور راستے گواہ ہیں' ہم صحافی جنرل ضیاء کے دور میں آزادی صحافت کی تحریک میں گرفتاریاں پیش کر رہے تھے ان قیدیوں میں راقم بھی تھا اور دیگر صحافیوں کے ساتھ کراچی سینٹرل جیل کے ایک سیل میں قید تھا' ہمارے ساتھ لیاری کے وہ پی پی کارکن بھی تھے جو بھٹو کی رہائی کے لئے جلوس نکالنے پر گرفتار ہو کر اس جیل کے اس سیل میں ہمارے ساتھ بند تھے' رات کو قیدی پہلے

سیاسی کچہری کرتے تھے اس کے بعد نغمے گائے جاتے تھے' آخری نغمہ پی پی کارکن لوہے کے چھوٹے ڈبوں کو انگلیوں سے بجا کر بھٹو کے بارے میں گاتے تھے' اس مصرعے کا آخری بند ہوتا تھا ''بچہ بچہ کٹ مرے گا' بھٹو' پھانسی نہیں چڑھے گا'' جب یہ پی پی کارکن جنون میں آکر یہ الفاظ گاتے تھے تو زور زور سے اس ڈبے کو اس طرح بجاتے تھے کہ ان کی انگلیوں سے خون بہنے لگتا تھا' یہ روز کا معمول تھا۔ یہ بات بھی کسی سے چھپی نہیں کہ جب بھٹو کے ایک شیدائی لیاری کے ایاز سموں کو پھانسی دی گئی تو وہ پھانسی گھاٹ تک جئے بھٹو کے نعرے لگاتا ہوا گیا اور پھانسی چڑھ گیا۔ سچی بات یہ ہے کہ پی پی کی تاریخ بھٹو خاندان اور پی پی کارکنوں کی تاریخ سیاسی قربانیوں کی ایک ایسی تاریخ ہے جس کی مثل آج کی دنیا میں ملنا مشکل ہے۔

بھٹو کی سیاست میں بیگم بھٹو کا کردار

مشہور کہاوت ہے کہ دنیا کے ہر بڑے آدمی کے پیچھے کوئی نہ کوئی عورت ہوتی ہے' دیکھا جائے تو کافی حد تک اس کہاوت کا اطلاق ذوالفقار علی بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو کے سنگم اور ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی عروج پر بھی ہوتا ہے' اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ذوالفقار علی بھٹو کو ایک انتہائی پرکشش شخصیت کے ساتھ بے انتہا اعلیٰ صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا۔ انہوں نے دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں کی یونیورسٹیوں اور برطانیہ کے لنکن ان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی لہٰذا انہیں خود پر بے پناہ اعتماد تھا' وہ نہ فقط اعلیٰ پائے کے مقرر تھے مگر خاص طور پر انہیں انگریزی اور عالمی امور پر عبور تھا' ان کی خداداد صلاحیتوں میں ان کے اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے مزید اضافہ ہوا' ان کا سندھ کے ایک اعلیٰ خاندان یعنی لاڑکانہ کے بھٹو خاندان سے تعلق تھا اور ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب بھٹو نے آنکھیں کھولیں تو اسے چاندی کے چمچوں سے پانی پلایا جاتا تھا' خوش قسمتی سے بیگم نصرت بھٹو جن سے ان کی شادی ہوئی ان کا بھی ایران کے ایک انتہائی کلچرل اور امیر گھرانے سے تعلق تھا اور ان کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیگم نصرت بھٹو نے بھی جب ایران میں اصفہانی خاندان میں آنکھیں کھولیں تو انہیں بھی چاندی کے چمچوں سے پانی پلایا جاتا تھا لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جوڑی بچپن سے چاندی کے چمچوں کے استعمال کی عادی تھیں' ذوالفقار علی بھٹو میں جو صلاحیتیں شروع سے تھیں اس کی بناء پر

ان کے بارے میں ان کے خاندان کے بزرگ پیشنگوئی کرتے تھے کہ ذلفی بڑا ہو کر بہت بڑا آدمی بنے گا' ایسی ہی پیش گوئی ایک بار اس وقت سندھ کے ایک ممتاز سیاستدان اور سندھ اسمبلی کے سابق اسپیکر سید میران محمد شاہ نے بھی کی جو ذوالفقار علی بھٹو کے والد سر شاہنواز بھٹو کے گہرے دوست تھے اور جو ایک بار اپنے بیٹے ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ میران محمد شاہ سے ملاقات کرنے آئے تو محض چھ سالہ ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت سے سید میران محمد شاہ بہت متاثر ہوئے اور سر شاہنواز بھٹو کو کہا کہ تمہارا یہ بیٹا ذوالفقار علی بھٹو ایک دن بہت بڑا آدمی بنے گا، مگر تاریخ کے بھی عجیب فیصلے ہیں' نہ فقط ذوالفقار علی بھٹو اور نصرت بھٹو کی شادی ہوئی مگر قدرت کے فیصلے کے نتیجے میں معجزانہ طور پر بیگم نصرت بھٹو' ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی عروج کے لئے پہلی سیڑھی ثابت ہوئیں جس وقت ابھی ذوالفقار علی بھٹو لندن میں اپنی اسٹڈی مکمل کر رہے تھے بیگم نصرت بھٹو اس دوران لندن کے ہوٹل میں رہ رہی تھیں' اس طرح لنکن ان سے فارغ ہونے کے بعد دونوں ایک دوسرے کو کمپنی دیتے تھے۔

ان دنوں پاکستان کے صدر اسکندر مرزا تھے' اسکندر مرزا کی بیگم ناہید اسکندر مرزا بھی ایرانی تھیں' ایران میں نصرت بھٹو کی اصفہانی فیملی اور ناہید مرزا کی فیملی کے ایک دوسرے کے ساتھ گہرے تعلقات تھے' اس طرح بیگم نصرت بھٹو اور ناہید اسکندر مرزا کے درمیان بھی گہرے مراسم تھے' جب ایک بار صدر اسکندر مرزا اور بیگم ناہید اسکندر مرزا لندن کے دورے پر آئے تو لندن میں ان سے بیگم نصرت بھٹو اور ذوالفقار علی بھٹو ملنے آئے' ذوالفقار علی بھٹو سے ملنے اور مختلف ایشوز پر بات چیت کے دوران صدر اسکندر مرزا ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت اور صلاحیتوں سے بڑے متاثر ہوئے' تعلیم ختم کرنے کے بعد جب ذوالفقار علی بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو پاکستان لوٹے تو اکثر ان کی صدر اسکندر مرزا اور بیگم ناہید اسکندر مرزا سے ملاقاتیں ہوتی تھیں' انہی دنوں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں کچھ اہم ایشوز پر بحث ہو رہی تھی اس وقت وزارت خارجہ کو ایک ایسے باصلاحیت نوجوان کی ضرورت تھی جو اس بحث میں جنرل اسمبلی میں پاکستان کی صحیح نمائندگی

کرے تا کہ پاکستان کا موقف انتہائی موثر انداز میں رکھا جا سکے' جنرل اسکندر مرزا کی نظر انتخاب ذوالفقار علی بھٹو پر پڑی اور انہیں اس فرض کی ادائیگی کے لئے منتخب کیا گیا' اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کے لئے یہ ذوالفقار علی بھٹو کے لئے سنہری موقع تھا' وہ اس وفد کے ممبر کی حیثیت میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پہنچ گئے وہ شاید اس وقت جنرل اسمبلی میں دنیا کے مختلف ملکوں کے مندوبین میں سب سے چھوٹی عمر کے مگر انتہائی اسمارٹ' ذہین اور پرکشش شخصیت کے مالک مندوب تھے' باقی صلاحیتوں کا مظاہرہ انہوں نے اپنے عالمی امور پر عبور اور تقریر کے اعلیٰ فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کیا' ان کی کارکردگی کی جو اطلاعات پاکستان کے حکمرانوں کو مل رہی تھیں، وہ بھی ان سے بہت متاثر ہوئے مگر دنیا کے اکثر مندوبین جنہوں نے جنرل اسمبلی میں ان کی تقریریں سنیں اور ان سے ملاقاتیں کرتے رہے' وہ بھی ان سے بڑے متاثر ہوئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اقوام متحدہ میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے تقریر کرنے کا یہ موقع 1957ء میں ملا جب ان کی عمر ابھی 29 سال تھی' اسی دوران اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے ممبر کی حیثیت میں ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام متحدہ کی چھٹی کانفرنس میں ''جارحیت کی تشریح'' کے موضوع پر بھی تقریر کی۔

عالمی مبصرین کے مطابق ذوالفقار علی بھٹو کی یہ تقریر اب تک اقوام متحدہ کے اجلاسوں میں اس موضوع پر کی گئی تقریروں میں سب سے بہتر تقریر قرار دی گئی' بعد میں مارچ 1958ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں ہونے والی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کرتے ہوئے انہوں نے انسانی ذات کے حقوق کی انتہائی دلیرانہ انداز میں وکالت کی اور خاص طور پر کانفرنس کے مندوبین نے بھٹو کے اس اعلان کو بہت سراہا کہ ''بڑے سے بڑے سمندر انسانی ذات کی ملکیت ہیں اور ان کو وہاں جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'' واضح رہے کہ اس کانفرنس کا موضوع ''سمندر کے بارے میں قوانین'' تھا' اسی دوران جنرل ایوب خان نے اسکندر مرزا کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور خود چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا' اس دوران خود جنرل ایوب خان کے مشاہدے میں نوجوان

ذوالفقار علی بھٹو کی صلاحیتیں آ چکی تھیں اور ان کے دل ہی دل میں کافی معترف تھے۔ مختلف مواقعوں پر ذوالفقار علی بھٹو کی فیلڈ مارشل ایوب خان سے متعدد ملاقاتیں ہو چکی تھیں جن کے دوران ایوب خان بھٹو سے مزید متاثر ہو گئے' ایوب خان کو اپنی کابینہ میں سندھ سے بھی کسی کو نمائندگی دینی تھی اور کابینہ میں شامل کرنا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خاندانی پس منظر کی وجہ سے بھی ایوب خان کی نظر انتخاب ذوالفقار علی بھٹو پر پڑی کیونکہ ان کا تعلق سندھ کے ایک اہم ضلع لاڑکانہ اور سندھ کے ایک بااثر سیاسی خاندان بھٹو خاندان سے تھا اور ان کے والد سر شاہنواز بھٹو کا سندھ کی سیاست بمع ممبئی کی سیاست میں اپنا ایک اہم مقام تھا۔ سر شاہنواز بھٹو کی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے انہیں جونا گڑھ کے نواب نے جونا گڑھ کا چیف منسٹر مقرر کیا ہوا تھا' ذوالفقار علی بھٹو کو سندھ سے وفاقی کابینہ میں شامل کرنے کی ایک اور وجہ بھی تھی' مارشل لاء لگنے سے پہلے سندھ کی سیاست میں خان بہادر محمد ایوب کھوڑو کا طوطی بولتا تھا' وہ ایک لمبے عرصے تک سندھ کے وزیر اعلیٰ رہ چکے تھے اور انہیں سندھ کا مرد آہن کہا جاتا تھا' جب ایوب خان نے مارشل لاء لگایا تو ملک بھر سے جن سیاستدانوں پر ایبڈو لگا کر ان پر سیاست میں حصہ لینے پر پابندی لگادی گئی تھی ان سب میں نمایاں نام ایوب کھوڑو کا تھا' حالانکہ ایوب کھوڑو پر ایک خاص مدت کے لئے سیاست میں حصہ لینے پر پابندی لگادی گئی تھی اس کے باوجود ایوب خان کو ایوب کھوڑو کی سیاسی اہمیت کا احساس تھا اور وہ پس منظر میں رہ کر بھی ایوب خان کے لئے مشکلات پیدا کر سکتے تھے' لہٰذا اس صورتحال میں ایوب خان کی نظر میں ان کی کابینہ کے لئے سندھ سے ذوالفقار علی بھٹو سے زیادہ اور کوئی مناسب سیاستدان نہیں تھا' بعد میں ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی صلاحیتوں سے نہ فقط ان توقعات کو درست ثابت کر دکھایا بلکہ ان توقعات سے بھی کافی آگے نکل گئے۔

جب ذوالفقار علی بھٹو ایوب خان کی کابینہ میں شامل ہوئے تو اس وقت وہ کابینہ کے سارے وزیروں میں سب سے کم عمر وزیر تھے' اس وقت ان کی عمر 30 سال تھی' شروع میں ذوالفقار علی بھٹو کے پاس انرجی اور قدرتی وسائل کی وزارت تھی اور بعد میں انہیں ترقی دیکر

تجارت' اطلاعات اور قومی تعمیرِ نو کا وزیر بنایا گیا' اس وقت ہمارے سیاستدانوں میں ابھی قدرتی وسائل جیسے محکمے کی حقیقی اہمیت واضح نہیں ہوئی تھی لہٰذا جو وزیر بنتے تھے وہ اس محکمے کو لینے کے لئے دل سے تیار نہیں ہوتے تھے' مگر ذوالفقار علی بھٹو نے سیاست کے ابتدائی ایام میں ہی اس وزارت کی اہمیت کو پہچانا اور اس وزارت کے ذریعے ایسے کارنامے انجام دیئے جو پاکستان کی تاریخ کا انمول حصہ بنے' اس وقت ذوالفقار علی بھٹو نے ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا' ان سے پہلے پاکستان کے سارے حکمران امریکہ کی طرف جھکے ہوئے تھے اور سیٹو اور سینٹو کے ممبر ہونے کے ناطے سے امریکا سے زیادہ سے زیادہ ملک کے لئے اور اپنے لئے فوائد حاصل کرنے کی جستجو میں تھے۔

بھٹو پاکستان کے پہلے سیاستدان اور وفاقی وزیر تھے جو اس وقت روس کے قریب گئے اور ان سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت روس کے متعلقہ سائنسی اداروں کی طرف سے پاکستان کی زمین کا سیٹلائٹ سروے کیا گیا کہ پاکستان میں کہاں کہاں تیل کے ذخائر ہیں' بعد میں سندھ میں' پنجاب میں اور بلوچستان میں جن جن مقامات سے تیل اور گیس کے ذخائر ملے تو یہ سب اس نقشے کے مرہونِ منت تھے جو روس کی طرف سے اس وقت پاکستان کی زمین کا سیٹلائٹ سروے کے نتیجے میں بنایا گیا تھا' اس نقشے سے پتہ چلا کہ پاکستان کے علاقے تھر اور بدین سے ملحق رن کچھ کے ڈیزرٹ کے علاقے میں تیل کے وافر مقدار میں ذخائر ہیں چونکہ بھٹو کا تعلق سندھ سے تھا لہٰذا انہوں نے اس سلسلے میں سندھ کے ریونیو کے سینئر افسران اور وزارت خارجہ کے افسران سے مشورہ کیا تو یہ بات افشا ہوئی کہ رن کچھ کے جن علاقوں میں تیل کے ذخائر ہیں وہ اصل میں سندھ (پاکستان) کا حصہ ہیں مگر بدقسمتی سے پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم کے وقت پاکستان اور ہندوستان کی سرحدوں کی نشاندہی کرنے کے لئے ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں پر مشتمل جو بارڈر کمیشن بنایا گیا تھا اس کے پاکستان سے تعلق رکھنے والے ممبران نے سندھ میں باؤنڈری کی تقسیم کے دوران اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ یہ علاقے سندھ پاکستان

کے ہیں یا ہندوستان کے، بدقسمتی سے یہ علاقہ ہندوستان کے حوالے کر دیا گیا، مگر چونکہ ذوالفقار علی بھٹو ایک محبِ وطن پاکستانی تھے اور انہیں اپنے اوپر بہت اعتماد تھا لہٰذا انہوں نے خاموشی سے اس بات پر کام جاری رکھا کہ کیا رن کچھ کا یہ علاقہ واقعی ہندوستان کا ہے یا سندھ (پاکستان) کا، ذوالفقار علی بھٹو کا اپنے اوپر اعتماد کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو ایک بار وائٹ ہاؤس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا تھا کہ اگر میں امریکا میں پیدا ہوا ہوتا تو امریکہ کا صدر بن کر اس وائٹ ہاؤس میں رہتا جہاں تک رن کچھ کا تعلق ہے تو پاکستان کی تاریخ گواہ ہے کہ آخر کار ایک مرحلے پر جب بھٹو پاکستان کے وزیر خارجہ بنے تو انہوں نے پاکستان کے صدر ایوب خان کو اس بات پر قائل کیا کہ رن کچھ کا فلاں حصہ سندھ (پاکستان) کا حصہ ہے، بعد میں پاکستان نے رسمی طور پر یہ ایشو ہندوستان کے ساتھ اٹھایا اور بعد میں 1965ء میں رن کچھ کے مسئلے پر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان پہلی جنگ ہوئی، اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ بندی کے بعد رن کچھ پر جنیوا میں اقوام متحدہ کے ماتحت ایک بین الاقوامی ٹربیونل بنایا گیا جس میں پاکستان نے اپنا نمائندہ ایران کے ایک سینئر وکیل کو نامزد کیا اور ہندوستان نے اپنا نمائندہ یوگوسلاویہ کے ایک سینئر وکیل کو نامزد کیا، اس تنازعہ کے لئے سندھ کے ریونیو کے اعلیٰ افسر عبداللہ چنہ نے پاکستان کا ایک انتہائی مضبوط کیس تیار کیا، بعد میں اسی سال کشمیر کے ایشو پر ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ہوئی، جنگ کے دوران ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پاکستان کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے تقریر کے دوران پاکستان کے کیس کی انتہائی پرزور وکالت کی۔

یہ تقریر پاکستان کے عوام میں اس حد تک مقبول ہوئی کہ 1965ء کی جنگ میں ایوب خان کے بجائے ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے ہیرو کے طور پر سامنے آئے اور پاکستان کے لوگ بھٹو سے عشق کرنے لگے، اس کے نتیجے میں ایوب خان اور بھٹو میں اختلافات اس حد تک بڑھے کہ انہیں ایوب کی حکومت سے الگ ہونا پڑا، بھٹو کے حکومت سے الگ ہونے کے بعد جنیوا کے

ٹریبونل میں پاکستان حکومت نے رن کچھ کے کیس میں دلچسپی لینا کم کر دی لہٰذا جلد ہی اس ٹریبونل نے پاکستان کا کیس خارج کر دیا' پاکستان کا اتنا اہم کیس کیوں خارج کر دیا گیا' اس کے نتیجے میں پاکستان اور سندھ کو کیا نقصانات ہوئے؟' وقت آنے پر ان سوالات پر ایک الگ کتاب لکھی جاسکتی ہے' ایک رائے یہ ہے کہ آج بھی یہ کیس واپس بحال کر کے جیتا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے انرجی اور قدرتی وسائل کے وزیر کی حیثیت سے ذوالفقار علی بھٹو نے 1960ء میں روس سے گفت وشنید کے ذریعے پاکستان میں تیل اور گیس کی تلاش کے لئے ایک ایگریمنٹ پر روس کے ساتھ دستخط کیے' 1961ء میں بھٹو صاحب کی کوششوں سے پاکستان میں گیس اینڈ منرل ڈویلپمنٹ کارپوریشن قائم کی گئی اور بعد میں ان کی کوششوں سے 1962ء میں کراچی میں پاکستان میں تیل صاف کرنے کا پہلا کارخانہ قائم کیا گیا' اس سارے عرصے کے دوران بھٹو صاحب کی ان صلاحیتوں کی وجہ سے وہ ایوب خان کے انتہائی قریبی اور قابل اعتماد مشیر بن گئے' لہٰذا اس سارے عرصے کے دوران ایوب خان کی حکومت میں بھٹو کے سیاسی اثر' اختیارات میں خاصہ اضافہ ہوا۔

یہ بات بھی کم دلچسپ نہیں کہ کم عمری اور کم تجربے کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو نے 1960ء میں ہندوستان سے انڈس واٹر ٹریٹی کے سلسلے میں ہندوستان' پاکستان اور عالمی بینک کے درمیان ہونے والی بات چیت کے دوران ایوب خان کی خاصی مدد کی' یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ بھٹو نے سوویت یونین سے پاکستان میں گیس اور تیل تلاش کا جو معاہدہ کیا اس کے تحت روس پاکستان کو اس سلسلے میں معاشی اور فنی امداد دینے پر بھی رضا مند ہو گیا' سن 1958ء سے 1960ء کے دوران جب تک وہ ایوب کابینہ کا حصہ رہے وہ کون کون سے عہدوں پر رہے اور کس کس حیثیت میں کس کس فورم پر پاکستان کی نمائندگی کی' اس کی مختصر تفصیل یہ ہے: 1958ء میں وزیر تجارت رہے' 1959ء میں اطلاعات اور تعمیر نو کے وزیر رہے' 1960ء میں فیول اور پاور کے وزیر رہے' 1959,1960,1963 اور 1965ء میں اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کی قیادت کرتے رہے' 1960ء میں پاکستان کے وفد کی قیادت کرتے ہوئے روس کا دورہ کیا جہاں انہوں نے

120 روبلس کے قرضے سے پاکستان میں تیل کی تلاش کے لئے روس سے معاہدہ کیا۔

اس مرحلے پر یہ بات ریکارڈ پر لانا بھی ضروری ہے کہ ابھی ذوالفقار علی بھٹو قدرتی وسائل یا بعد میں تجارت کے ہی وزیر تھے تو ملک بھر کے طلباء اور نوجوان نسل میں بھٹو بہت مقبول ہوگئے' ان دنوں کشمیر کا ایشو تازہ تھا حالانکہ بھٹو ابھی وزیر خارجہ نہیں بنے تھے مگر ان کا پسندیدہ موضوع کشمیر ہوتا تھا' ایک بار وہ سندھ یونیورسٹی کی دعوت پر سندھ یونیورسٹی کی پرانی عمارت کے لائبریری ہال میں کشمیر کے مسئلے پر لیکچر دینے آئے اس وقت سارا ہال اور صحن طلباء اور اساتذہ سے بھرا ہوا تھا' بھٹو صاحب کی تقریر میں طنز بھی اعلیٰ درجے کا ہوتا تھا' تقریر کے دوران ایک مرحلے پر انہوں نے کہا کہ ہمارے کچھ سیاستدان کہتے ہیں کہ ایوب خان نہرو سے کشمیر لے کیوں نہیں لیتے' اس وقت مغربی پاکستان کی کابینہ میں سندھ سے دو وزیر در محمد اوستو اور محمد خان جونیجو بھی تھے' بھٹو نے اس نکتے کا طنزیہ انداز میں ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے سیاستدان شاید سمجھتے ہیں کہ پنڈت جواہر لعل نہرو کی حیثیت بھی محمد خان جونیجو اور در محمد اوستو جیسی ہے اور جس وقت ایوب خان چاہیں اوستو اور جونیجو کی طرح نہرو کو کان سے پکڑ کر وزارت عظمیٰ سے ہٹا سکتے ہیں' اس بات پر ایک بڑا قہقہہ لگا۔ بھٹو صاحب کے ساتھ بیگم نصرت بھٹو بھی انتہائی پروقار انداز میں اس تقریب میں موجود تھیں' سامعین کی توجہ کا مرکز جہاں بھٹو صاحب کی مسحور کن شخصیت اور معلومات اور مزاح سے بھرپور تقریر تھی وہیں بیگم نصرت بھٹو کی پروقار شخصیت بھی تھی' ان دنوں بھٹو صاحب اکثر صوبے کی کسی نہ کسی یونیورسٹی میں طلباء اور اساتذہ کی دعوت پر کسی نہ کسی قومی یا بین الاقوامی ایشو پر لیکچر دینے کے لئے مدعو کیے جاتے' ان تقریبات میں اکثر بھٹو صاحب کے ساتھ بیگم نصرت بھٹو بھی ساتھ ہوتی تھیں' اس میں کوئی شک نہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو جیسے متحرک' ذہین اور مدبر سیاستدان سے شادی بیگم نصرت بھٹو کی زندگی میں ایک اہم موڑ تھا مگر اس بات سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ایران کے ثقافتی کلچر سے بھرپور اصفہانی خاندان اور ایران کے کرد بہادر جنرل صلاح الدین ایوبی کی نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بیگم نصرت بھٹو بھی جرات' ذہانت اور ثقافت

کے ورثے کی مالک تھیں لہٰذا انہوں نے بھٹو صاحب کی ساری گھریلو اور خاندانی ذمہ داریاں خود سنبھال لیں تاکہ بھٹو صاحب اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال اپنے ملک اور عوام کی خاطر کر سکیں۔

مورخ اس بات کی گواہی دے گا کہ جب تک دونوں زندہ رہے دونوں نے اپنے اپنے کردار کو نبھانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی' بھٹو صاحب تو بچپن سے اپنے ملک کی بے لوث خدمت کرنے کا وعدہ کر چکے تھے' یہ وعدہ انہوں نے بچپن میں قائداعظم محمد علی جناح کو لکھے گئے ایک خطے کے ذریعے کیا تھا' یہ بھی حقیقت ہے کہ بھٹو صاحب کی طرف سے اس فرض کی ادائیگی میں بیگم نصرت بھٹو کی معاونت بھی بھرپور انداز میں رہی' لہٰذا ان دونوں نے آخری سانس تک اپنے ملک اور ملک میں جمہوریت اور عوامی راج کی بحالی کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا' یہ بھی ایک عجیب مثال ہے کہ ملک اور عوام کے لئے قربانیاں دینے کی اس روایت میں ان کے چار بچوں نے بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی اور یہ سب ایک ایک کر کے اپنے باپ اور ماں کی راہ پر چلتے ہوئے پاکستان کی تقدیر بدلنے کی خاطر اور عوام و جمہوریت کی خاطر قربان ہوتے گئے' بچوں میں قربانی کا یہ جذبہ پیدا کرنے میں جہاں باپ کے کردار کا تعلق ہے وہاں ان کو ماں کی طرف سے دی گئی تربیت کا بھی اتنا ہی حصہ ہے' یہ حقیقت ہے کہ جب ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان کی کابینہ میں سب سے چھوٹی عمر کے وزیر کی حیثیت میں حلف اٹھایا اور دن رات ملک کی خدمت میں کوشاں ہو گئے تو ان کے چار بچوں بے نظیر بھٹو' میر مرتضٰی بھٹو' شاہنواز بھٹو اور صنم بھٹو کی تربیت اور تعلیم کی ساری ذمہ داری بیگم نصرت بھٹو نے اپنے کاندھوں پر لے لی' اس سارے عرصے میں بیگم نصرت بھٹو ذوالفقار علی بھٹو کے ملکی اور غیر ملکی مہمانوں کی میزبانی کا کردار بھی ادا کرتی رہیں ساتھ ہی بیگم نصرت بھٹو سماجی تقریبات میں بھی بھٹو صاحب کی سرگرمیوں میں ساتھ دیتی رہیں۔

جیسے جیسے پاکستان کی سیاست میں بھٹو صاحب کا کردار وسیع ہوتا گیا اسی طرح بھٹو صاحب کے مداحوں اور ملاقاتیوں کی تعداد میں بھی انتہائی تیزی سے اضافہ ہوتا رہا' ان سب کا

انتہائی مناسب انداز میں خیال رکھنا بھی بیگم نصرت بھٹو کی ذمہ داری تھی' بیگم نصرت بھٹو نے اس ذمہ داری کو بھی انتہائی خوبصورتی سے نبھایا۔ بیگم نصرت بھٹو نے بھٹو صاحب کے مشورے سے اپنے سارے بچوں کی نہ فقط اعلیٰ انداز میں پرورش کی نگران کو امریکہ اور برطانیہ کے اعلیٰ اداروں میں تعلیم دلوائی گئی جس کے نتیجے میں ہر بچہ اپنی جگہ پر جرات' ذہانت اور علم کے حوالے سے انمول موتی ثابت ہوا' بعد میں ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیر خارجہ بنے۔ مورخ اس بات کی بھی گواہی دے گا کہ ذوالفقار علی بھٹو نہ فقط پاکستان مگر دنیا بھر کے انتہائی مدبر اور متحرک وزرائے خارجہ میں شمار ہوئے تھے' وہ اکثر دنیا کے مختلف ملکوں کے طوفانی دورے کرتے رہتے تھے تاکہ مختلف ملکوں کی قیادت سے مل کر مختلف ایشوز پر پاکستان کے موقف سے ان کو آگاہ کر کے ان کا حمایتی بنایا جا سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وزیر خارجہ کی حیثیت سے بھٹو صاحب کے ان طوفانی دوروں میں اکثر بیگم نصرت بھٹو بھی ان کے ساتھ ہوتی تھیں' لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی ڈپلومیسی میں خود بیگم نصرت بھٹو کا بھی حصہ تھا تو غلط نہ تھا۔

عظیم اسلامی جنرل صلاح الدین ایوبی کی نسل سے تعلق کا بین ثبوت بیگم نصرت بھٹو نے اس وقت دیا جب تاشقند میں ہندوستان کی شرائط پر ''تاشقند ڈکلیریشن'' کے نام سے معاہدے پر ایوب خان کی طرف سے دستخط کرنے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کے ایوب خان سے اختلافات پیدا ہو گئے اور اس کی وجہ سے آخرکار بھٹو صاحب کو ایوب خان کی حکومت سے استعفیٰ دینا پڑا اور اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کی خودمختاری' سالمیت کی حفاظت اور ملک میں ''بیسک ڈیموکریسی'' کے نظام کے بجائے حقیقی عوامی جمہوریت بحال کرنے کے لئے ''پاکستان پیپلز پارٹی'' کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت بنائی تو ایوب خان کی آمریت اور اس کی بیوروکریسی نے ایسے کون سے مظالم تھے جو ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے خاندان پر نہ توڑے۔ جمہوریت اور عوام کے حقوق اور کارکنوں کی اس جنگ کا جہاں ذوالفقار علی بھٹو' ان کی پارٹی' ان کے ساتھیوں اور کارکنوں نے انتہائی بہادری سے مقابلہ کیا وہیں بیگم نصرت بھٹو اس ساری جنگ میں بھٹو صاحب کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑی رہیں اور ان کی استقامت اور جرات میں کوئی کمی نہیں

آئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایوب خان نے ذوالفقار علی بھٹو کی صلاحیتوں کی وجہ سے انہیں 1963ء میں پاکستان کا وزیر خارجہ بنایا مگر حقیقت یہ ہے کہ وزیر خارجہ بننے سے پہلے ہی وہ پاکستان کے خارجہ امور اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے' اس سے کوئی اختلاف کرے مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ کم سے کم 1959ء سے پاکستان کے ڈی فیکٹو وزیر خارجہ بن چکے تھے' اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ کیا وہ ذوالفقار علی بھٹو نہیں تھے جن سے بات چیت کے کچھ دور کرنے کے بعد سردار سورن سنگھ کو خود پیچھے ہٹنا پڑا یا ہندوستان کی حکومت کو یہ دیکھ کر کہ سورن سنگھ بھٹو صاحب کے آگے کمزور پڑ رہے ہیں ان کو ان مذاکرات سے الگ کر دیا۔

بھٹو صاحب جب تک پاکستان کے وزیر خارجہ رہے انہوں نے اپنے تدبر اور خاص طور پر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل میں دنیا کے مختلف ایشوز پر اپنی مدبرانہ تقریریوں اور جذباتی لہجے کے نتیجے میں دنیا بھر میں خود کی قائدانہ صلاحیتوں کو منوالیا۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کی بصیرت تھی جس کی وجہ سے انہوں نے محسوس کیا کہ ایسے وقت میں جب دنیا میں چین الگ تھلگ تھا' اس کے ساتھ سفارتی اور اسٹریٹیجک تعلقات قائم کیے جائیں یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے وہ اکثر چین کے دورے پر رہتے اور وہاں ان کی چین کے چیئرمین ماؤزے تنگ' وزیر اعظم چو این لائی اور وزیر خارجہ مارشل چن ژی سے طویل ملاقاتیں ہوتیں' اس کے نتیجے میں ان کی ماؤزے تنگ' چو این لائی اور مارشل چن ژی سے قربت بڑھتی گئی اور دنیا کو سامراج سے آزاد کرانے کے لئے مشترکہ مشورے ہوتے رہے' بھٹو صاحب کی ان کوششوں کے نتیجے میں ان دنوں چین کے وزیر اعظم چو این لائی پاکستان کے دورے پر آئے اور ایوب خان سے ملاقات کی' چین کے وزیر خارجہ مارشل چن تو اکثر پاکستان کے دورے پر آتے' ان دنوں ذوالفقار علی بھٹو نے امریکہ پر بھی ایک احسان کیا کہ چین کو راضی کیا کہ امریکہ کے وزیر خارجہ ہنری کسنجر ان کے دورے پر آئیں لہٰذا یہ انتظام بھی بھٹو صاحب کی کوششوں سے پاکستان نے کیا کہ کسنجر پاکستان آئے اور یہاں سے چین کے خفیہ دورے پر گئے' بہرحال اس بات پر دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ ذوالفقار علی بھٹو کے پاکستان کے وزیر خارجہ بننے سے پہلے پاکستان کی خارجہ پالیسی کی باگ ڈور امریکہ کے ہاتھ میں ہوتی تھیں' مگر بھٹو صاحب کے وزیر خارجہ بننے کے بعد پاکستان نے دنیا کے

ان رہنماؤں سے راہ و رسم بڑھائے جو دنیا کو کسی بھی طرح سامراج کی غلامی سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے' ان عالمی مدبروں میں خاص طور پر انڈونیشیا کے احمد سویکارنو' مصر کے جمال عبدالناصر' گھانا کے نکرومہ' الجزائر کے بن بیلا' یوگوسلایہ کے مارشل ٹیٹو' ہندوستان کے پنڈت جواہر لعل نہرو اور چلی کے صدر الاندے قابل ذکر تھے' یہ تیسری دنیا کے وہ عالمی مدبر تھے جنہیں دنیا میں نو آبادیاتی نظام اور سامراجیت کے خلاف مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں کافی شہرت حاصل تھی' خوش قسمتی سے وزیر خارجہ بننے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے عالمی سیاست کے منظر پر جو سرگرمیاں کیں اور خاص طور پر مختلف بین الاقوامی ایشوز پر انہوں نے جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل میں جو پر جوش تقریریں کیں ان کے نتیجے میں ان عالمی مدبروں کے ہاں ذوالفقار علی بھٹو کے لئے احترام کے جذبات پیدا ہو گئے' یہ اعزاز ذوالفقار علی بھٹو کا تھا کہ انہوں نے ان رہنماؤں سے متواتر ملاقاتیں کیں اور ان کے قریب ہو گئے' یہاں تک کہ ان میں سے اکثر کئی ایشوز پر بھٹو سے مشورے کرتے تھے' اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ 20 ویں صدی میں جن ملکوں نے آزادی کی جنگ لڑی ان کی حمایت جہاں ان عالمی مدبروں نے کی وہاں ذوالفقار علی بھٹو نے بھی ان کی حمایت کی۔

10 جنوری 1966ء کو تاشقند میں دونوں ملکوں کے درمیان جس معاہدے پر دستخط کیے گئے اس سے ذوالفقار علی بھٹو خوش نہیں تھے کیونکہ اس پانچ نکاتی معاہدے میں کہیں بھی کشمیر کا ذکر نہیں تھا جبکہ جنگ اس ایشو پر ہوئی تھی اور اسی ایشو کی وجہ سے 1947ء سے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات مسلسل کشیدہ رہے' جب دستخط ہو گئے تو ہندوستان کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری اچانک ''پراسرار حالات'' میں انتقال کر گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے کمرے میں جگا کر یہ بتایا گیا کہ سر "Bastord has Died" تو بھٹو صاحب نے برجستہ کہا کہ Which Bastord دیکھا جائے تو ایوب خان اور بھٹو صاحب کے درمیان تعلقات تاشقند میں ہی تناؤ کا شکار ہو گئے تھے تو یہ غلط نہ ہوگا۔

عوامی سیاست کا دور

تاشقند سے واپسی کے بعد صدر ایوب خان اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان تعلقات کشیدہ ہی رہے اور وقت گذرنے کے ساتھ دونوں میں دوری بڑھتی رہی' اس سلسلے میں تواتر سے خبریں ملکی پریس اور بین الاقوامی پریس میں شائع ہونے لگیں اس کشیدہ صورتحال کا ڈراپ سین جون 1966ء میں ہوا جب ذوالفقار علی بھٹو نے وفاقی کابینہ سے استعفیٰ دیا' ابتدائی طور پر اس خبر کو چھپایا گیا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب کی طرف سے استعفیٰ دیدیا ہے اس کے برعکس 18 جون 1966ء کو صدر ایوب نے اعلان کیا کہ چونکہ ذوالفقار علی بھٹو بیمار ہیں لہٰذا وہ لمبی چھٹی پر چلے گئے ہیں مگر یہ بات عوام سے چھپی نہیں رہ سکی اس کا مبینہ ثبوت یہ ہے کہ ایوب کی کابینہ سے مستعفی ہونے کے بعد جب ذوالفقار علی بھٹو 22 جون کو ٹرین کے ذریعے راولپنڈی سے لاہور روانہ ہو گئے تو راستے میں ہر اسٹیشن پر ہزاروں لوگ بھٹو صاحب کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے تھے کچھ ایسے اسٹیشن جہاں ٹرین کھڑی نہیں ہوتی تھی وہاں بھی سینکڑوں لوگ ریلوے لائن پر جمع ہو گئے لہٰذا ان اسٹیشنوں پر ٹرین کو روکنا پڑا اور لوگوں نے تب تک ٹرین کو آگے بڑھنے نہیں دیا جب تک بھٹو صاحب گیٹ پر آ کر لوگوں کے مجمع کے سامنے ہاتھ لہرا کر ان کے جذبات کا جواب نہ دیتے دوسرے دن جب بھٹو صاحب لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو اسٹیشن پر ایک رپورٹ کے مطابق 70 ہزار لوگوں کا اجتماع اکٹھا ہو چکا تھا' راولپنڈی سے لاہور تک

جہاں جہاں بھٹو صاحب کے استقبال کے لئے لوگ جمع ہوئے وہ بھٹو صاحب کے حق میں اور ایوب خان اور معاہدہ تاشقند کے خلاف فلک شگاف نعرے لگاتے رہے' لاہور ریلوے اسٹیشن پر اتنے بڑے استقبالی عوامی اجتماع کو دیکھ کر اوران کے حق میں عوام کے جذباتی نعرے سن کر بھٹو صاحب بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اوران کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جن کو وہ غیرارادی طور پر اپنے رومال سے صاف کرتے رہے۔ استقبالی ہجوم کے عوام یہ سب نظارے دیکھ رہے تھے بعد میں بھٹو صاحب کا یہ رومال کسی اور کے ہاتھ میں آ گیا اور یہ رومال نیلامی کے ذریعے ایک لاکھ روپے میں فروخت ہوا' پنڈی سے لاہور تک عوام کی طرف سے بھٹو صاحب کا یہ والہانہ استقبال علامت تھی اس بات کی کہ اب سیاست ڈرائنگ روموں سے باہر آ رہی ہے اور راستوں پر' گلیوں میں' کھیتوں اور کھلیانوں میں فیکٹری کے مزدوروں کے پاس آ رہی ہے' اب سیاست آزاد ہوتی ہوئی ایک سمندر کی طرح عوام کی طرف امنڈتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

واضح رہے کہ اس وقت تک سیاست ڈرائنگ روم تک بندھی اور یہ ملک کے نوابوں، سرداروں' پیروں' میروں' وڈیروں' چوہدریوں' سرمایہ داروں اوران کے پالکوں کے قبضے میں تھی مگراب سیاست کا ایک نیا دور شروع ہوگیا تھا جسے عوامی سیاست کا دور کہا جانے لگا حالانکہ اطلاعات کے مطابق اس زبردست عوامی استقبال کے بعد جہاں بھٹو صاحب نے اپنی سیاسی سمت کا تعین کرلیا تھا وہیں انٹیلی جنس ایجنسیوں نے بھٹو صاحب کو خبردار کیا کہ وہ سیاست میں نہ آئیں اورانہیں یہ حکم دیا گیا کہ 1970ء میں ہونے والے صدارتی الیکشن سے خود کو دور رکھیں مگر بھٹو صاحب نے احکامات ماننے سے صاف انکار کردیا اور پہلا کام کیا کہ کنونشن مسلم لیگ جس کے سربراہ ایوب خان تھے سے الگ ہونے کا اعلان کردیا اس مرحلے پر انہوں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ وہ اپنی سیاسی پارٹی بنائیں گے' اس عوامی سیاست کے دور میں بیگم نصرت بھٹو بھی ان کے ساتھ ساتھ تھیں' کچھ معتبر سیاسی مبصرین نے محسوس کیا کہ عظیم مسلم جنرل صلاح الدین ایوبی کی نسل سے ہونے کے ناطے ان کے خون میں اخلاق کی جو بلندی پنہاں تھی اس کا مظاہرہ بیگم

نصرت بھٹو نے کھل کر اس وقت کیا جب تاشقند میں ہندوستان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر ایوب کی حکومت سے الگ ہونے کا فیصلہ ان کے میاں ذوالفقار علی بھٹو نے کر کے پاکستان میں حقیقی تبدیلی لانے اور اقتدار عوام کے ہاتھوں میں دینے کی ابتداء کی ایک بار بھٹو ایوب خان کے خلاف کیا ہوئے فوجی آمر نے ریاستی شکاری کتے بھٹو صاحب پر ہر طرف سے چھوڑ دیئے۔ انہوں نے نہ فقط بھٹو صاحب کو بار بار قید و بند کی صعوبتیں دیں بلکہ انہیں اتنا تنگ کیا گیا جس کی کوئی حد نہیں تھی اس معرکہ میں بھی بیگم بھٹو نے بھٹو صاحب کا پوری طرح ساتھ دیا اور جمہوریت کی جدوجہد کے سلسلے میں بھٹو صاحب نے جو عہد کیا تھا اس کو جاری رکھنے کے سلسلے میں بیگم بھٹو نے بھرپور کردار ادا کیا اس سلسلے میں بیگم بھٹو نے عام لوگوں کو صدیوں سے پڑی ہوئی زنجیریں توڑنے کے سلسلے میں آمریت کے کون سے مظالم ہیں جن سے ہراساں کرنے کے دیگر ریاستی ہتھکنڈوں اور دھمکیوں کا مقابلہ نہیں کیا تاکہ عوام کو آخری فتح تک مارچ کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ درپیش نہ ہو' اسی دوران ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے نئی پارٹی بنانے کا فیصلہ کر لیا اس کے بعد عوام کو متحرک کرنے اور عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے انہوں نے ملک بھر کے دورے کرنے اور مختلف اہم مقامات پر عام جلسے منعقد کرنے کا بھی فیصلہ لیا' اس فیصلے کے تحت انہوں اس سلسلے میں پہلا جلسہ عام گول باغ لاہور میں کرنے کا اعلان کیا' اس اعلان سے ایوبی آمریت اس حد تک گھبرا گئی کہ بھٹو صاحب کو یہ جلسہ کرنے نہیں دیا گیا اور جلسہ ریاستی غنڈوں کے ذریعے منتشر کر دیا گیا مگر بھٹو صاحب پیچھے نہیں ہٹے۔ انہوں نے ملک بھر کے دورے شروع کر دیئے تاکہ وہ جو پارٹی بنا رہے ہیں اس کے لئے عوام کی حمایت حاصل کریں اور ملک بھر سے پارٹی میں کام کرنے کے لئے مناسب ساتھی تلاش کریں۔

بھٹو صاحب کی اس رابطہ عوام تحریک میں ملک بھر کے طلبہ ہراول دستہ تھے' جب انہوں نے اپنا یہ دورہ پشاور سے شروع کیا تو پشاور کے کالج کے طلباء میں بے انتہا جوش پیدا ہوا کہ ریاست کے لئے یہ ناقابل برداشت تھا لہٰذا ان طلباء پر تشدد کیا گیا' لاٹھی چارج کیا گیا اور گولیاں

بھی برسائی گئیں بعد میں راولپنڈی پہنچنے پر وہاں بھی طلباء میں سیاسی جوش وخروش تھا جو پشاور کے طلباء میں تھا یہاں گارڈن کالج راولپنڈی کے طلباء پر تشدد کیا گیا بعد میں یہ لہر لاہور میں بھی شروع ہوئی اس دوران حیدرآباد سے ایک طلباء تنظیم کے عہدیدار کراچی میں 70 کلفٹن میں بھٹو صاحب سے ملے اور انہیں ایک تقریب میں مدعو کیا۔ بھٹو صاحب نے ان کو سمجھایا کہ انہیں بلانے پر ان کو ریاستی مظالم کا مقابلہ کرنا پڑسکتا ہے ان طلباء رہنماؤں میں یوسف لغاری اور کامریڈ جام ساقی شامل تھے جو حیدرآباد اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے صدر اور سیکریٹری تھے اس تقریب میں شرکت کے لئے آمد پر حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر طلباء اور عام لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے ان کا استقبال کرنے والوں میں حیدرآباد شہر کی ایک عوامی شخصیت میر رسول بخش تالپور بھی شامل تھے۔ بعد میں میر رسول بخش تالپور اور ان کے بڑے بھائی میر علی احمد تالپور بھٹو صاحب کی نئی پارٹی میں شامل ہوگئے بعد میں 30 نومبر 1967ء کو لاہور میں ایک بڑا عوامی کنونشن منعقد کیا گیا جس میں پاکستان پیپلز پارٹی بنانے کا رسمی اعلان کیا گیا۔

اس کنونشن میں شرکت کرنے والے مندوبین کی تعداد تقریباً 400 تھی جنہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو پارٹی کا چیئرمین منتخب کیا اس کنونشن میں شرکت کرنے والوں میں جے اے رحیم، عبدالوحید کیٹر، خورشید حسن میر، شیخ محمد رشید، حیات محمد خان، شیرپاؤ، امان اللہ خان، معراج محمد خان، حق نواز گنڈاپور، ڈاکٹر مبشر حسن، بیگم آباد احمد، بیگم شاہین رائے، بیگم انور غالب، ملک حامد سرفراز، غازی ذکاءالدین، کامریڈ غلام احمد، رفیق احمد باجوہ، سید عمر خان، میاں محمد اقبال اور میر حمید حسن شامل تھے۔ مشہور شاعر اسلم گورداسپوری نے اشعار پڑھے۔ اس موقع پر پارٹی کنونشن میں سرخ، کالے اور ہرے رنگوں کے پارٹی پرچم کی منظوری دی گئی اسی دوران سندھ کی ممتاز سیاسی شخصیت مخدوم محمد زمان، طالب المولیٰ نہ فقط پی پی میں شامل ہوئے بلکہ ان کے آبائی گاؤں ہالا میں ان کی میزبانی میں پارٹی کا دوسرا کنونشن ہوا جسے ''ہالا کنونشن'' کہا جاتا ہے۔ اس کنونشن میں پارٹی کے حوالے سے کئی اہم فیصلے کئے گئے ان میں ایک فیصلہ یہ تھا کہ 1970ء میں ہونے والے انتخابات

میں حصہ لیا جائے گا۔ واضح رہے کہ اس وقت پارٹی میں ایک لابی ایسی تھی جو انتخابات میں حصہ لینے کی بجائے ملک میں انقلاب لانے کے حق میں تھی مگر بعد میں کنونشن میں اتفاق رائے سے فیصلہ کیا گیا کہ انتخابات میں حصہ لیا جائے۔ 19 دسمبر 1967ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے کراچی میں اپنی رہائش گاہ پر ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے پارٹی منشور کا اعلان کیا' منشور کی خاص خاص باتیں تھیں۔ اسلام ہمارا دین ہے' جمہوریت ہماری سیاست ہے' سوشلزم ہماری معیشت ہے اور طاقت عوام کے پاس ہے' ملک کے سیاسی نقشے پر پیپلز پارٹی کا نمودار ہونا ایک ایسے ملک میں رجعت پسند قوتوں کے لئے بہت بڑا دھچکا تھا جہاں اب تک ملک کی سیاست پر دائیں بازو کی بالادستی رہی تھی خاص طور پر ''غذا'' گھر اور پوشاک' غریب لوگوں کو فراہم کرنے والے نعرے نے ملک میں سیاست کا محور ''مذہبی سیاست'' سے ''معیشت'' کو منتقل کر دیا۔

پارٹی اور اس کے منشور کا اعلان ہوتے ہی پی پی سارے ملک میں مقبول ہوگئی اور ہر طرف سے بھٹو صاحب کو دعوت دی جا رہی تھی کہ وہاں آ کر جلسہ عام سے خطاب کریں' پارٹی خاص طور پر جوانوں' غریبوں اور متوسط طبقے میں مقبول ہونے لگی' اس مرحلے پر بھٹو صاحب نے ملک بھر میں خواتین کو متحرک کرنے کے لئے پیپلز پارٹی میں ''وویمن ونگ'' قائم کیا اور اس کا سربراہ بیگم نصرت بھٹو کو بنایا گیا۔ یہ ذمہ داری ملتے ہی بیگم نصرت بھٹو ملک بھر میں پارٹی کے وویمن ونگ کو منظم کرنے کے لئے رات دن سرگرم ہوگئیں۔ بیگم بھٹو خاص طور پر خواتین کو اختیار دینے میں پختہ یقین رکھتی تھیں اور ساتھ ہی غریب عوام کے لئے ان کی دل میں نرم گوشہ تھا جن میں عمومی طور پر عام لوگ اور خاص طور پر پارٹی کارکن شامل تھے وہ جب پارٹی کے غریب کارکن کی ''جھگی'' یا ''جھونپڑی'' میں داخل ہوتی تھیں تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی تھی اور ان کے درمیان کچھ وقت گذار کر کے ان سے ان کے حالات معلوم کرتی تھیں ملک بھر میں پی پی وویمن ونگ کو منظم کرنے میں خاص طور پر بیگم نادرا خاکوانی' بیگم رقیہ خانم سومرو اور چترال سے

تعلق رکھنے والی بیگم شہزادہ سلیمان نے بھرپور کردار ادا کیا۔اسی دوران ذوالفقار علی بھٹو ملک بھر کے دوروں کے دوران جلسوں کے علاوہ اسٹیشنوں' طالبعلموں کے اجتماعات اور مزدوروں اور ہاریوں کے اجتماعات میں بھی خطاب کرتے رہے۔جس کی وجہ سے ملک بھر میں نچلے حلقوں اور نوجوانوں میں جہاں بھٹو کی حمایت بڑھتی گئی وہاں ایوب خان سے نفرت میں بھی بے پناہ اضافہ ہونے لگا اس لہر کو روکنے کے لئے ایوب خان افسر شاہی بھٹو کے راستے میں مشکلاتیں پیدا کرنے لگی اس سلسلے میں راولپنڈی کے طالبعلموں نے ایوب خان کی حکومت کے خلاف احتجاج کیا کہ 8 نومبر کو راولپنڈی فوج کے حوالے کرنا پڑا اور ایک دن کے بعد 10 نومبر کو ایوب خان ایک نوجوان ہاشم کی طرف سے کئے گئے حملے میں بال بال بچ گئے اس بات کا غصہ ذوالفقار علی بھٹو پر اس طرح نکالا گیا کہ 13 نومبر 1968ء کو ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے ساتھیوں کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کیا گیا اسی دوران مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر ملک معراج خالد نے مغربی پاکستان اسمبلی میں "ضمیر کا بحران" کے نام سے ایک قرارداد پیش کی جسے اسمبلی میں پیش کرنے نہیں دیا گیا اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ملک معراج خالد نے مغربی پاکستان اسمبلی کی ممبر شپ سے استعفیٰ دیدیا۔بعد میں وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے۔

ذوالفقار علی بھٹو اور اس کے دیگر ساتھیوں کو گرفتار کرنے کے خلاف بیگم نصرت بھٹو نے مغربی پاکستان ہائی کورٹ میں اس نظر بندی کو چیلنج کر دیا' کورٹ نے اس پٹیشن کی سماعت کیمپ جیل لاہور میں کرنے کا فیصلہ کیا۔مغربی پاکستان ہائی کورٹ کی اسپیشل بینچ نے بھٹو کے مقدمے کی سماعت کی اور بعد میں یہ سماعت 23 جنوری 1969ء تک ملتوی کر دی اس پر بیگم نصرت بھٹو نے بھٹو صاحب کی نظر بندی کو چیلنج کئے جانے والی پٹیشن واپس لے لی مگر کورٹ نے رولنگ دی کہ پٹیشن آئین کے آرٹیکل 198 کے تحت داخل کی گئی ہے بعد میں عدالت نے بھٹو صاحب کو لاڑکانہ منتقل کرنے اور انہیں گھر پر نظر بند کرنے کا حکم صادر کیا۔13 فروری 1969ء کو پی پی سندھ زون کے صدر عبدالوحید کیٹر نے اعلان کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو 14 فروری سے ہنگامی حالات کے

خلاف بھوک ہڑتال کرینگے۔ اسی دن پی پی نے ایک ''سیکورٹی ونگ'' قائم کیا جسے پیپلز گارڈ کہا گیا' 14 فروری کو ذوالفقار علی بھٹو' غلام مصطفیٰ کھر' ڈاکٹر مبشر حسن' عبدالوحید کیٹر' نثار محمد خان اور شاکر علی جونیجو نے ایمرجنسی کے خلاف بھوک ہڑتال شروع کردی، ایوب حکومت نے دباؤ میں آ کر فوری طور پر ڈیفنس آف پاکستان رولز واپس لینے کا اعلان کیا۔ بھٹو صاحب کو رہا کردیا گیا اور ساتھ ہی ایوب حکومت نے سیاستدانوں کو مذاکرات کی دعوت دی یہ بھٹو صاحب اور پی پی کی جمہوریت کے حوالے سے پہلی بڑی کامیابی تھی' اسی دوران صدر ایوب خان نے اپنی حکومت بچانے کے لئے گول میز کانفرنس طلب کی مگر ذوالفقار علی بھٹو' ایئر مارشل اصغر خان' مولانا بھاشانی' جنرل (ر) اعظم خان اور مشرقی پاکستان سے جسٹس مرشد نے گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے سلسلے میں ایوب خان کی دعوت مسترد کردی۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی عظیم الشان تحریک کے نتیجے میں ایوبی آمریت کا خاتمہ ہوا اور ان کے بعد اقتدار میں آنے والے صدر جنرل یحییٰ خان نے 1970ء میں انتخابات کا اعلان کردیا اب بھٹو صاحب کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ مشرقی پاکستان میں انتخابی مہم کے لئے وقت نکال سکیں اگر وہ ایسا کرتے تو نہ مغربی پاکستان کو مناسب وقت دے سکتے اور نہ مشرقی پاکستان کے لئے وقت نکال سکتے۔

نیپ بھاشانی کے اہم رہنما مسیح الرحمان بھٹو صاحب کے ذاتی دوست تھے اندرونی حلقوں کے مطابق نیپ بھاشانی اور پی پی کے درمیان یہ اتفاق ہوا تھا کہ پی پی انتخابی مہم مغربی پاکستان میں چلائے جبکہ مشرقی پاکستان میں نیپ بھاشانی انتخابات لڑے اور انتخابات کے بعد دونوں پارٹیاں پاکستان میں ایک اتحادی حکومت بنا سکیں مگر یہ سب کچھ نہیں ہوسکا اس مرحلے پر مشرقی پاکستان میں ایک خطرناک طوفان آیا جس کے اثرات سارے مشرقی پاکستان پر پڑے۔ نیپ بھاشانی نے مطالبہ کیا کہ طوفان کی وجہ سے انتخابات فی الحال ملتوی کئے جائیں جبکہ شیخ مجیب الرحمان نے انتخابات ملتوی کرنے کی شدید مخالفت کی۔ حکومت نے انتخابات

ملتوی کر دیئے اس فیصلے کے خلاف عوامی لیگ نے ایک بڑی مہم چلائی اور اس فیصلے کو جمہوریت اور خاص طور پر مشرقی پاکستان کے خلاف قرار دیا۔ مشرقی پاکستان کے عوام نے عوامی لیگ کے مطالبہ سے اتفاق کیا اور سارے مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اس حد تک عوام میں مقبول ہوگئی کہ یہ سب کو نظر آنے لگا تھا کہ مشرقی پاکستان کے انتخابات میں عوامی لیگ سارے ملک سے شاید سب نشستیں جیت لے۔ مغربی پاکستان میں جہاں پیپلز پارٹی پنجاب اور سندھ میں سب سے آگے تھی وہیں خیبر پختونخواہ اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی جس کے رہنماؤں میں خان عبدالولی خان اور بلوچستان میں میر غوث بخش بزنجو اور سردار عطاء اللہ مینگل کا ایک مضبوط بیس تھا کی کامیابی کے امکانات نظر آ رہے تھے۔

مغربی پاکستان میں جہاں ذوالفقار علی بھٹو بڑے بڑے عوامی جلسوں سے خطاب کر رہے تھے وہاں خاص طور پر پنجاب اور سندھ میں بیگم نصرت بھٹو خواتین کے بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب کر کے بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی کے لئے وسیع پیمانے پر میدان ہموار کر رہی تھیں۔ عام انتخابات 7 دسمبر 1970ء کو ہوئے ملک بھر میں یعنی مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کی 300 نشستیں تھیں، مشرقی پاکستان سے عوامی لیگ 138 نشستوں پر کامیاب ہوئی جبکہ مغربی پاکستان میں پی پی 82 نشستوں پر کامیاب ہوگئی مگر دلچسپ بات یہ ہوئی کہ نہ عوامی لیگ مغربی پاکستان سے ایک نشست پر بھی کامیاب ہوسکی اور نہ پی پی مشرقی پاکستان سے ایک نشست پر کامیاب ہوسکی۔ اگر صدر جنرل یحییٰ خان اور شیخ مجیب الرحمان ملک کی سالمیت کے دائرے میں رہتے ہوئے صوبائی خودمختاری پر معاہدہ کر لیتے تو 120 دنوں میں نیا آئین بنانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی بلکہ وطن عزیز میں ایک نئے عہد کا آغاز بھی ہوتا اور پھر فوجی جنرلوں کی سازش کے سبب وہ المناک سانحہ ہوا جس نے پاکستان کو دولخت کر دیا۔ بچے کھچے پاکستان میں پیپلز پارٹی نے اقتدار سنبھالا۔

بھٹو صاحب کے ناقدین تنقید کرتے ہیں کہ انہوں نے سویلین ہوکر مارشل لاء

ایڈمنسٹریٹر بننا قبول کیوں کیا؟ ان ناقدین سے پوچھا جائے کہ اس وقت پاکستان ٹوٹ چکا تھا' نہ فقط فوج شکست خوردہ تھی مگر ساری قوم مایوس تھی' یہ اختیارات خود فوج نے بھٹو صاحب کے حوالے کیے کیونکہ کوئی اور آپشن موجود نہیں تھا اگر بھٹو صاحب یہ چیلنج قبول نہ کرتے تو شاید عوام اور تاریخ انہیں معاف نہ کرتی۔ پیپلز پارٹی کے پانچ سالہ دور حکومت پر سیکڑوں کتابیں' لاکھوں صفحات لکھے جا چکے ہیں' بھٹو صاحب کے نادان دوستوں اور روایتی دشمنوں نے کس کس طرح بھٹو صاحب پر کچوکے لگائے اور کس طرح پی پی کو کھوکھلا کیا یہ ایک الگ تاریخی المیہ ہے۔ مارچ 1977ء کے انتخابات کو ایک سازش سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں ان کی حکومت کا جولائی 1977ء میں تختہ الٹا گیا اور پھر بھٹو خاندان کے لئے ایک طویل سیاہ رات کا آغاز ہوا۔

بھٹو صاحب نے ملک بھر میں پارٹی انتخابات کرانے کا بھی فیصلہ کیا اور سب سے پہلے انہوں نے پارٹی کی وویمن ونگ میں انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ یہ اسائنمنٹ دینے کے لئے بھٹو صاحب کی نظر انتخاب اپنی قابل قدر اور ذہین بیوی بیگم نصرت بھٹو پر پڑی جسے پی پی وویمن ونگ کا چیف آرگنائزر بنایا۔ اس سلسلے میں انہوں نے پارٹی کے ایک نوجوان رہنما فخر الزماں کو ہدایات دیں کہ وہ بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ ملیں اور اس مشن کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے بیگم صاحبہ کے سیاسی مشیر کے طور پر کام کریں اس سلسلے میں چیئرمین پی پی کی ہدایات تھیں کہ پی پی وویمن ونگ کو چاروں صوبوں میں نیچے سے اوپر تک منظّم کیا جائے' ان ہدایات کے تحت فخر الزماں نے راولپنڈی آکر وزیراعظم ہاؤس میں بیگم نصرت بھٹو سے ملاقات کی' اس کے بعد اس مشن میں بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ کام کرنے لگے۔ بیگم بھٹو جمہوریت اور جمہوری عمل کو جاری رکھنے کے سلسلے میں اتنی پر عزم تھیں کہ انہوں نے ملک بھر میں ٹاؤن سے تحصیل سطح تک پارٹی کو منظّم کیا۔

لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس میں پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے جو کردار ادا کیا اس سے تو ساری دنیا واقف ہے اور ساری مسلم دنیا بھٹو کے اس کردار کو آج بھی

عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتی ہے مگر اس کانفرنس کے انعقاد میں پاکستان کی خاتون اول بیگم نصرت بھٹو نے بھی ایک انتہائی اہم کردار ادا کیا، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج تک اکثر مبصرین اور محققین بیگم بھٹو کے اس کردار سے ناواقف ہیں اس سلسلے میں پی پی کی اس وقت کی مرکزی خاتون رہنما سیدہ بیگم عابدہ حسین بتاتی ہیں کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر اسلامی ملکوں کے سربراہوں کو ٹھہرائے جانے کے لئے لاہور کی مناسب رہائش گاہوں کا انتخاب بیگم بھٹو نے خود کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس سلسلے میں بیگم صاحبہ ہمارے گھر تشریف لائیں اور میری والدہ کو کہا کہ اگر آپ یہاں لبنان کے وزیراعظم کو ٹھہرائیں اور آپ محسوس نہ کریں تو آپ اس گھر سے کسی اور گھر میں منتقل ہو جائیں۔ والدہ نے کہا کہ میری ہمشیرہ جن کے بیٹے فخر امام سے میری بیٹی عابدہ بیاہی ہوئی ہے ان کی کوٹھی اس گھر کے بالمقابل ہے تو فخر امام اور عابدہ بمعہ دو بیٹیوں اور میں اپنی ہمشیرہ کے گھر منتقل ہو جائینگے۔

عابدہ حسین نے بتایا کہ جب کانفرنس کے سارے مہمان لاہور پہنچ گئے تو بیگم بھٹو نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ لیبیا کے سربراہ معمر قذافی کی بیوی اور نائیجیریا کے صدر کی بیگم بھی اپنے شوہروں کے ساتھ آئی ہوئی ہیں ان کے اعزاز میں میں نے گورنر ہاؤس لاہور میں لنچ کا اہتمام کیا ہے۔ عابدہ حسین نے کہا کہ بیگم بھٹو نے ان کو کہا کہ آپ بھی اس لنچ میں شرکت کریں اور میری مدد کریں۔ انہوں نے کہا کہ لنچ کے بعد بیگم بھٹو نے ان سے پوچھا کہ کانفرنس کے بارے میں عوام کے کیا تاثرات ہیں میں نے جواب میں کہا کہ پاکستان کے عوام کو فخر اور ناز ہے کہ یہ کانفرنس ہمارے وطن عزیز میں ہوئی ہے اور قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کی مقبولیت آسمان تک پہنچ گئی ہے یہ سن کر بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں۔ اس مرحلے پر بیگم عابدہ حسین نے بیگم نصرت بھٹو کی عوام اور جمہوریت کے لئے کوششوں کا مختصر ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ 1974ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے پیپلز ورکس پروگرام شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر مبشر حسن اس پروگرام کی قیادت کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں ڈاکٹر مبشر حسن نے بلایا اور کہا کہ تم نے اپنے گاؤں میں عورتوں کی

دستکاری کا جو منصوبہ شروع کیا ہے اس کے بارے میں ہم چاہتے ہیں کہ اس پروگرام کو سارے ملک میں پھیلایا جائے، ہم چاہتے ہیں کہ اس پروگرام کے تحت قائم کیئے گئے انڈسٹریل ہومز سارے ملک میں قائم کیئے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب کچھ بیگم نصرت بھٹو کی قیادت میں ہوگا اور وہ آپ کو پنڈی بلائیں گی۔ چنانچہ بیگم بھٹو کی سیکرٹری کا مجھے فون آیا اور میں یہ منصوبہ تیار کر کے پنڈی گئی بیگم بھٹو نے اس پروگرام پر عملدرآمد کرنے کے لئے ایک چار رکنی کمیٹی قائم کی اس کی چیئرمین وہ خود بنیں اور باقی ارکان میں بیگم عفت حسین میر، بیگم سعدیہ حفیظ پیرزادہ اور میں شامل تھیں۔ بیگم صاحبہ نے مجھے اس کمیٹی کا سیکریٹری بنایا۔ اس میٹنگ میں فیصلہ ہوا کہ ان انڈسٹریل ہومز میں جو ملبوسات تیار کیے جائیں گے ان کے فیشن شو کا اہتمام شاہی قلعہ لاہور میں کیا جائے گا مجھے اس شو کا کنوینر بنایا گیا اس فشن شو کے انعقاد کے لئے بیگم بھٹو لاہور تشریف لائیں۔ بیگم بھٹو نے فیشن شو کا افتتاح کیا اور اس موقع پر تقریر کی جو میں نے لکھی تھی۔ بیگم صاحب نے مجھے شاباش دی کہ میں نے ایک جامع اور اچھی تقریر لکھی تھی اس سے قبل 1973ء میں بیگم بھٹو سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ برائے خواتین کا افتتاح کرنے ہمارے آبائی شہر جھنگ آئیں۔ افتتاح کے بعد بیگم صاحبہ نے استقبال کے دوران جمع عورتوں کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کیا اور تقریر کے بعد عام خواتین میں گھل مل گئیں، اس موقع پر بیگم صاحبہ نے مجھے اور میری والدہ سے کہا کہ میں نے اس سے پہلے خواتین کا اتنا بڑا اجتماع نہیں دیکھا۔ انہوں نے بتایا کہ شاہی قلعہ لاہور کے فیشن شو کے بعد بیگم بھٹو نے اس پروگرام میں دلچسپی جاری رکھی۔

20 اکتوبر 1975ء پی پی حکومت نے مزید مزدور اصلاحات کیں اور مزدوروں کے لئے پنشن اسکیم کا اعلان کیا گیا۔ 20 فروری 1976ء کو فرانس نے پاکستان کو ایٹمی پراسیسنگ پلانٹ فراہم کرنے کے سلسلے میں پاکستان سے معاہدہ کیا اس صورتحال نے امریکہ اور ایسے دیگر ملکوں کو چونکا دیا۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے 1972ء میں پاکستان کے صدر کی حیثیت میں کراچی میں اٹامک انرجی سینٹر کا افتتاح کر چکے تھے مگر اس سے بھی بہت پہلے بھٹو نے پاکستان کے توانائی اور

قدرتی وسائل کے وفاقی وزیر کی حیثیت میں اٹامک انرجی کمیشن قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ علاوہ ازیں کہوٹہ والا پروگرام بھی بھٹو کے دورِ حکومت میں بنا۔ یہ سب باتیں امریکہ کے نظر میں تھیں اسی مرحلے پر ذوالفقار علی بھٹو کو امریکہ کے وزیر خارجہ ہنری کسنگر کا خط ملا جس میں اس پروگرام کے حوالے سے بھٹو کو خطرناک دھمکیاں دی گئیں تھیں۔ بھٹو نے اس خط کا ذکر قومی اسمبلی کے اجلاس میں کیا اور اس کے کچھ اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ بعد میں قومی اسمبلی سے باہر آنے کے بعد بھٹو راجا بازار راولپنڈی پہنچے اور وہاں جمع ہونے والے لوگوں کے اجتماع کے سامنے اس خط کو لہراتے ہوئے کہا کہ ہاتھی کی یادداشت بہت مضبوط ہوتی ہے سچی بات یہ ہے کہ سامراج کے نظروں میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ان کی چارج شٹ کافی لمبی اور اب ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔

29 فروری کو فوج کے سربراہ جنرل ٹکا خان ریٹائر ہوگئے اور ان کی جگہ غیر متوقع طور پر کئی سینئر جنرلوں کو چھوڑ کے جنرل ضیاء الحق کو پاکستان کی فوج کا سربراہ بنایا گیا آج تک جنرل ضیاء الحق کو چیف آف اسٹاف بنانے کے اصل پس منظر پر بہت کم تحقیق کی گئی ہے۔ پارٹی ذرائع کے مطابق بیگم نصرت بھٹو کو جنرل ضیاء الحق کو پاکستان کی فوج کا چیف آف اسٹاف بنانے کا فیصلہ قطعی پسند نہیں آیا' کہا جاتا ہے کہ وہ اکثر بھٹو صاحب سے یہ سوال کرتی تھیں کہ آخر جنرل ضیاء الحق کو ہی چیف آف اسٹاف کیوں بنایا گیا ہے۔ ان کی رائے کے مطابق وہ نہ صرف ایک غیر متاثر کن شخصیت کے مالک تھے مگر انہوں نے کبھی بھی ضیاء الحق کی خوشامد والی عادت کو پسند نہیں کیا اور اسے ہمیشہ اس بات کا خوف رہا کہ اس شخص سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ بیگم بھٹو کے اس خوف سے عندیہ ملتا ہے کہ وہ کس حد تک دوربین نگاہ رکھتی تھیں' ایک دن جب بیگم نصرت بھٹو نے 70 کلفٹن پر ایک پریس سے خطاب کیا' پریس کانفرنس کے بعد جب چند صحافی رہ گئے تو ہم میں سے ایک نے بیگم نصرت بھٹو سے پوچھا کہ آخر بھٹو صاحب نے جنرل ضیاء الحق کو اس عہدے کے لئے کیوں منتخب کیا تو انہوں نے ایک دلچسپ جواب دیا اور کہا کہ جب جنرل ضیاء الحق کو فوج

کا سربراہ بنایا جارہا تھا تو ایک دن اس وقت کے فوج کے سربراہ جنرل ٹکا خان ان سے بھٹو صاحب کی غیر موجودگی میں ملنے آئے اور مجھے کہنے لگے کہ فوج کے سربراہ کے عہدے کے لئے جنرل ضیاء الحق کا انتخاب درست نہیں، وہ بھٹو صاحب کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے مجھے گذارش کی کہ آپ بھٹو صاحب کو قائل کریں کہ وہ جنرل ضیاء کو فوج کا سربراہ نہ بنائیں۔ بعد میں بیگم صاحبہ نے بتایا کہ رات کو جب بھٹو صاحب گھر آئے تو میں نے بھی ان سے یہی سوال کیا جس پر وہ خاصے ناراض ہوئے اور الٹا مجھ سے سوال کیا کہ کیا آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل جیلانی کا مشورہ ہمارے خلاف ہوسکتا ہے۔ اب تک بہت کم لوگوں نے اس بات کے سلسلے میں تحقیق کی ہے کہ آخر بھٹو صاحب کا جنرل جیلانی پر اتنا اعتماد کیوں تھا کہ انہیں جنرل ٹکا خان جیسے وفادار جنرل اور اپنی بیگم کی رائے کو بھی رد کرنا پڑا اس سلسلے میں کئی باتیں کہی جاتی ہیں، ایک تھیوری یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کے بعد فوجی قیادت اقتدار بھٹو کے حوالے کرنے کے لئے تو تیار ہوگئی مگر چونکہ اس وقت فوج کے اکثر جنرلوں کا جھکاؤ دائیں بازو کے سیاستدانوں کی طرف تھا اور انہیں ایک لبرل سیاستدان بھی قبول نہیں تھا لہٰذا بھٹو کے اقتدار سنبھالتے ہی ان کے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں اس سلسلے میں یہ حلقے اس بات کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں کہ 3 مارچ 1972ء کو اس وقت کے فوج کے سربراہ جنرل گل حسن اور ہوائی فوج کے سربراہ ایئر مارشل رحیم کو زبردستی ریٹائر ہونے پر مجبور کیا گیا اور ان کی جگہ جنرل ٹکا خان کو فوج کا سربراہ اور ایئر مارشل ظفر چوہدری کو ہوائی فوج کا سربراہ بنایا گیا مختلف حلقوں میں یہ سوال کافی عرصے تک گردش کرتا رہا کہ جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم جنہوں نے جنرل یحییٰ خان کو مجبور کیا کہ وہ خود مستعفی ہو جائیں اور اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کیا جائے اتنے تھوڑے عرصے کے اندر کیسے بھٹو صاحب کے خلاف ہو سکتے ہیں۔

بہرحال فوج کے نئے سربراہ جنرل ٹکا خان بھی بھٹو صاحب کے ساتھ وفادار رہے، اس حد تک کہ بھٹو صاحب کے اقتدار سے ہٹنے کے بعد وہ خود پی پی میں شامل ہو گئے اور خاصے عرصے

تک پی پی کے سیکریٹری جنرل رہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ 30 مارچ 1973ء کو فوج کے جونیئر افسروں کے ایک گروپ نے سویلین حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی مگر پکڑے گئے ان فوجی افسران پر ایک فوجی عدالت جس کے سربراہ بریگیڈیئر ضیاء الحق تھے نے مقدمہ چلایا اوران کو سزا سنائی گئی یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ سویلین حکومت کا تختہ الٹنے کی یہ سازش کسی حد تک حقیقی تھی کہیں یہ سب کچھ کسی ایسی سازش کا حصہ تو نہیں تھا کہ نہ فقط ضیاء الحق کو بھٹو کے قریب لایا جائے مگر خاص طور پر جنرل جیلانی پر بھٹو کا ناقابل تسخیر اعتماد پیدا کیا جائے؟ شاید تاریخ کو کسی مرحلے پر ان سوالات کے بھی جواب دینے پڑیں۔

دوسری طرف مزدوروں کی پنشن اور گروپ انشورنس میں 25 فیصد کا اضافہ کیا گیا ان اصلاحات نے درحقیقت بھٹو صاحب کے خلاف ایک طرف سرمایہ داروں اور سیٹھوں تو دوسری طرف نوابوں، جاگیرداروں، پیروں، میروں اور وڈیروں کی بھٹو صاحب کے خلاف نفرت کو انتہا تک پہنچا دیا اور اب بھٹو صاحب ان کے لئے ناقابل برداشت تھے، اب یہ طبقے بھٹو صاحب کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار تھے حتیٰ کہ وہ جاگیردار اور وڈیرے جو بھٹو صاحب کے ساتھ تھے ان میں سے بھی کئی اندر سے بھٹو صاحب سے بیزار ہو چکے تھے اور اس وقت کا انتظار کر رہے تھے کہ موقع ملے تو پی پی کو چھوڑ دیں، کہا جاتا ہے کہ بعد میں جب جنرل ضیاء الحق نے بھٹو صاحب کی حکومت کا تختہ الٹ کر انہیں جیل میں ڈال کر ان پر عدالت میں قتل کا مقدمہ شروع کیا اور اس کے خلاف ایک اور سوال یہ بھی اٹھایا جاتا ہے کہ بھٹو صاحب نے قومی اسمبلی ختم کر کے نئے انتخابات آئین میں دی گئی مدت سے ایک سال پہلے کیوں کرائے، جبکہ ان پر ایسا کوئی دباؤ بھی نہیں تھا اس سوال کے بارے میں بھی ابھی تک تحقیق نہیں کی گئی مگر ایک مستحکم رائے یہ تھی کہ فیصلہ بھٹو صاحب نے اس وقت کے آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل جیلانی کے مشورے پر کیا اس رائے کے مطابق امریکہ اور اس کے طفیلی ممالک اور ملک کے اندر موجود وہ طبقے جو بھٹو صاحب کی اصلاحات اور عوام دوست پالیسیوں کا نشانہ بنے تھے ان سب کا مشترکہ

فیصلہ تھا کہ یہ مناسب وقت ہے کہ بھٹو صاحب سے جان چھڑائی جائے امریکہ اور اس کے طفیلی ممالک کے نکتہ نگاہ کے مطابق بھٹو صاحب اب بہت آگے نکل رہے تھے' انہوں نے پاکستان میں ایٹمی پروگرام شروع کر دیا' اسلامی سربراہی کانفرنس کو سامراج کے خلاف کر دیا اور اب وہ تیسری دنیا کی سربراہی کانفرنس کرانے جا رہے تھے یاد رہے کہ اس مرحلے پر تیسری دنیا کے ممالک کے وزرائے خارجہ کانفرنس کرنے کے بارے میں تیسری دنیا کے مختلف ممالک سے صلاح مشورے شروع ہو چکے تھے ان کوششوں کے سرپرست ذوالفقار علی بھٹو تھے دوسری طرف ملک کے سرمایہ دار اور جاگیر دار ڈرے ہوئے تھے کہ اب بھٹو صاحب پتہ نہیں کون سے ایسے قدم اٹھائیں اور ان کے ہاتھ سے سب کچھ نکل جائے۔ بھٹو صاحب کی طرف سے نئے انتخابات کا اعلان ہوتے ہی ملک بھر کی دائیں بازو کی جماعتوں نے پاکستان نیشنل الائنس بنانے کا اعلان کر دیا حیرت تو اس بات پر ہوئی کہ بائیں بازو کی سمجھی جانے والی جماعت اے این پی بھی ''پی این اے'' کے اتحاد میں شامل ہو گئی ایسے لگا کہ یہ جماعتیں یہ اتحاد بنانے کے لئے پہلے سے تیار بیٹھی تھیں اور فقط نئے انتخابات کے اعلان کا انتظار کر رہی تھیں جبکہ اس وقت عام انتخابات کا اعلان انتہائی غیر متوقع تھا۔

انتخابات کے دوران بھٹو صاحب نے ملک بھر کا دورہ کر کے بڑے بڑے عام جلسوں سے خطاب کیا اور بیگم نصرت بھٹو نے مختلف مقامات پر خواتین کے بڑے جلسوں سے خطاب کیا' انتخابی بخار ملک بھر میں عروج پر تھا۔ پی این اے کی پارٹیوں نے ایک دوسرے کی مدد سے ہر جگہ پر پی پی کے امیدواروں کے خلاف اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے' ان انتخابات کے دوران ذوالفقار علی بھٹو لاڑکانہ کی آبائی نشست سے بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے۔ پی این اے نے شور مچایا کہ پی این اے کے مشترکہ امیدوار مولانا جان محمد عباسی جن کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا بھٹو صاحب کے مقابلے میں کھڑا ہونا چاہتے تھے مگر ان کو فارم بھرنے نہیں دیا گیا اور انہیں اغوا کر لیا گیا حالانکہ لاڑکانہ کیا سارا ملک جانتا تھا کہ مولانا جان محمد عباسی بھٹو صاحب کے مقابلے میں

دو فیصد ووٹ بھی نہیں لے سکتے تھے۔ بھٹو صاحب کے بلا مقابلہ منتخب ہونے پر ملک بھر میں اودھم مچایا گیا اور پی این اے نے اسے الیکشن ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ سندھ کے اکثر سیاسی مبصرین آج بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ اگر مولانا جان محمد عباسی کی اغوا کی کہانی درست بھی تھی تو یہ بھٹو صاحب کے خلاف ملکی اور بین الاقوامی سازش کا حصہ تھی۔ پی این اے کے سارے رہنماؤں کا واحد ٹارگٹ ذوالفقار علی بھٹو تھے اور عام جلسوں میں بھٹو صاحب کو بدنام کرنے کے لئے انتہائی غلیظ و ناشائستہ زبان استعمال کی۔ بھٹو صاحب کے خلاف نفرت پھیلانے کے سلسلے میں پی این اے کی تحریک اس وقت عروج پر پہنچی جب تحریک استقلال کے سربراہ نے برنس روڈ کراچی میں ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو صاحب پر سنگین الزامات کی بھرمار کی اور اعلان کیا کہ اگر ہم اقتدار میں آئے تو بھٹو صاحب کو اٹک کے پل پر پھانسی دینگے' اصغر خان کا یہ اعلان بھٹو کو پھانسی دینے کے سلسلے میں پہلے سے تیار کی گئی حکمت عملی کا حصہ تھا۔

7 مارچ 1977ء کو ملک بھر میں عام انتخابات ہوئے جس میں ملک بھر میں قومی اسمبلی کی 154 نشستوں پر پی پی کامیاب ہوئی مگر پی این اے نے انتخابی نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے بعد ہونے والے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا اور 10 مارچ 1977ء کو پی این اے نے ملک بھر میں پی پی حکومت کے خلاف تحریک شروع کر دی۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے پی این اے کو مذاکرات کی دعوت دی' پی این اے حکومت سے مذاکرات کرنے کے لئے تیار ہو گئی' یہ مذاکرات کافی دن جاری رہے آخر کار 4 جولائی کو اطلاع آئی کہ یہ مذاکرات کامیاب ہو گئے ہیں اور بھٹو صاحب ملک بھر میں ایک بار پھر انتخابات کرانے کے لئے تیار ہو گئے ہیں اس دن رات دیر تک یہ مذاکرات چلے تھے لہٰذا دونوں طرف سے طے کیا گیا کہ اب دوسرے دن باقی چھوٹے موٹے نکات طے کر کے معاہدے کا ڈرافٹ تیار کیا جائے گا اور اس پر دونوں پارٹیوں کی طرف سے دستخط کئے جائیں گے مگر دوسرا دن آنے نہیں دیا گیا اور رات کو بھٹو حکومت اور اقتدار جنرل ضیاء الحق نے سنبھالنے کے بعد ملک پر مارشل لگا کے خود چیف مارشل لاء انڈ منسٹریٹر ہو گئے بعد میں پروفیسر غفور نے ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے تسلیم کیا

ہے کہ پی پی اور پی این اے کے مذاکرات کامیاب ہو گئے اسی دوران یہ بھی اطلاعات آئیں کہ ایک جگہ این ڈی پی کے سربراہ سردار شیر باؤ مزاری بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ بیگم نسیم ولی خان بھی بیٹھی ہوئی تھیں جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ پی این اے اور پی پی کے درمیان مذاکرات کامیاب ہو گئے ہیں تو دونوں سیخ پا ہو گئے اور سردار شیر باؤ مزاری نے مبینہ طور پر غصے میں آ کر کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے آخر ہمارے بھی کچھ جنرلوں کے ساتھ رابطے ہیں' جب بھٹو صاحب کی حکومت کا تختہ الٹا گیا اور انہیں گرفتار کر کے مری میں نظر بند کیا گیا اور ملک میں مارشل لاء لگایا گیا تو اس وقت ذوالفقار علی بھٹو نہ فقط اسلامی دنیا کے ترجمان مگر تیسری دنیا کے قائد کی حیثیت سے ابھر رہے تھے۔

ایک اور سیاہ رات

4 اور 5 جولائی 1977ء کی درمیانی رات کو اس وقت پاکستان ایک بار پھر آمریت کے سیاہ دور کی طرف لوٹ گیا جب فوج سارے ملک میں پھیل گئی، وزیراعظم اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیا گیا اور جنرل ضیاء الحق نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت میں اعلان کیا کہ (i) آئین کو معطل کیا گیا ہے۔ (ii) قومی اسمبلی، سینٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو ختم کیا گیا ہے۔ (iii) وزیراعظم، وفاقی وزراء، وفاقی مملکت وزراء، وزیراعظم کے مشیر، قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اسپیکر، سینٹ کے چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین، صوبائی گورنر، وزرائے اعلیٰ اور صوبائی وزراء اپنے عہدوں پر برقرار نہیں رہے۔ (iv) صدر فضل الٰہی چوہدری بدستور صدر کی حیثیت میں اپنے فرائض سرانجام دیتے رہیں گے اور سارا ملک اب مارشل لا کے ماتحت ہے ساتھ ہی جنرل ضیاء نے اعلان کیا کہ انتخابات 90 دنوں کے اندر کرائے جائیں گے، مارشل لا لگنے اور وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری کے ساتھ ہی بیگم نصرت بھٹو اپنی بیٹیوں کے ہمراہ کراچی میں اپنی رہائش گاہ 70 کلفٹن منتقل ہوگئی تھیں اس وقت تک بھٹو صاحب کی بڑی بیٹی بے نظیر بھٹو امریکہ اور لندن میں اعلیٰ تعلیم مکمل کرکے پاکستان واپس لوٹ چکی تھیں اور اپنے والدین کے ساتھ رہ رہی تھیں، ساتھ ہی چھوٹی بیٹی صنم بھٹو بھی اس وقت والدین کے ساتھ تھیں۔ البتہ دونوں بیٹے مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو تعلیم کے سلسلے میں بدستور لندن میں مقیم تھے، مارشل لاء لگتے ہی جنرل ضیاء الحق نے پی این اے

کے الحاق سے مرکز میں ایک نگراں حکومت قائم کی جس کے سربراہ وہ خود تھے اب کھیل کھل چکا تھا' جنرلوں اور پی این اے کے درمیان کیا طے ہوا تھا' پی این اے کی قیادت نے ملک کے اندر اپنی جھوٹی ساکھ کو بچانے کے لئے اعلان کیا کہ انہوں نے جنرل ضیاء سے مطالبہ کیا ہے کہ انتخابات سے پہلے احتساب مکمل کیا جائے۔

کوہ مری میں نظر بندی کے دوران بھٹو صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسلسل اجلاسوں کے دوران مستقبل کی حکمت عملی تیار کر رہے تھے' ایسے مرحلے پر جب مارشل لا نافذ ہونے کے باعث سارا ملک دہشت زدہ ہو گیا تھا کوئی کچھ نہیں بول رہا تھا' اس وقت بیگم نصرت بھٹو جن کا اسلامی دنیا کے ایک انتہائی بہادر جرنیل کی نسل سے تعلق تھا سامنے آئیں اور انہوں نے سپریم کورٹ میں آئینی پٹیشن داخل کر کے جنرل ضیاء کے مارشل لاء کو چیلنج کیا، نصرت بھٹو کی طرف سے یہ تاریخی آئینی پٹیشن داخل کئے جانے کی وجہ سے وہ پاکستان کی قانونی عدالتی اور آئینی تاریخ کا ایک ایسا کردار بن کر ابھریں کہ اسے اب تک یاد کیا جاتا ہے' یہ پٹیشن جو بیگم نصرت بھٹو بمقابلہ چیف آف آرمی اسٹاف' نہ فقط پاکستان مگر دنیا بھر کی عدالتی تاریخ کا ایک اہم باب ہے' پاکستان کے چیف جسٹس' جسٹس یعقوب علی خان نے یہ پٹیشن سماعت کے لئے منظور کر لی' 28 جولائی 1977ء کو مارشل لاء حکومت نے بشمول ذوالفقار علی بھٹو اور دیگر پی پی رہنماؤں کو رہا کرنے سے پہلے جنرل ضیاء الحق نے خاص طور پر مری میں ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی بہرحال دوسرے دن مری سے رہا ہونے کے بعد جب ذوالفقار علی بھٹو اپنے ساتھی رہنماؤں کے ساتھ راولپنڈی پہنچے تو وہاں ہزاروں لوگوں نے بھٹو صاحب کا استقبال کیا' جنرل ضیاء کی حکومت اور پی این اے کی قیادت یہ سوچ بیٹھی تھی کہ اقتدار سے ہٹنے کے بعد اب بھٹو کا سیاسی مستقبل ختم ہو چکا ہے اور وہ یا تو لاڑکانہ میں ایوب کھوڑو کی طرح جا کر خاموشی سے بیٹھ جائینگے یا اسکندر مرزا کی طرح ملک سے باہر چلے جائینگے مگر بھٹو صاحب کا یہ استقبال دیکھ کر مارشل لاء حکومت دہل گئی اور عام انتخابات کرانے کے ایشو پر سنجیدگی سے نظر ثانی کرتی ہوئی پائی

گئی بعد میں بھٹو صاحب ٹرین سے کراچی پہنچنے کے لئے جہاں جہاں سے گزرے وہاں ہزاروں لوگوں کے مجمع نے ان کا استقبال کیا۔

3 ستمبر 1977ء کو بھٹو صاحب کو کراچی میں ان کی رہائش گاہ 70 کلفٹن سے نواب محمد احمد کے جھوٹے کیس میں دوبارہ گرفتار کرلیا گیا۔ اس موقع پر 70 کلفٹن میں بیگم نصرت بھٹو، بے نظیر بھٹو اور صنم بھٹو بھی موجود تھیں۔ دوسرے روز بے نظیر بھٹو نے 70 کلفٹن میں اپنی زندگی کی پہلی پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ اس پریس کانفرنس میں ان کی انگریزی، لب ولہجہ اعتماد اور سیاست پر دسترس سے اس پریس کانفرنس میں موجود کئی سینئر صحافی کافی متاثر ہوئے اور اکثر صحافیوں نے اس مرحلے پر پیشگوئی کی کہ بے نظیر بھٹو پاکستان کے مستقبل کی سیاست کے افق پر ابھرنے والا ایک بے بہا ستارہ ہونگی۔ بے نظیر بھٹو نے بتایا کہ جب بھٹو صاحب آئی بی کے گھیرے میں پہلی منزل سے سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اتر رہے تھے تو اس وقت ان کی شان دیکھنے کے لائق تھی بہرحال لاہور ہائی کورٹ نے اس کیس میں ذوالفقار علی بھٹو کو ضمانت پر رہا کردیا، اسی دوران حکومت کی طرف سے عدلیہ پر ایک انتہائی خطرناک وار ہوا جب چند دنوں کے اندر حکومت نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس، جسٹس یعقوب علی خان کو برطرف کردیا کیونکہ انہوں نے بیگم نصرت بھٹو کی پٹیشن سماعت کے لئے منظور کرلی تھی یہ جنرل ضیاء کی مارشل لاء کا ملک کی عدلیہ پر پہلا حملہ تھا۔

9 اکتوبر 1977ء کو لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے ذوالفقار علی بھٹو کو عدالت کی طرف سے دی گئی ضمانت کو منسوخ کردیا اس طرح چند دنوں کے اندر پاکستان کی عدلیہ پر یہ دوسرا حملہ تھا مگر افسوسناک بات یہ تھی کہ اس بار یہ حملہ کرنے والے کا تعلق خود عدلیہ سے تھا، اس بار بھٹو صاحب کو لاڑکانہ میں اپنی رہائش گاہ المرتضیٰ سے گرفتار کرکے لاہور بھجوایا گیا جہاں انہیں کوٹ لکھپت جیل میں رکھا گیا تاکہ ان پر نواب احمد کے کیس کی سماعت ہوسکے یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ ایک دن لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مولوی

مشتاق حسین نے بھٹو صاحب کو اپنے چیمبر میں بلوا کر وہاں سماعت کی اور اطلاعات کے مطابق انہوں نے ایک بار طیش میں آ کر بھٹو صاحب کو پیپر ویٹ مارنے کی کوشش تھی درحقیقت مولوی مشتاق حسین کو بھٹو سے کافی شکایات تھیں اور اب اسے بھٹو سے بدلہ لینے کا موقع ملا تھا۔ دریں اثناء بھٹو کی گرفتاری اور ان پر ایک جھوٹے کیس کی کاروائی کے خلاف ملک بھر میں پی پی کے کارکنوں اور ہمدردوں نے احتجاج شروع کر دیا' پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے جیل جانے کے بعد فوری طور پر پارٹی کے قائم مقام چیئرمین کی تقرری کی ضرورت تھی' بھٹو صاحب نے جیل کے اندر سے پیغام بھیجا کہ شیخ محمد رشید جو پارٹی کے سینئر وائس چیئرمین تھے کو پارٹی کا قائم مقام چیئرمین مقرر کیا جائے' جب شیخ محمد رشید کو بھٹو صاحب کا یہ پیغام پہنچایا گیا تو انہوں نے بھٹو صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تجویز کیا کہ بیگم نصرت بھٹو کی پارٹی کے لئے غیر معمولی خدمات کی وجہ سے انہیں پارٹی کا قائم مقام چیئرمین بنایا جائے لہٰذا پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا ایک ہنگامی اجلاس بلایا گیا جس میں اتفاق رائے سے بیگم نصرت بھٹو کو پارٹی کا قائم مقام چیئرمین بنایا گیا' اس طرح پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک خاتون کو سیاسی پارٹی کا سربراہ بنایا گیا وہ بھی پی پی جیسی ملک گیر عوامی پارٹی کا سربراہ' بہر حال کئی پارٹی رہنماؤں اور سیاسی مبصرین نے یہ بات نوٹ کی کہ پارٹی کے اس اجلاس میں پارٹی کے دو اہم رہنماؤں مولانا کوثر نیازی اور غلام مصطفیٰ جتوئی نے شرکت نہیں کی۔

یہ بات اس وقت عام تھی کہ دونوں کو اور خاص طور پر مولانا کوثر نیازی کو بیگم نصرت بھٹو کو پارٹی کا چیئرمین بنانے والے پارٹی فیصلے پر سنگین تحفظات تھے اس وقت کی اطلاعات کے مطابق مولانا کوثر نیازی یا خود پارٹی کے قائم مقام چیئرمین بننا چاہتے تھے یا چاہتے تھے کہ غلام مصطفیٰ جتوئی کو پارٹی کا قائم مقام چیئرمین بنایا جائے چونکہ جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگانے کے دن سے 90 دن کے اندر عام انتخابات کا اعلان کیا تھا لہٰذا ملک بھر میں ساری پارٹیوں کی طرف سے زور شور سے انتخابی مہم جاری تھی ان میں پی پی سب سے آگے تھی اور یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ

انتخابات میں پی پی پی بڑے پیمانے پر کامیاب ہوگی۔اس انتخابی مہم کے دوران پی پی کراچی کے نشتر پارک میں ایک بہت بڑا جلسہ عام منعقد کر چکی تھی جس سے خاص طور پر بیگم نصرت بھٹو نے خطاب کیا جسے لوگوں نے بہت پسند کیا اس وقت بھی کوثر نیازی پارٹی کا حصہ تھے اور بیگم نصرت بھٹو سے پہلے انہوں نے جلسہ سے خطاب کیا وہ ایک انتہائی اچھے مقرر تھے اور اس تقریر میں انہوں نے جنرل ضیاء الحق اور پی این اے کی قیادت پر شدید تنقید کی مگر تھوڑے ہی عرصے میں کوثر نیازی کے عزائم کھل کر سامنے آ گئے ایک دن وہ کراچی آئے اور غلام مصطفیٰ جتوئی کی رہائش گاہ پر قیام کیا اس دوران جتوئی اور کوثر نیازی نے جتوئی کی رہائش گاہ پر ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا' اس پریس کانفرنس کی اطلاع صحافیوں کو جتوئی کے بنگلے کے عملے نے دی۔ مولانا کوثر نیازی نے پریس کانفرنس سے خطاب کیا تو جتوئی اس وقت بنگلے میں موجود تھے مگر وہ الگ کمرے میں بیٹھے رہے اور مولانا کوثر نیازی نے اکیلے پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس کے دوران انہوں نے بیگم نصرت بھٹو کو پارٹی کا قائم مقام چیئرمین بنانے والے فیصلے پر سخت تنقید کی اور پارٹی سے الگ ہو کر پی پی کا الگ گروپ ''پروگریسو پیپلز پارٹی'' کے نام سے بنانے کا اعلان کیا مگر ملک بھر سے کسی پارٹی رہنما نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔

دریں اثناء انتخابی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو ملک بھر میں عام جلسوں سے خطاب کر رہی تھیں' فی الحال بیگم نصرت بھٹو نے سندھ میں انتخابی مہم چلانا شروع کی تو بے نظیر بھٹو نے ملتان سے پنجاب میں انتخابی مہم شروع کر کے بڑے بڑے عام جلسوں سے خطاب کرنا شروع کیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے سندھ کے عوام کو متحرک کرنے کے لئے ٹرین کے ذریعے کراچی سے لاڑکانہ' جامشورو اور دادو کا دورہ کیا' کراچی میں کینٹ اسٹیشن سے پی پی کے کارکنوں اور حمایتیوں کی ایک بڑی تعداد نے بیگم بھٹو کو الوداع کیا جبکہ پی پی کارکن کی ایک بڑی تعداد میں بیگم بھٹو کے ساتھ اس ٹرین پر سوار ہو گئے۔ راستے میں ٹھٹھہ اور کوٹری میں عوام کے بڑے اجتماع نے بیگم بھٹو کا استقبال کیا اور بیگم بھٹو نے ان سے خطاب کیا۔ کوٹری سے نکلنے کے

بعد جب بیگم بھٹو کی ٹرین جامشورو پہنچی جہاں ٹرینیں عموماً کھڑی نہیں ہوا کرتیں تو سندھ یونیورسٹی کے طلباء اور ارد گرد کے گاؤں کے لوگ جامشورو اسٹیشن پہنچ گئے اور ٹرین پہنچنے سے پہلے ایک بڑی تعداد ریلوے پٹڑیوں پر سو گئی' لہٰذا ٹرین کے ڈرائیور کو ٹرین وہاں روکنا پڑی عام لوگوں اور خاص طور پر نوجوان طالبعلموں کا جوش خروش دیکھ کر بیگم بھٹو کی آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں' انہوں نے استقبال کرنے والے طلباء اور گاؤں کے لوگوں کو ان کی اس جرات پر سلام پیش کیا اور کہا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ میری حفاظت کرینگے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اگر آپ میرے ساتھ ہیں تو وہ جنرل ضیاء کے مارشل لاء کیا ہمالیہ سے بھی لڑ جائیں گی۔

جامشورو سے روانہ ہونے کے بعد راستے میں دادو' خیر پور ناتھن شاہ کے ریلوے اسٹیشنوں پر عوام کے جم غفیر نے بیگم بھٹو کا جئے بھٹو کے پُر جوش نعروں سے استقبال کیا بعد میں لاڑکانہ پہنچنے پر نہ فقط ریلوے اسٹیشن پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا بلکہ بیگم بھٹو کو ریلوے اسٹیشن سے ایک بڑے جلوس کی شکل میں مختلف راستوں سے گزارتے ہوئے المرتضیٰ پہنچایا گیا' سندھ میں بیگم بھٹو اور پنجاب میں بے نظیر بھٹو کے کامیاب جلسوں اور بہت بڑے جلسوں کی اطلاعات مسلسل مارشل لاء حکومت کو مل رہی تھیں اس سلسلے میں بے نظیر بھٹو 29 ستمبر 1977ء کو ساہیوال پہنچیں یہاں بھی انہوں نے ایک انتہائی بڑے جلسے سے خطاب کیا اور خبردار کیا کہ اگر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو پاکستان کے پانچوں دریا سرخ ہو جائیں گے اس جلسے کے بعد بے نظیر بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا اور گھر میں نظر بند کیا گیا۔ بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو کے جلسوں اور جلوسوں سے جو صورتحال پیدا ہو رہی تھی وہ اب مارشل لاء حکومت کے لئے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی لہٰذا جنرل ضیاء الحق نے انتخابات ملتوی کرنے اور ملک میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی' ایک لحاظ سے یہ بات اس بات کا عندیہ تھی کہ جنرل دو خواتین سے کتنے ڈرے ہوئے ہیں' مارشل لاء حکومت اس حد تک گھبرائی ہوئی تھی کہ آزاد کشمیر میں ہونے والے انتخابات بھی 3 اکتوبر کو ملتوی کر دیئے گئے' دلچسپ بات یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ پی این اے کی قیادت عام

انتخابات ملتوی کرنے اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے کی مخالفت کرتی اور احتجاج کرتی پی این اے کے رہنما وفد کی شکل میں جنرل ضیاء سے ملے اور مطالبہ کیا کہ پی پی پر پابندی عائد کی جائے۔ دریں اثناء لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے روزانہ کی بنیاد پر بھٹو پر قتل کے جھوٹے مقدمے کی کاروائی چلا کر بھٹو کو پھانسی کی سزا سنادی۔ چند دنوں کے اندر عدلیہ پر ایک اور وار اس وقت ہوا جب سپریم کورٹ نے مارشل لاء کو چیلنج کرنے والی بیگم نصرت بھٹو کی پٹیشن رد کردی۔

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق کو یہ اختیار بھی دیدیا کہ وہ آئین میں ترمیم کرسکتے ہیں حالانکہ ایسی استدعا حکومت کی جانب سے پیش کئے گئے جواب دعویٰ میں بھی نہیں کی گئی تھی یہ شاید عدلیہ کی طرف سے جنرلوں کے لئے خاص تحفہ تھا۔ مگر یہ نہ سوچا گیا کہ پاکستان اور دنیا کی عدلیہ کی تاریخ میں ہماری اعلیٰ عدلیہ کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی۔؟ بھٹو کو پھانسی کی سزا دینے کے خلاف ملک بھر میں پی پی کارکنوں اور نوجوانوں نے احتجاجی مظاہرے شروع کردیئے اس وجہ سے ملک بھر میں عام معمول کی زندگی کافی متاثر ہونے لگی اسی دوران پنجاب کے بڑے شہروں خاص طور پر لاہور اور اسلام آباد میں بھی پی پی کارکنوں اور حمایتیوں نے احتجاج شروع کردیا ان مظاہروں پر طاقت استعمال کی گئی اور درجنوں پی پی کارکنوں کو گرفتار کرکے انہیں فوجی عدالتوں سے سزائیں دلوائی گئیں' پی پی کی مرکزی انتظامی کمیٹی کا اجلاس بیگم نصرت بھٹو کی صدارت میں 13 نومبر 1977ء کو ہوا جس نے ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا کہ انتخابات دسمبر تک کرائے جائیں پھر 30 نومبر 1977ء کو پارٹی کی 10 ویں سالگرہ کے موقع پر پی پی کی مجلس عاملہ کا اجلاس بیگم نصرت بھٹو کی صدارت میں ہوا اس اجلاس میں پارٹی نے بھٹو صاحب کی رہائی اور جمہوریت کی بحالی کے لئے جدوجہد کرنے کا عزم اظہار کیا۔

یکم دسمبر 1977ء کو پی این اے کے رہنماؤں نے جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کی

جس میں جنرل نے ان کو بتایا کہ وہ احتساب مکمل ہونے کے بعد انتخابات مئی یا جون 1978ء میں کرائینگے اب لوگوں کو جنرل ضیاء کے اعلانات پر کوئی یقین نہیں رہا تھا کیوں کہ انہوں نے کعبۃ اللہ شریف میں یقین دلایا تھا کہ وہ حسب اعلان انتخابات مارشل لاء لگنے کے بعد 90 دنوں میں کرائینگے۔ گلیوں، کوچوں میں عام لوگ کہتے سنے گئے کہ جس آدمی نے کعبۃ اللہ شریف میں کئے گئے وعدہ کا پاس نہیں رکھا اس کے کس وعدہ پر یقین کیا جا سکتا ہے مگر پی این اے کی قیادت کو جنرل ضیاء کے اس نئے وعدے پر بھی یقین تھا واضح رہے کہ اس اتحاد میں جہاں بائیں بازو کی پارٹی ہونے کی دعویدار اے این پی شامل تھی وہیں جماعت اسلامی جو اسلام کے اصولوں پر عملدرآمد کی چیمپئن بنتی تھی وہ بھی شامل تھی۔ 8 دسمبر 1977ء کو عدلیہ نے عوام کے اعتماد کو ایک اور ٹھیس پہنچائی جب مولوی مشتاق حسین کو لاہور ہائی کورٹ کا قائم مقام چیف جسٹس اور چیف الیکشن کمشنر بنانے کے خلاف سپریم کورٹ میں ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے داخل کی گئی پٹیشن کو بھی رد کر دیا گیا۔

16 دسمبر 1977ء کو لاہور میں جو واقعہ ہوا وہ بھی پاکستان کے اس سیاہ دور کا ایک انتہائی المناک واقعہ تھا اس دن لاہور کے قذافی اسٹیڈیم میں انگلینڈ اور پاکستان کی کرکٹ ٹیموں کے درمیان میچ ہو رہا تھا، بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو بھی ان دنوں بھٹو صاحب کی لاہور جیل میں قید ہونے اور ان کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں قتل کے جھوٹے مقدمہ کی کاروائی جاری رہنے کے باعث لاہور میں ہی رہائش پذیر تھیں اس دن دونوں ماں بیٹی یہ کرکٹ میچ دیکھنے کے لئے قذافی اسٹیڈیم پہنچ گئیں۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو پر نظر پڑتے ہی اور ان کے آنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے کے نتیجے میں کرکٹ میچ دیکھنے کے لئے آئے ہوئے ہزاروں تماشائی میچ کو چھوڑ کر بیگم بھٹو کے گرد جمع ہو گئے اور جئے بھٹو کے فلک شگاف نعرے لگانے لگے۔ بیگم بھٹو بھی فرط جذبات میں کھڑی ہو گئیں اور ہاتھ اور مکہ لہراتے ہوئے پرجوش کارکنوں کے نعروں کا جواب دینے لگی وہاں موجود انتظامیہ اور پولیس سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا، سینکڑوں پولیس

والے نعرے لگانے اور نعروں پر رقص کرنے والے کارکنوں پر بے رحمانہ طور پر لاٹھیاں برسانے لگے یہاں تک انہوں نے بیگم نصرت بھٹو کو بھی نہیں بخشا' بیگم صاحب پر چاروں طرف سے لاٹھیاں برسائی گئی جس کے نتیجے میں ان کا چہرہ لہولہان ہو گیا اور شدید زخمی ہو گئیں' پارٹی کارکن انہیں گاڑی میں لا کر نزدیک اسپتال لے آئے جہاں انہیں علاج کے لئے داخل کیا گیا چونکہ اکثر لاٹھیاں بیگم بھٹو کے سر اور چہرے پر پڑی تھیں لہٰذا اکثر ڈاکٹروں کی پختہ رائے ہے کہ اس لاٹھی چارج کے نتیجے میں ان کے سر پر آنے والا ایک شدید زخم آخر کار ان کے انتقال کا ایک سبب ضرور تھا۔

17 دسمبر 1977ء کو بھٹو کے خلاف مقدمہ کی سماعت کرنے والے بینچ نے بھٹو کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتے ہوئے ان پر الزام لگایا کہ عدالت میں ان کا رویہ درست نہیں لہٰذا وہ عدالت کے کمرے سے باہر نکل جائیں اس طرح انہیں عدالت کے کمرے سے باہر نکال دیا گیا' 5 جنوری ذوالفقار علی بھٹو کا جنم دن ہے ملک کے مزدوروں نے اس بار اس دن کو ''یوم جمہوریہ'' قرار دیکر ملک بھر میں جلسے کرنے اور ریلیاں نکالنے کا پروگرام بنایا۔ اس سلسلے میں ملتان کی ایک ٹیکسٹائل مل میں ہزاروں مزدور جمع ہو گئے اور جمہوریت کے حق میں نعرے لگائے گئے' مارشل لاء حکومت سے یہ برداشت نہیں ہوا' ان مزدوروں پر پولیس نے اندھا دھند گولیاں چلائیں جس میں ایک اندازے کے مطابق 200 سے 300 مزدور شہید ہوئے۔ علاوہ ازیں ملک بھر میں 4 جنوری کو بڑی تعداد میں پی پی کارکنوں کو گرفتار کیا گیا' اس کے باوجود 5 جنوری کو پی پی نے ''یوم جمہوریہ'' کے طور پر ملک بھر میں شاندار انداز میں منایا۔ 10 جنوری سے بھٹو نے عدالتی کاروائی کا بائیکاٹ کر دیا' 24 جنوری کو بھٹو کو عدالت میں پیش کیا گیا مگر بھٹو نے اپنا دفاع کرنے سے انکار کر دیا اور اعلان کیا کہ انہوں نے اپنے وکلا کو بھی برخاست کر دیا ہے بہرحال 25 جنوری کو بھٹو کا بیان ''بند کمرے'' میں ریکارڈ کیا گیا جبکہ اس سے پہلے بھٹو کے مقدمہ کی کاروائی کھلی عدالت میں چلتی تھی' 2 فروری 1978ء کو جسٹس شفیع الرحمان کی عدالت میں بھٹو کے خلاف

بدعنوانی کے 5 مقدمات دائر کئے گئے۔ علاوہ ازیں بشمول بیگم نصرت بھٹو' پی پی کے سابق ایم این ایز کے خلاف ٹریبونل میں 89 ریفرنس داخل کئے گئے' اس طرح بھٹو' بیگم بھٹو اور پی پی رہنماؤں کے خلاف مارشل لاء حکومت کی انتقامی کاروائیوں میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا' 14 فروری 1978ء کو بے نظیر بھٹو کو رہا کیا گیا اور انہوں نے رہا ہوتے ہی سندھ صوبے کا دورہ شروع کر دیا' اس دورے میں جب وہ نوابشاہ میں جلسہ عام سے خطاب کرنے کے لئے وہاں پہنچیں تو انہیں جلسہ عام سے خطاب کرنے سے روک دیا گیا' اس مرحلے پر عام انتخابات کرانے کے سلسلے میں جنرل ضیاء ایک اور بار پھر اپنے وعدے سے مکر گئے اور انہوں نے 22 فروری 1978ء کو اعلان کیا کہ ان کی حکومت عام انتخابات اس وقت کرائے گی جب ''مثبت'' نتائج کا یقین ہو جائے گا۔

9 مارچ 1978ء کو ایک بار پھر ملک بھر میں بڑے پیمانے پر پی پی کارکنوں کی گرفتاریاں کی گئیں اور کہا گیا کہ نواب محمد احمد خان کے مقدمے میں عدالت کا فیصلہ آنے کی صورت میں ملک میں امن وامان قائم کرنے کے لئے یہ گرفتاریاں کی گئی ہیں' 12 مارچ 1978ء کو بیگم نصرت بھٹو کو ایک بار پھر نظر بند کیا گیا' 18 مارچ 1978ء کو جسٹس مولوی مشتاق حسین کی سربراہی میں لاہور ہائی کورٹ کی بینچ نے ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت کی سزا سنائی' اس بات کے باوجود کہ ملک بھر میں بڑے پیمانے پر پی پی کارکنوں کو گرفتار کیا گیا سارے ملک میں جگہ جگہ پی پی کارکنوں اور ہمدردوں نے احتجاجی مظاہرے کئے اور راستوں کو بلاک کیا' 29 مارچ 1978ء کو بھٹو نے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل داخل کی' 29 مارچ کو جنرل ضیاء نے ملک میں سیاسی سرگرمیوں پر غیر معینہ مدت تک پابندی عائد کر دی۔ دریں اثناء یکم اپریل 1978ء سے سپریم کورٹ نے ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل کی سماعت شروع کر دی' بھٹو کے جیل میں جانے اور ان کے خلاف مقدمہ کی کاروائی شروع ہونے کے بعد بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کی صعبتوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا' دونوں ماں بیٹی ایک طرف پہلے مقدمہ کے سلسلے میں لاہور میں

رہنے لگیں تا کہ مقدمے کے سلسلے میں وکیلوں اور کوٹ لکھپت جیل میں قید بھٹو کے درمیان رابطے کا کردار ادا کریں ساتھ ہی دونوں ملک بھر میں عوام اور پی پی کارکنوں اور حمایتیوں کو متحرک کرنے کے لئے وقت بہ وقت ملک کے کسی نہ کسی حصے کا دورہ کر کے عام جلسے بھی کرتیں' جلوسوں کی بھی قیادت کرتیں تو مختلف علاقوں کے پی پی کارکنوں سے ملاقاتیں کرتیں کہ ان کے حوصلے بلند کریں۔ جنگ کے اس حصے کی جرنیل بیگم نصرت بھٹو تھیں جبکہ ان کے معاون کا کردار محترمہ بے نظیر بھٹو کرتی رہیں بعد میں جب بھٹو کی اپیل کی سماعت اسلام آباد میں شروع ہوئی اور اس سلسلے میں بھٹو کو راولپنڈی منتقل کر کے راولپنڈی کی جیل میں قید کیا گیا تو دونوں ماں بیٹی کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ بھی پنڈی منتقل ہو جائیں یہاں ان کے لئے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ وہ کہاں رہیں یہ بات قابل غور ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو ایک لمبے عرصے تک ایوب خان کی کابینہ میں مختلف وزارتوں کے انچارج رہے اور بعد میں پاکستان چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر صدر اور وزیر اعظم بننے کے دوران وہ اسلام آباد میں اپنے خاندان کے لئے کوئی ذاتی رہائش گاہ نہ خرید سکے' بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو نے کوشش کی کہ انہیں رہائش کے لئے پنڈی یا اسلام آباد میں کرائے پر جگہ مل جائے' ایسا لگتا تھا کہ جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے اپنی بیوروکریسی کے ذریعے سب کو تنبیہ کر دی تھی کہ بیگم نصرت بھٹو کو رہائش کے لئے کوئی جگہ کرائے پر فراہم نہ کی جائے۔

اس سلسلے میں پنڈی' اسلام آباد کی ممتاز ایڈووکیٹ مسز آمنہ پراچا جو پی پی کی ایک پرانی اور انتہائی وفادار کارکن تھیں بتاتی ہیں کہ انہوں نے اور ڈاکٹر ظفر نیازی کے خاندان نے اس سلسلے میں بہت کوشش کی، کامیابی نہیں ہوئی اس کے بعد ڈاکٹر ظفر نیازی نے اپنے کسی عزیز سے بیگم نصرت بھٹو کی رہائش کے لئے اہتمام کیا جہاں بعد میں وہ اور بے نظیر بھٹو رہائش پذیر ہوئیں اسی دوران سپریم کورٹ کے جج' جسٹس قیصر خان جو ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل کی سماعت کر رہے تھے' اسے من مانے طریقے سے ریٹائرڈ کر دیا گیا' اس طرح ایک طرف جنرل ضیاء کی حکومت بھٹو حکومت کے خلاف گھڑے ہوئے جھوٹ کے پلندے پر مشتمل ایک کے بعد دوسرا نام نہاد

''وائٹ پیپر'' شائع کر رہی تھی تا کہ رائے عامہ کو بھٹو کے خلاف متنفر کر سکے تو دوسری طرف عدلیہ کے خلاف اس قسم کی کاروائیاں کر کے خود بخود اپنی حکومت کے خلاف بلیک پیپر تیار کر رہی تھی' 14 ستمبر کو صدر فضل الٰہی چوہدری نے صدارت سے استعفیٰ دیدیا اوران کی جگہ جنرل ضیاء الحق ملک کے صدر بن گئے یہ بھی پاکستان کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار جنرل ضیاء الحق نے فوجی یونیفارم میں صدر کا حلف اٹھایا۔

اس موقع پر سابق صدر فضل الٰہی چوہدری نے ایک انٹرویو میں کہا کہ انہوں نے صدارت سے اس وجہ سے استعفیٰ دیا کہ وہ آئین میں کی جانے والی ترمیم والے منصوبے میں پارٹی نہیں بننا چاہتے تھے دوئم انہوں نے کہا کہ جنرل ضیاء انتخابات کرانے میں مخلص نہیں تھے' بھٹو کی گرفتاری کے خلاف یکم اکتوبر کو ملک بھر میں بڑے پیمانے پر احتجاج شروع ہوگیا' اس احتجاج میں طلباء خاص طور پر آگے آگے تھے' سندھ میں یونیورسٹیاں اور کالج بند ہونے لگے مگر اس احتجاج میں پنجاب کے جیالوں نے ایک نئی تاریخ مرتب کی' لاہور' فیصل آباد اور گوجرانوالہ میں پارٹی کارکنوں نے بھٹو کو آزاد کرنے کے لئے خود کو آگ لگا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی جن کارکنوں نے خود کو آگ لگائی ان میں سے پانچ کارکن جن میں پرویز یعقوب شامل تھے وہ جسم کا کافی حصہ جلنے کی وجہ سے زندہ نہ رہ سکے اور انتقال کر گئے' شاید یہ نہ فقط پاکستان مگر دنیا کی سیاست میں اس قسم کا پہلا واقعہ تھا کہ پارٹی کارکن نے اپنے قائد کی زندگی بچانے کے لئے اپنی جان دیدی' 14 اکتوبر 1978ء کو پنجاب کے دورے کے دوران بے نظیر بھٹو کو گرفتار کرلیا گیا اور انہیں نظر بند کر دیا گیا' اس موقع پر درجنوں پارٹی رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا پیپلز پارٹی نے جمہوریت کی بحالی اور بھٹو کی رہائی کے لئے ملک بھر میں تحریک شروع کر دی اس مرحلے پر پارٹی کارکنوں نے گرفتاری پیش کرنے کی تحریک بھی شروع کر دی' 18 نومبر 1978ء کو عدالت نے بیگم نصرت بھٹو کی نظر بندی ختم کر کے انہیں رہا کرنے کا حکم جاری کر دیا' یکم دسمبر 1978ء کو بیگم نصرت بھٹو نے راولپنڈی جیل میں ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی' بعد میں اعلان

کیا کہ بھٹو صاحب کو یقین ہے کہ جنرل ضیاء الحق کی حکومت انہیں پھانسی دیدے گی اور انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ اگر سپریم کورٹ نے اس فیصلے کو برقرار رکھا تو وہ رحم کی درخواست نہیں کرینگے' اس طرح انہوں نے ٹھوس الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اپنی جان دیدینگے مگر کسی طور پر بھی جنرل شاہی کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکیں گے۔

اسی دوران بیگم نصرت بھٹو نے 70 کلفٹن کراچی میں ایک پرہجوم پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ان ہی باتوں کو دہرایا اور خبردار کیا کہ اگر بھٹو کو پھانسی دیدی گئی تو شاید آئندہ کافی عرصے تک کوئی سویلین ملک کی قیادت کرنے کے لئے آگے نہ آسکے۔ پریس کانفرنس ختم ہونے کے بعد جب اکثر صحافی چلے گئے اور بیگم صاحبہ کے پاس فقط چند صحافی رہ گئے تو ایک صحافی نے کوئی ایسی بات کی جس کے ردعمل میں بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے' صحافیوں کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے بیگم بھٹو کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ انہوں نے کہا کہ بھٹو نے ان کو تاکید کی ہے کہ اگر انہیں پھانسی ہو جائے تو لوگوں کی موجودگی میں ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے چاہئیں' یہ کہہ کر وہ روہانسے انداز میں بولیں کہ اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا ہے تو کیا آنسو روکنا ان کے بس میں ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ان کے شوہر کے ساتھ یہ سلوک کیا جارہا ہے' ان کی بیٹی نظر بند ہے اور میرے دو بیٹے جمہوریت کی بحالی کی خاطر اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں' آخر میں ایک بیوی بھی ہوں تو ایک ماں بھی ہوں جب کسی کے خاندان کے ساتھ یہ سلوک کیا جارہا ہو تو اس کے جذبات کی کیا نوعیت ہوسکتی ہے؟ اسی دوران کراچی کے کچھ صحافیوں کی پی پی کے ممتاز رہنما ممتاز بھٹو سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات ہوئی تو ان کا کہنا تھا کہ وہ بھٹو صاحب کو بچپن سے جانتے ہیں وہ جان دیدیں گے مگر رحم کی درخواست نہیں کرینگے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پٹیشن کی سماعت کرنے والی سپریم کورٹ کے فل بینچ سے اچانک اس کے ایک ممبر جسٹس وحید الدین احمد کو ''بیماری'' کے بہانے ڈراپ کردیا گیا اس وقت ملک بھر میں یہ مستحکم رائے قائم ہوگئی تھی کہ بشمول جسٹس وحیدالدین احمد کے جن ججوں کو اس بینچ سے الگ کیا گیا ہے وہ بھٹو صاحب کو

ان الزامات سے بری کر کے رہا کرنا چاہتے تھے' اب اس فل بینچ میں سات جج رہ گئے تھے۔

بھٹو صاحب کے سینئر وکیل یحییٰ بختیار نے نئے بینچ کی تشکیل کو چیلنج کیا مگر عدالت نے ان کی یہ درخواست رد کر دی' بعد میں 18 سے 21 دسمبر تک بھٹو صاحب نے عدالت سے خطاب کیا اور تفصیل سے اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ وہ بے قصور ہیں اور ان کو نواب محمد احمد قصوری کے قتل کے بارے میں کوئی علم نہیں' ان تین دنوں کے دوران بھٹو صاحب نے عدالت سے جو خطاب کیا وہ نہ فقط پاکستان مگر شاید دنیا بھر کی عدالتی تاریخ میں سنگ میل تھا' اسلام آباد کے کچھ سینئر صحافیوں کا کہنا تھا کہ جن لوگوں نے ان تین دنوں کے دوران بھٹو صاحب کا خطاب نہیں سنا وہ سمجھ لیں کہ اپنی زندگی میں نہ کچھ دیکھا نہ سنا۔ ان صحافیوں کے مطابق بھٹو جب پہلے روز عدالت سے خطاب کرنے کے لئے عدالت میں آئے تو انہیں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا' انہوں نے کہا کہ بھٹو صاحب انتہائی نحیف اور کمزور ہو چکے تھے حالانکہ اس دن وہ فل سوٹ پہن کر آئے تھے مگر ایسے لگ رہا تھا کہ کوٹ پینٹ لکڑیوں پر ٹانگے گئے تھے بقول ان کے خطاب کے دوران کئی بار بھٹو کی سانس اکھڑنے لگی اور ان کو کٹہرے کے چبوترے کا سہارا لینا پڑا مگر ان کا خطاب زبردست تھا اور انہوں نے اپنا کیس انتہائی پر اثر انداز میں پیش کیا بہر حال انہوں نے کہا کہ دوسرے دن بھٹو فل فارم میں تھے اور ایسے لگ رہا تھا کہ بھٹو سلامتی کونسل یا دوسرے کسی ایسے بین الاقوامی فورم سے خطاب کر رہے ہیں جبکہ ان کے مطابق تیسرے دن بھٹو نے سارے ریکارڈ توڑ دیئے۔ انہوں نے بتایا کہ اس دن خطاب کے دوران جب ہنسانے لگے تو عدالت میں موجود سب لوگ بشمول مخالف سائیڈ کے وکیل اور خود جج بھی ہنسے بغیر نہیں رہے' اس طرح انہوں نے کہا کہ جب بھٹو نے اپنے ساتھ لاہور ہائی کورٹ اور جیل میں کئے گئے سلوک کی روداد سنائی تو عدالتی کمرے پر مکمل خاموشی اور مایوسی چھا گئی' ایک دو مرحلوں پر اکثر ان کی آنکھیں نم ہوتی ہوئی نظر آئیں جن میں کچھ جج صاحبان بھی شامل تھے مگر انہوں نے اپنا خطاب ختم کرتے ہوئے جو دو جملے کہے وہ انتہائی اہم اور دلچسپ تھے اور یہ جملے ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔

بھٹو نے بینچ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ Me Lord I am thankful that you heard me all the three days with full patience. Now even if i am hanged I wont mind بھٹو طنز اور مزاح کا تو بادشاہ تھے مگر حیرت اس بات پر ہوئی ایک ایسے مرحلے پر جب وہ پھانسی گھاٹ پر کھڑے تھے اس وقت بھی ان کی Wit اپنے عروج پر تھی۔ انہوں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا کہ me lord if i am hanged i will certainly say one thing that life is very beautiful ضیاء کی حکومت کو یقین تھا کہ ان کی ہدایات پر سپریم کورٹ جو فیصلہ سنانے والی ہے اسے نہ ملک کے عوام تسلیم کرینگے اور نہ بین الاقوامی دنیا لہٰذا عوامی رائے پر آخری وار کے طور پر 15 جنوری 1979ء کو بھٹو حکومت کے خلاف وائٹ پیپر (سفید جھوٹ) کے چھ والیوم ایک ہی وقت پریس میں شائع کئے گئے' 15 فروری 1979ء کو نہ فقط بیگم نصرت بھٹو کو ان کی رہائش گاہ میں نظر بند کیا گیا بلکہ پی پی کی وفادار پارٹی خواتین کے ساتھ ان کے شوہروں کے علاوہ پی پی کے ملک بھر میں ہزاروں سرگرم کارکنوں کو گرفتار کیا گیا' محترمہ بینظیر بھٹو پہلے ہی نظر بند ہو چکی تھیں' گرفتاریوں کا زیادہ زور سندھ میں تھا انہی دنوں سندھ میں پی پی کے وفادار رہنماؤں کو نظر بند کرنے اور سرگرم کارکنوں کو گرفتار کرنے کے سلسلے میں سندھ میں فوجی ہیڈ کوارٹرز میں ایک خفیہ ڈاکومنٹ ''کانٹی جینسی پلان'' تیار کیا گیا' ایک رپورٹر کی حیثیت سے راقم کو بھی اس ڈاکومنٹ کی کاپی ہاتھ آ گئی جسے پاکستان کے ایک ممتاز ہفت روزہ میں شائع کیا گیا مگر یہ ساری کارروائی خفیہ تھی' ہر بات آج تک پوری طرح منظر عام پر نہیں آ سکی کہ سندھ میں پی پی کے سرگرم کارکنوں کو اتنی بڑی تعداد میں گرفتار کیا گیا کہ سندھ کی جیلوں میں ان کو بند کرنے کی جگہ نہیں تھی لہٰذا سندھ کے مختلف علاقوں میں کنسنٹریشن کیمپس قائم کرکے ان میں ان کو رکھا گیا' یہ کیمپس حروں کی تحریک کو دبانے کے لئے انگریز سامراج کی طرف سے سندھ کے مختلف علاقوں میں قائم کی گئی ''حر کیمپس'' کے طرز پر تھے' اس سارے آپریشن کا مقصد یہ تھا کہ بھٹو کی پھانسی پر گھر سے باہر نکل کر مظاہرہ کرنے والے متوقع ہر رہنما اور کارکن کو نظر بند کر دیا جائے تاکہ بھٹو کو پھانسی

دیئے جانے کے بعد سارے ملک میں مکمل خاموشی ہوتا کہ ضیاء سرکار دعویٰ کر سکے کہ بھٹو کی پھانسی پر ملک بھر میں کہیں بھی لوگ مشتعل ہو کر باہر نہیں نکلے' مگر ایک بات ضرور دلچسپ نظر آئی کہ جہاں ایک طرف خواتین کے ساتھ ملک بھر میں ہر کارکن کو گرفتار کیا گیا وہاں پی پی کے دو انتہائی اہم رہنماؤں ممتاز بھٹو اور عبدالحفیظ پیرزادہ کو بھٹو کو پھانسی دیئے جانے سے چند روز قبل رہا کر دیا گیا' یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ دونوں رہنماؤں کی ان دنوں دوسری شادی کی بھی اطلاعات آئیں۔

راقم کو یاد ہے کہ بھٹو کو پھانسی دیئے جانے سے کوئی ایک ماہ قبل کسی پروفیشنل اسائمنٹ پر راقم کو اسلام آباد جانا پڑا' وہاں میری وزیر دفاع میر علی احمد تالپور سے راولپنڈی میں ان کے آفس میں ملاقات ہوئی' اس ملاقات کے دوران انہوں نے اپنے آفس کے ایک حصے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ آپ نے مجھ سے ملاقات میں دیر کر دی ورنہ کچھ دن پہلے آتے تو وہاں رکھی ہوئی فائل میں آپ کو بھی دکھاتا جس میں پی پی کے دو انتہائی اہم رہنماؤں کے معافی نامے تھے۔ انہوں نے فی الحال اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا مگر ان کا اشارہ بالکل واضح تھا' میں اس سلسلے کی دو راز کی اور باتیں بھی اس کتاب کے ذریعے ریکارڈ پر لاتا چلوں تو کوئی حرج نہیں۔ بھٹو کے چہلم کو کور کرنے کے لئے میں اپنے اخبار کی طرف سے لاڑکانہ پہنچا اور وہاں کے ایک بڑے ہوٹل میں کمرہ بک کرایا اور گڑھی خدا بخش روانہ ہو گیا' گڑھی خدا بخش کے قبرستان میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کے مزار پر حاضری دینے کے بعد سب لوگ جو ہزاروں کی تعداد میں تھے بھٹو کی بڑی بیگم ''شیریں بیگم'' کے بنگلے کی طرف آئے جہاں زائرین کے لئے کھانے کا بندوبست کیا گیا تھا اس مرحلے پر ایک طرف مولانا احترام الحق ایک اجتماع سے خطاب کر رہے تھے' اچانک کراچی سے پی پی کے ایک رہنما مسرور احسن خان جو بہت بڑے مقرر تھے اور کافی دنوں سے روپوش تھے کیونکہ ان کو گرفتار کرنے کے لئے چھاپے مارے جا رہے تھے وہ ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر تقریر کرنے لگے کہ بھٹو کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا مگر پارٹی کے وہ مرکزی رہنما جو جیل سے باہر تھے

انہوں نے بھٹو کو بچانے کے لئے کیا کوششیں کیں؟ ان کا اشارہ خاص طور پر غلام مصطفیٰ جتوئی، عبدالحفیظ پیرزادہ اور ممتاز بھٹو کی طرف تھا اسی دوران کچھ مشتعل کارکن کہیں سے ممتاز بھٹو کو وہاں لے آئے' وہاں ان سے سوال کیا گیا کہ بھٹو پھانسی چڑھ گئے مگر آپ نے ان کو بچانے کے لئے کیا کیا؟ سوال کا جواب دینے کے بجائے ممتاز بھٹو جذباتی ہو گئے اور سر پر پہنی ہوئی سندھی ٹوپی اتار کر غصے سے زمین پر پھینکتے ہوئے کہا کہ بھٹو کو پھانسی دیکر ہماری پگڑی اتار کر زمین پر پھینک دی گئی ہے اور آپ مجھ سے یہ سوال کر رہے ہیں؟ بھٹو خاندان سے تعلق ہونے کی وجہ سے لوگ ان کی عزت تو کرتے تھے لہٰذا اس جواب کے بعد وہاں مجمع خاموش رہا اور ممتاز بھٹو وہاں سے خاموشی سے کھسک گئے' اسی دوران کچھ اور کارکن عبدالحفیظ پیرزادہ کو وہاں لے آئے اور ان سے بھی وہی سوال کیا گیا جو ممتاز بھٹو سے کیا گیا تھا' عبدالحفیظ پیرزادہ نے مجمع کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ قل پڑھ کر بھٹو صاحب کی روح کو ایصال ثواب کریں اور اس وقت ایسے سوال نہ کریں یہ کہنے پر مجمع میں سے ایک مشتعل جوان باہر نکلا اور پیرزادہ کے نزدیک آ کر اسے ایک تھپڑ مار دیا کچھ دیر کے بعد پی پی کے مشتعل کارکن کھانا کھانے والے رہنماؤں کی طرف گئے اور غلام مصطفیٰ جتوئی پر نظر پڑتے ہی تین چار پی پی کارکنوں نے جتوئی کو بازوں سے پکڑ کر کھانے سے اٹھایا اور باہر لے آئے' اسی دوران مقررین عمارت کی چھت پر چلے گئے اور نیچے عوام کا جم غفیر تھا' مشتعل کارکنوں نے جتوئی کو چھت پر لا کر ان مقررین کے سامنے کھڑا کیا اور ان سے بھی وہی سوال کیا گیا جو ان سے پہلے پی پی کے دو مرکزی رہنماؤں سے کئے جا چکے تھے مگر جتوئی نے کوئی بھی ڈرامائی جواب دینے کے بجائے آنکھیں نیچے کرتے ہوئے کہا کہ ہاں میں بھٹو صاحب کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کر سکا میں شرمسار ہوں۔

اس جواب کے لئے شاید مجمع میں کوئی تیار نہیں تھا یہ جواب ان کے لئے غیر متوقع تھا' اس جواب کے بعد چھت کے اوپر اور نیچے وسیع میدان پر مکمل خاموشی چھا گئی' جتوئی کچھ منٹ خاموش وہاں کھڑے رہے اور بعد میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے اور دور جا کر اپنی

کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے' بھٹو کے چہلم کو کور کرنے کے لئے اسلام آباد سے بی بی سی کے مارک ٹیلی بھی آئے ہوئے تھے انہوں نے بھی اسی ہوٹل میں کمرہ بک کرایا تھا جہاں میرا کمرہ بک تھا اور دونوں کمرے ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے' چہلم کے دوران بھی ایک دو بار مارک ٹیلی سے ملاقات اور بات چیت ہوئی' شام کو ہوٹل لوٹنے کے بعد میں نے کوئی ایک گھنٹے تک کمرے میں آرام کیا' اٹھا تو کوئی باہر سے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا میں نے دورزاہ کھولا تو مارک ٹیلی کھڑے تھے' کہنے لگے میں بھی اکیلا ہوں آپ بھی اکیلے ہیں' کیا مناسب نہیں کہ آپ نہا کر میرے کمرے میں آ جائیں' گپ شپ بھی کرتے ہیں' کھانا کھاتے ہیں کچھ دیر کے بعد میں ان کے کمرے میں تھا باتوں باتوں کے دوران انہوں نے ایک انتہائی اہم انکشاف کیا' انہوں نے کہا کہ اندھیرا چھا رہا تھا تو ایک گورا سا لڑکا جس نے اسکول کی ڈریس پہنی ہوئی تھی' ہانپتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر میرے کمرے میں آیا اور ایک چھٹی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ میں راولپنڈی میں اسکول سے نکل کر اپنے گھر جا رہا تھا کہ فٹ پاتھ کے نزدیک روڈ پر جاتی ہوئی قیدیوں کی ایک گاڑی سے کسی نے کوئی چیز پھینکی جو میری پیشانی پر آ لگی' میں نے وہ چیز اٹھائی تو وہ ایک چھوٹا سا لفافہ تھا جس کے اندر کوئی کاغذ پڑا ہوا تھا اور اوپر لکھا ہوا تھا کہ اگر آپ یہ لفافہ اسلام آباد میں بی بی سی کے نمائندے مارک ٹیلی کو اس ایڈریس پر پہنچائیں گے تو میں بہت مشکور ہونگی۔ نیچے ''بے نظیر بھٹو'' لکھا ہوا تھا' اس لڑکے نے بتایا کہ بے نظیر بھٹو کا نام پڑھ کر میں پسینے میں شرابور ہو گیا اور بغیر سوچے جذبات میں آ کر اسلام آباد کی طرف دوڑنے لگا مگر بعد میں' میں نے سوچا کہ اسلام آباد کافی دور ہے' میری جیب میں کافی رقم تھی میں نے فوری طور پر ایک ٹیکسی لی اور اس لفافے پر لکھے ہوئے ایڈریس پر لے چلنے کے لئے کہا لہٰذا اب میں یہاں پہنچ گیا ہوں اور بڑی مہربانی یہ امانت آپ لے لیں یہ قصہ مجھے سنا کر مارک ٹیلی نے کہا کہ جب میں نے وہ لفافہ کھولا تو اس میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پڑا ہوا تھا جس کے اوپر لکھا ہوا تھا Tally! papa is being hanged to night اور کاغذ کے ٹکڑے کے نیچے بے نظیر بھٹو نے اپنا نام لکھا ہوا تھا' مارک ٹیلی

مجھے یہ قصہ سناتا رہا اور میں بڑے غور اور حیرت سے یہ سب کچھ سنتا رہا۔

مارک ٹیلی کی کتھا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اس نے بتایا کہ یہ کاغذ کا ٹکڑا اس کے اور بی بی سی کے لئے بہت اہم خبر تھی' اس وقت اسلام آباد میں متعین رپورٹر اپنے اپنے ملکوں کو رپورٹیں اسلام آباد کی جنرل پوسٹ آفس سے ٹیلی کاسٹ کے ذریعے بھیجتے تھے لہٰذا بقول ٹیلی کے اس نے کاغذ کے ٹکڑے کو سنبھالا اور فوری طور پر جنرل پوسٹ آفس کی طرف روانہ ہو گیا کیونکہ ابھی بی بی سی کی 8 بجے کی خبریں اور سیربین نشر ہونے میں کافی دیر تھی۔ مارک ٹیلی نے بتایا کہ پتہ نہیں اس دن بھٹو صاحب کا نصیب اچھا نہیں تھا' بے نظیر بھٹو کا نصیب اچھا نہیں تھا یا پاکستان کے عوام اور خاص طور پر بھٹو کے شائقین کا نصیب اچھا نہیں تھا کہ راستے میں انہیں خیال آیا کہ راستے میں پی پی کے اہم رہنما عبدالحفیظ پیرزادہ کی بھی رہائش گاہ ہے کیوں نہ وہاں رک کر انہیں بے نظیر بھٹو کی یہ چھٹی پڑھا کران سے بھی اس سلسلے میں بیان لیکر یہ سب مواد جا کر بی بی سی کو ارسال کر دیں لہٰذا انہوں نے کہا کہ میں نے اپنی گاڑی پیرزادہ کی رہائش گاہ کے پاس روکی اور اوپر ان سے ملنے چلا گیا۔ انہوں نے کہا کہ پیرزادہ کے پاس پہنچ کر انہوں نے ساری بات انہیں بتائی اور بے نظیر بھٹو کی چھٹی ان کو پڑھنے کے لئے دی تو انہوں نے وہ چھٹی پاس پڑے ہوئے کچرے کے ڈبے میں ڈالتے ہوئے کہا کہ

Benazir is a kid.Do you think it is joke to hang bhutto?۔

ٹیلی نے کہا کہ اس کے بعد پیرزادہ نے انہیں اپنے پاس بٹھایا اور اپنے موقف کی وضاحت کرنے لگا اسے یقین تھا کہ بھٹو کو پھانسی نہیں چڑھایا جاسکے گا۔ مارک ٹیلی نے کہا کہ ان سے بھی یہ غلطی ہوگئی کہ وہ پیرزادہ کی باتوں میں آ گئے اور ٹیلی گراف آفس جانے کے بجائے میں وہیں بیٹھ گیا جہاں اسے آٹھ بج گئے بہرحال انہوں نے کہا کہ وہاں سے اٹھنے کے بعد ٹیلی گراف آفس آئے جہاں کچھ اور خبریں بھیجنے کے ساتھ بے نظیر بھٹو کے پیغام والی خبر بھی بھیجی مگر اب ایک تو اس خبر میں پہلے والا وزن نہیں رہا تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ یہ خبر اب پاکستان کے ٹائم کے مطابق 10 بجے کے خبرنامہ میں نشر ہوئی جبکہ اس وقت کافی دیر ہو چکی تھی۔ مارک ٹیلی کا بھی یہ

خیال تھا اور میرا بھی یہ خیال تھا کہ اگر 7 اور 8 بجے کی خبروں کے بلیٹن اور سیربین میں یہ خبر نشر ہوتی تو حکومت کی طرف سے ملک بھر میں انتہائی سخت سیکورٹی انتظامات کے باوجود سارا پاکستان نہیں تو پنجاب کے کچھ علاقے اور خاص طور پر سارا سندھ کھڑا ہو جاتا اور شاید اس رات بھٹو کو پھانسی دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

اسی سلسلے کی ایک اور داستان بھی یہاں ریکارڈ پر لانے کو دل چاہتا ہے جس رات بھٹو کو پھانسی دی گئی وہ رات کراچی پریس کلب کے صحافیوں پر ایک لحاظ سے بہت بھاری گزری درحقیقت رات کو آٹھ بجے ہی کراچی پریس کلب میں یہ بات گردش کرنے لگی کہ بھٹو کو پھانسی دیدی گئی ہے یا آج رات کسی وقت بھی پھانسی دیدی جائے گی یہ خبر گردش کرتے ہی پریس کلب کا سارا ماحول انتہائی سوگوار ہو گیا تقریباً ہر صحافی سوگوار نظر آیا سوائے ان چند صحافیوں کے جن کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا یا انتہائی دائیں بازو کے تھے یا شاونسٹ پنجابی تھے اس وقت ایک اہم واقعہ ہوا جس نے ماحول کو مزید سوگوار بنادیا ایک سندھی دانشور جن کا تعلق سندھ کی قوم پرست پارٹیوں سے رہا تھا اور بھٹو کا سخت مخالف تھا اور ہر وقت بھٹو پر کڑی سے کڑی تنقید کرتا رہتا تھا جب اس تک یہ خبر پہنچی کہ بھٹو کو پھانسی دیدی گئی ہے یا دی جانے والی ہے تو اس کی اچانک عجیب کیفیت ہو گئی وہ اپنے بال کھینچنے لگا اور چیخنے لگا کہ بھٹو کو پھانسی دی جا رہی ہے' آنسو اس کی آنکھوں سے برس رہے تھے وہ کھڑے ہو کر چیخنے لگا پتہ نہیں کس طرح اس کے دوست اسے تسلی دیتے ہوئے کلب سے باہر لے آئے اور کسی کی گاڑی میں اسے اپنے گھر بھیج دیا گیا خاص طور پر اس واقعہ کے بعد کلب کا ماحول انتہائی سوگوار ہو گیا مجھے یاد ہے کہ میں بھی تقریباً 12 بجے اپنے گھر کو روانہ ہوا میں ان دنوں جیکب لائنز کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ فلیٹ میں گھستے ہی اپنے کمرے میں پڑے ہوئے بستر پر کپڑے تبدیل کئے بغیر لیٹ گیا پتہ نہیں کب تک میں بستر پر لیٹے چھت کو تکتا رہا اور پتہ نہیں کب مجھے نیند آ گئی' صبح کو آٹھ بجے آنکھ کھلی تو کمرے کے دروازے کے پاس اس دن کا اخبار پڑا تھا وہ اٹھایا تو اس کی لیڈ کے مطابق ذوالفقار علی بھٹو کو

پھانسی دیدی گئی حالانکہ رات کو سوتے وقت یقین تھا کہ بھٹو کو پھانسی دیدی جائے گی مگر صبح کو یہ خبر پڑھ کر میں شاید ہوش گنوا بیٹھا' ان ہی کپڑوں میں اور ہاتھ منہ دھوئے بغیر ہاتھوں میں وہ اخبار پکڑے میں اپنے فلیٹ سے باہر نکل آیا مجھے یاد نہیں کہ میں کہاں جا رہا تھا اور کون سے راستے پار کر رہا تھا ایسے لگا کہ میری آنکھ اس وقت کھلی جب میں کراچی پریس کلب کے باہر کھڑا تھا کلب میں داخل ہوا ایسا لگا کہ ہر طرف خزاں ہے اور پریس کلب کے درخت سنسان نظر آئے اس وقت شاید کلب میں کوئی نہیں تھا۔

میں آہستہ چلتے ہوئے ٹیرس پار کرتے ہوئے دوسری طرف لان پر پڑی ہوئی ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گیا پتہ نہیں کب تک اسی کیفیت میں وہاں بیٹھا رہا' اچانک کسی اسکوٹر کی کلب کے اندر آنے کی آواز آئی اسکوٹر سوار اسکوٹر کلب کے پچھواڑے میں کھڑی کر کے میری طرف آتے ہوئے محسوس ہوئے مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ چہرہ اٹھا کر دیکھوں کون صاحب آئے ہیں اچانک میں نے محسوس کیا کہ جو صاحب آئے تھے وہ میری کرسی کے نزدیک پڑی ہوئی ایک اور کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بھی مجھ سے مخالب ہونا مناسب نہیں سمجھا' وہ بھی خاموش بیٹھے رہے' میں نے پھر دیکھنا مناسب نہیں سمجھا کہ کون آئے ہیں کچھ عرصہ مکمل خاموشی رہی' اچانک اس صاحب نے منہ نیچے کر کے انتہائی نحیف آواز میں مجھے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ مغل میں بھٹو صاحب کے بہنوئی کے گھر جا رہا ہوں اگر آپ بھی چلنا چاہیں میرے اسکوٹر کے پیچھے آ کر بیٹھ جائیں میں نے دیکھا کہ وہ سینئر صحافی نظام صدیقی تھے جو کسی وقت میں بھٹو کے بہت قریب تھے اور ریڈیو پاکستان میں ایک خاص عرصے تک ایک خاص اسائمنٹ پر تھے وہ اٹھے اور جیسے ہی اسکوٹر نزدیک آتی ہوئی محسوس ہوئی تو میں بھی اٹھا اور جا کر اسکوٹر کے پیچھے بیٹھ گیا اس طرح ہم بھٹو صاحب کے بہنوئی منور الاسلام کے گھر پہنچ گئے' وہاں تو نظارہ بہت سوگوار تھا' بتایا گیا کہ بھٹو کی بہن فجر کے وقت سے بے ہوش ہیں' ڈاکٹر آ کر بڑی کوششوں کے بعد ہوش میں لاتے ہیں تو وہ پھر دوبارہ بے ہوش ہو جاتی ہیں اس کے اسباب سن کر اور دکھ ہوا پتہ چلا کہ رات کو

جب یہ خبر پھیلی کہ یا تو بھٹو کو پھانسی دیدی گئی ہے یا دی جائے گی تو سارے گھر والے اور خاص طور پر بھٹو صاحب کی بہن بہت پریشان ہوئیں لہٰذا انہوں نے اسلام آباد میں عبدالحفیظ پیرزادہ کو ٹیلی فون کر کے حقائق جاننے کی کوشش کی تو پیرزادہ نے حسب معمول یہ جواب دیا کہ نہیں یہ خبریں غلط ہیں' بھٹو کو پھانسی دینا کوئی مذاق ہے؟ بھٹو کی بہن کے گھر والوں نے بتایا کہ ایک مرحلے پر پیرزادہ نے بھٹو کی بہن کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ بھٹو کو پھانسی نہیں ہو رہی ہے'

:Have the Sweet sleep. in the morning you will hear a good news: بھٹو صاحب کے گھر والوں نے بتایا کہ جب فجر کے وقت ٹیلی فون آنے شروع ہوئے کہ بھٹو کو پھانسی دیدی گئی ہے اور جب بھٹو کی بہن کو نیند سے اٹھا کر یہ بات بتائی گئی تو وہ یہ کہہ کر بے ہوش ہوگئی کہ ''کیا یہ ہے وہ اچھی خبر جس کے بارے میں حفیظ پیرزادہ کہہ رہے تھے کہ آپ گہری نیند کریں صبح اچھی خبر سنیں گی''۔ بھٹو کی بہن کے گھر والے ابھی اس پریشانی سے ہی باہر نہیں نکلے تھے تو ہماری موجودگی میں پڑے ہوئے ٹیلی فون پر لندن سے میر مرتضٰی بھٹو کا ٹیلی فون آیا وہ انتہائی دکھی تھے اور کہہ رہے تھے کہ انہوں نے کراچی کا ٹکٹ لے لیا ہے اور آئندہ فلائٹ سے وہ کراچی آ رہے ہیں یہ سن کر بھٹو کی بہن کے سارے گھر والوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے' بھٹو صاحب کے بہنوئی سے لیکر بھٹو صاحب کے بھانجے اور بھانجیاں ایک ایک کر کے مرتضٰی پر زور دے رہی تھیں کہ وہ ابھی پاکستان نہ آئیں ان کی زندگی بھی خطرے میں ہے' ان کے جواب میں میر مرتضٰی بھٹو انتہائی چیخ چیخ کر بات کر رہے تھے اور یہ آوازیں ہم تک بھی پہنچ رہی تھیں' میر کہہ رہے تھے کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میرے والد کو پھانسی دیدی گئی ہے اور میری ماں اور میری بہن بےنظیر بھٹو جنرل ضیاء کی قید میں ہیں اور آپ مجھے ایسی صورتحال میں پاکستان لوٹنے سے روک رہے ہیں' میر نے ان سب کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے میں آ رہا ہوں' مجھے پاکستان آنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی' وہاں اس وقت لاڑکانہ سے منتخب ہونے والی ایم این اے بیگم اشرف عباسی بھی موجود تھیں'

وہ آگے بڑھیں اور ٹیلی فون ہاتھ میں لیکر میر مرتضیٰ بھٹو کو سمجھانے لگی کہ آپ نہ آئیں اور آخر میں انہوں نے کہا کہ میر صاحب اس سلسلے میں مجھے بیگم صاحبہ (بیگم بھٹو) نے آپ کے لئے ایک خاص پیغام دیا ہے کہ اگر منع کرنے کے باوجود آپ پاکستان آتے ہیں تو میں ماں کا دودھ نہیں بخشوں گی لہٰذا آپ وہیں رہیں اور شاہنواز اور صنم بھٹو کا خیال رکھیں' اس کے بعد بھی میر صاحب چیختے رہے اور ان کو یہ کہتے ہوئے سنتے رہے کہ یہ میرے ساتھ زیادتی ہے' بہر حال انہوں نے ماں کا حکم مانا اور اس وقت پاکستان لوٹنے کا پروگرام منسوخ کر دیا۔

دریں اثناء 6 فروری 1979ء کو سپریم کورٹ نے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف بھٹو کی اپیل رد کر دی اور بھٹو کی پھانسی کی سزا برقرار رکھی مگر اس فیصلے کی ایک انتہائی اہم بات یہ تھی کہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس انوار الحق نے جس فیصلے کا اعلان کیا وہ تقسیم شدہ فیصلہ تھا شاید یہ عدالتی تاریخ کا ایک عجیب وغریب فیصلہ تھا جس کے تحت چار جج جو سب کے سب پنجاب کے تھے انہوں نے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے بھٹو کی پھانسی کی سزا کو جوں کا توں برقرار رکھا تھا جبکہ باقی تین جج جو سب کے سب غیر پنجابی تھے جن میں دو ججوں یعنی جسٹس دراب پٹیل اور جسٹس ایم حلیم کا تعلق سندھ سے تھا جبکہ تیسرے جج جسٹس صفدر شاہ کا تعلق کے پی کے سے تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ان تینوں ججوں نے بھٹو کو باعزت بری کرنے کا فیصلہ دیا تھا' اسی رات بھٹو کے بڑے وکیل یحییٰ بختیار جیل میں بھٹو سے ملے اور ملاقات کرنے کے بعد اعلان کیا کہ بھٹو اس فیصلے کے خلاف کوئی رحم کی اپیل نہیں کرینگے حالانکہ فنی نقطہ نگاہ سے بھی جب فیصلہ 3 اور 4 ججوں کا فیصلہ اتنا متضاد ہو تو اس پر عملدرآمد نہیں ہوسکتا تھا اس فیصلے کا اعلان ہوتے ہی کئی عالمی رہنماؤں نے جن میں خاص طور پر مسلم ملکوں کے سربراہ تھے۔ جنرل ضیاء الحق سے اپیل کی کہ بھٹو کو پھانسی کی سزا نہ دی جائے مگر جنرل ضیاء نے ان کی ایک بھی نہ سنی اس مرحلے پر عبدالحفیظ پیرزادہ نے سپریم کورٹ میں اپیل داخل کی کہ یہ اپیل سننے والی بینچ میں جسٹس وحید الدین اور جسٹس قیصر خان کو بھی شامل کیا جائے جن کو سماعت کے دوران مختلف بہانوں سے بینچ سے الگ

کر دیا گیا تھا کیونکہ سماعت کے دوران محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ دونوں جج بھٹو کے خلاف کیس کو درست نہیں سمجھتے تھے مگر عدالت نے عبدالحفیظ پیرزادہ کی درخواست رد کر دی' 12 مارچ کو بھٹو کی رویو پٹیشن پر فیصلہ عدالت نے محفوظ کر لیا' 24 مارچ 1979ء کو سپریم کورٹ نے رویو پٹیشن کو رد کر دیا مگر ساتھ ہی رائے دی کہ اس پٹیشن کی سماعت کے دوران جو دلائل دیئے گئے ہیں ان کی بنیاد پر اگر صدر چاہیں تو بھٹو کی پھانسی کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کر سکتے ہیں اسی دن بیگم بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو سہالا کے ریسٹ ہاؤس سے جہاں وہ نظر بند تھیں لا کر راولپنڈی جیل میں بھٹو سے ملاقات کرائی گئی' 24 مارچ 1979ء کو جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو بھٹو کی پھانسی کے سلسلے میں ڈیتھ وارنٹس موصول ہو گئے۔

سپریم کورٹ کی متعلقہ بینچ کے جج جسٹس صفدر شاہ نے 28 مارچ کو بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے انکشاف کیا کہ رویو پٹیشن کے فیصلے میں جو ''سفارشات'' شامل تھیں وہ بالکل واضح تھیں' ان سفارشات کے ذریعے اسٹیبلشمنٹ کو واضح ہدایات دی گئی تھیں کہ بھٹو کی زندگی برقرار رہنی چاہیے اسی دن جتوئی ہاؤس میں پی پی کی ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس پارٹی کے اس وقت کے سیکریٹری جنرل یاسین وٹو کی صدارت میں ہوا۔ یہ اجلاس کوئی فیصلہ کئے بغیر برخاست ہو گیا جبکہ باہر پی پی کارکن مظاہرے کرتے ہوئے اپنے رہنماؤں سے مطالبہ کرتے رہے کہ وہ باہر آ جائیں تا کہ سارے ملک میں احتجاج کر کے بھٹو کی جان بچائیں' 3 اپریل کو بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو نے جیل میں بھٹو سے ملاقات کی جو تین گھنٹے تک جاری رہی جب وہ ملاقات کر کے باہر آئیں تو ان کو بتایا گیا کہ یہ بھٹو کے ساتھ ان کی آخری ملاقات تھی' اسی دن ممتاز بھٹو نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ علاقے کے تحصیل دار نے ان کے والد صاحب کو کہا ہے کہ وہ اس جگہ کی نشاندہی کریں جہاں بھٹو کو دفن کیا جائے گا' بھٹو کو 3 اور 4 اپریل کی درمیانی رات کو دو بجے صبح کو جو کہ پھانسی کے مقرر وقت سے پہلے تھا پھانسی دی گئی مگر ان کی پھانسی ہوئی یا قتل کیا گیا یہ اسی رات ایک تنازعہ بن کر ابھرا' عام رائے یہ تھی کہ بھٹو کو تشدد کر کے قتل کیا گیا۔ بھٹو سے حکمرانوں کی نفرت

کا اندازا اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پھانسی دیئے جانے کے بعد جب بھٹو کی لاش نیچے لائی گئی تو ان کو ننگا کیا گیا اور کیمرا مینز بلائے گئے تا کہ ان کی فلم بنائی جائے کیونکہ ان کی زندگی میں بھی ان کے خلاف کہا گیا کہ ذوالفقار علی بھٹو شاہنواز بھٹو کی ایک ہندو بیوی سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ کہ ان کا ختنہ بھی نہیں ہوا بہر حال جب ان کی فلم بنانے کی تیاری کی گئی تو اللہ نے بھٹو صاحب کی عزت کو محفوظ رکھا وہ سب پروپیگنڈا غلط ثابت ہوا بہر حال یہ شرمناک حشر اس شخصیت کا ان کی وفات کے بعد کیا گیا جو نہ فقط پاکستان کے مگر خاص طور پر پاکستان کی فوج کے محسن تھے' انہوں نے تقریباً 100 پاکستانی فوجیوں پر بنگلہ دیش کی حکومت کی طرف سے مقدمہ چلانے کا فیصلہ منسوخ کرایا' ہندوستان میں تقریباً 90 ہزار فوجی اور سویلین جنگی قیدیوں کو بغیر کسی شرط کے آزاد کرایا۔ انہوں نے پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کا فاوَنڈیشن رکھا' مسلم ملکوں کی کامیاب سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد کرائی' پاکستان کو پہلا متفقہ آئین دیا اور اب تیسری دنیا کی سربراہی کانفرنس بلانے والے تھے جہاں تک بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کی بجائے تشدد کر کے قتل کرنے کی بات ہے تو خود بیگم نصرت بھٹو نے 1995ء میں ایک اخباری نمائندے سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''مجھے پتہ ہے کہ میرے شوہر کو پھانسی نہیں دی گئی مگر انہیں جیل کے اندر قتل کیا گیا اور مجھے ڈر ہے کہ وہ میر مرتضیٰ بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو بھی قتل کر دینگے' بعد میں بیگم صاحبہ کے یہ اندیشے بھی درست نکلے۔ اس طرح پاکستان کے اس وقت کے جنرلوں' عالمی سامراج اور ملک کے سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے کی مشترکہ سازشوں کے نتیجے میں ایک عالمی رہنما کا اس طرح خاتمہ کر دیا گیا اور پاکستان ایک لمبے عرصے تک ایک بار پھر فوجی آمریت کے چنگل میں جاتا ہوا نظر آیا۔

مادرِ جمہوریت

بیگم نصرت بھٹو کئی حوالوں سے پاکستان کی سیاست کا ایک ایسا لاثانی کردار ہیں جنہوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ وہ نہ صرف اپنے شوہر اور اپنے بچوں سے لازوال محبت کوتی تھیں بلکہ اس ملک کے عوام خاص طور پر غریبوں اور نچلے طبقے کے لوگوں اور جمہوریت کی خاطر اپنی جان کی قربانی دینے کے لئے بھی گریز نہیں کریں گی اور انہوں نے اپنے کردار سے یہ ثابت کر دیا' یہ سب کچھ پاکستان کی تاریخ کا ایک شاندار اور انمٹ باب ہے۔ قذافی اسٹیڈیم میں جو زخم بیگم بھٹو کو لگے تھے وہ اتنے گہرے تھے کہ نہ صرف دماغی بلکہ جسمانی طور پر بھی وہ اندر سے کمزور ہو گئی تھیں مگر اس کے باوجود ملک سے باہر جانے کے لئے تیار نہیں تھیں مگر پھر ڈاکٹروں کی تشخیص نے بتایا کہ کینسر جیسی موذی بیماری ان میں سرائیت کر چکی ہے۔ کینسر جیسی موذی بیماری کے باوجود بیگم نصرت بھٹو نے انتہائی بہادری سے جیل کی ساری صعوبتیں برداشت کیں مگر کسی مرحلے پر بھی انہوں نے پیچھے ہٹنے کا سوچا بھی نہیں' درحقیقت جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے دوران دونوں ماں بیٹیوں کے درمیان جیل کاٹنے کا مقابلہ رہا' یا تو دونوں جیل میں ہوتی تھیں یا ایک جیل سے باہر آتی تھی تو دوسری کو جیل بھیج دیا جاتا تھا' پاکستان کی سیاست میں بیگم نصرت بھٹو کے کردار کا بغور جائزہ لینے پر اس بات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ بیگم نصرت بھٹو ایک مدبر سیاستدان بھی تھیں مگر چونکہ ان کے شوہر ذوالفقار علی بھٹو عالمی پیمانے کے سیاسی مدبر تھے لہٰذا ان کی زندگی میں وہ ان

کے سائے میں رہیں لہٰذا اس دوران ان کے سیاسی تدبر اور ذہانت کے بارے میں عام لوگ اتنے باخبر نہ تھے۔

ان کی صلاحیتیں تو اس وقت ظاہر ہوئیں جب ذوالفقار علی بھٹو فوجی آمریت کے ہاتھوں انتہائی بے رحمی سے شہید کر دیئے گئے' کیا یہ تاریخ کی ناقابل تردید حقیقت نہیں ہے کہ بیگم نصرت بھٹو نے اپنے تدبر سے اپنی مخالف سیاسی پارٹیوں جن کی اکثریت بھٹو کے مخالف سیاسی اتحاد پی این اے میں تھیں اور جنرل ضیاء الحق کی اتحادی تھیں کو جنرل ضیاء الحق سے توڑ کر اپنے ساتھ ملایا اور جنرل ضیاء کے خلاف موومنٹ فار ریسٹوریشن آف ڈیموکریسی (ایم آر ڈی) یعنی تحریک بحالی جمہوریت کے نام سے ایک نیا سیاسی اتحاد بنا کر جنرل ضیاء کو سیاسی طور پر بالکل تنہا کر دیا' یہ بیگم نصرت بھٹو کا ایسا کارنامہ ہے جس کے نتیجے میں آخر عوام کو آمریت سے نجات ملی اور ملک ایک بار پھر بتدریج جمہوریت کی طرف گامزن ہونے لگا' بہرحال یہ بھی حقیقت ہے کہ بیگم نصرت بھٹو کی قربانیوں' قیادت کی صلاحیتوں کو آگے چل کر نہ فقط پاکستان کے عوام نے' مختلف سیاسی پارٹیوں نے جن میں ایسی پارٹیاں بھی شامل ہیں جو پی پی اور بھٹو خاندان کی سخت مخالف تھیں حتیٰ کہ پاکستان کے عوام کی طرف سے منتخب کی گئی قومی اسمبلی نے دل و جان سے تسلیم کیا' بہرحال یہ اس وقت ہوا جب کینسر کے موذی مرض اور بڑے بیٹے میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل کی وجہ سے نڈھال بیگم بھٹو کا 25 اکتوبر 2011ء کو انتقال ہوا تو اس کے بعد قومی اسمبلی کے ہونے والے ایک اجلاس میں ایک قرارداد متفقہ طور پر منظور کرتے ہوئے بیگم نصرت بھٹو کو ''مادر جمہوریت'' کے لقب سے نوازا۔

بیگم نصرت بھٹو کو پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے خاص طور پر جمہوریت کی بحالی اور خواتین کو بااختیار بنانے کے سلسلے میں ادا کیے گئے کردار کی وجہ سے یاد رکھا جائے گا۔ اس سے پہلے کہ ایم آر ڈی تشکیل دینے اور جمہوریت کی بحالی کی تحریک کے سلسلے میں بیگم بھٹو کا تفصیل سے ذکر کریں مناسب ہوگا کہ ان مصیبتوں اور صدموں کا بھی مختصر ہی سہی ذکر کیا جائے جن کا

سامنا بیگم بھٹو کو جنرل ضیاء کی فوجی آمریت کے ہاتھوں سامنا کرنا پڑا۔ایک رپورٹ کے مطابق چونکہ ذوالفقار علی بھٹو ایک لمبے عرصے تک پہلے لاہور میں اور بعد میں راولپنڈی جیل میں قید رہے لہٰذا اس عرصے کے دوران بیگم بھٹو کو سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو سے اس جیل کی کال کوٹھڑیوں میں بار بار ملاقاتیں کرنی پڑتیں' صرف راولپنڈی جیل میں جہاں انہیں پھانسی گھاٹ کے قریب ایک سیل میں قید کیا گیا تھا' 19 مئی 1978ء سے 3 اپریل 1979ء تک بیگم بھٹو نے سابق وزیراعظم سے کوئی 41 بار ملاقاتیں کیں۔بقول بیگم بھٹو کے ان کے شوہر نے ان ملاقاتوں کے دوران بار بار انہیں انتہائی مستحکم انداز میں کہا کہ وہ کسی حالت میں بھی حکومت سے معافی نہیں مانگیں گے اور وہ ہر بار ان ملاقاتوں کے دوران تاکید کرتے رہے کہ ان کے خاندان کو فوجی آمریت کے خلاف ڈٹ جانا ہوگا اور ایک لمبے عرصے تک ان کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنا ہوگا' بعد میں بیگم نصرت بھٹو اور ان کے سارے خاندان نے یہی کچھ کیا' سب نے اپنی جانیں قربان کر دیں مگر فوجی آمریت کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے' یہ بات بھی راز نہیں رہی کہ بھٹو صاحب خاص طور پر بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو ہر بار تاکید کرتے تھے کہ اگر ان کو پھانسی دی جائے تو لوگوں کے سامنے ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے چاہئیں۔ یہ انسانی قدروں' اسلامی اصولوں کی سنگین خلاف ورزی اور ستم ظریفی کی انتہا نہیں کہ جب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد ان کی میت لاڑکانہ میں گڑھی خدا بخش میں ان کے آبائی قبرستان میں دفن کرنے کے لئے لے جائی گئی تو بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بند تھیں اور ان کو بھٹو کی لاش کے ساتھ لاڑکانہ نہیں لے جایا گیا' اس طرح بیگم نصرت بھٹو' بھٹو صاحب کا آخری دیدار بھی نہ کر سکیں' نہ فقط اتنا بلکہ لاڑکانہ اور گڑھی خدا بخش میں ان کے عزیزوں' قریبی لوگوں اور اردگرد کے گاؤں کے لوگوں کو بھی بھٹو کے جنازے اور تدفین کی رسوم میں شرکت کرنے نہیں دی گئی' اس دن بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو گڑھی خدا بخش کے قبرستان لانے کے بجائے انہیں 6 اپریل کو بھٹو صاحب کی قبر پر لایا گیا' بھٹو خاندان کے اسٹیٹ منیجر حاجی

نظر محمد لغاری کے مطابق اس مرحلے پر انہیں قبرستان آنے کی اجازت دی گئی تھی' مگران کے مطابق اس مرحلے پر بھی اردگرد کا علاقہ فوجی دستوں اور پولیس کی کڑی نگرانی میں تھا' بیگم بھٹو کے ساتھ ان کی بھانجی بیگم فخری بھی ساتھ تھیں' ان کو قبر پر بھی اکیلے نہیں چھوڑا گیا' وہ کوئی 100 سپاہیوں کی نگرانی میں رہیں' ان کو کہا گیا کہ جلدی کریں اور قبرستان سے باہر نکلیں' انہیں لاڑکانہ میں ان کی آبائی رہائش گاہ المرتضیٰ میں لایا گیا' وہاں بھی ان کو مختصر عرصے کے لئے رکنے کو کہا گیا' سب خواتین سخت پیاسی تھیں' انہوں نے پانی پلانے کی استدعا کی چونکہ یہ رہائش گاہ ایک لمبے عرصے تک بند رکھی گئی تھی لہٰذا اس وقت ان کے لئے پینے کا ٹھنڈا پانی بھی نہیں تھا' ایک نوکر المرتضیٰ سے باہر جا کر ان کے لئے برف اور دودھ لانا چاہتا تھا مگر اسے المرتضیٰ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی' لہٰذا خواتین کو نلکے کا گرم پانی پینے کے لئے فراہم کیا گیا' ان کو پنڈی سے ہوائی جہاز کے ذریعے جیکب آباد لایا گیا تھا جہاں سے انہیں لاڑکانہ لایا گیا' واپسی پر وہی راستہ اختیار نہیں کیا گیا۔

جس دن ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی اس دن سے اس دن تک جب بیگم نصرت بھٹو کی زیر سرپرستی جنرل ضیاء کی مارشل لاء حکومت کے خلاف ایم آر ڈی کے نام سے فوجی آمریت مخالف اتحاد بنا کر جمہوریت کی بحالی کی تحریک جسے ''پاکستان بچاؤ تحریک'' کا نام دیا گیا' شروع ہونے تک بھی جنرل ضیاء الحق کی فوجی آمریت کے خلاف جمہوری تحریک جاری تھی' یہ تحریک پاکستان کے عوام' پیپلز پارٹی کے کارکن' ہمدرد اور کچھ بائیں بازو کے گروپ چلا رہے تھے اور جس کی قیادت بھٹو بیگمات کر رہی تھیں' اس دوران بھی عوام' پی پی کارکنوں اور خاص طور پر بھٹو بیگمات نے کم صعوبتیں نہیں اٹھائیں اور کم قربانیاں نہیں دیں' اگر اس کی تفصیلات جمع کی جائیں تو یہ بھی ایک الگ تاریخ اور الگ کتاب وجود میں آسکتی ہے' مگر اس کتاب میں فی الحال اس عرصے کے دوران عوام' پی پی کارکنوں اور بھٹو خاندان کی طرف سے کی گئی جدوجہد اور ان کو آئی درپیش صعوبتوں کا فقط ایک مختصر خلاصہ ہی پیش کر سکتے ہیں' جو اس طرح ہے: ذوالفقار علی بھٹو کو 4 اور 5

اپریل کی درمیانی رات کو پھانسی دی گئی' اس وقت بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو نظر بند تھیں' 29 مئی 1979ء کو دونوں ماں بیٹی کو رہا کر دیا گیا' ان کی رہائی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے ملک میں پھیل گئی' یہ خبر ملتے ہی لوگ جوق در جوق ملک کے ہر کونے سے کراچی پہنچ کر 70 کلفٹن میں بھٹو خواتین سے تعزیت کرتے' تعزیت کے دوران اکثر نوجوان سر پیٹتے' دھاڑیں مار کر روتے دکھائی دیتے تھے' ان دنوں خاص طور پر کراچی کے سارے سیاسی رپورٹرز کی ڈیوٹیاں 70 کلفٹن میں ہوتی تھیں' یہ رپورٹر گواہ ہیں کہ لوگوں کے مجمع کے درمیان کرسی پر بے نظیر بھٹو ایک آئرن وومن کی طرح بیٹھ کر یہ سارے دکھ سنتی تھیں اور وہ اکثر چیئرمین ماؤزے تنگ کا یہ قول دہراتیں کہ ''غم کو طاقت میں تبدیل کریں'' یہ جنگ جو بھٹو نے شروع کی تھی وہ ہر صورت میں جاری رکھیں گے اور ہر حالت میں یہ جنگ جیتیں گے' یہ رپورٹر اس بات کے بھی گواہ ہیں کہ ان سارے دنوں میں بے نظیر بھٹو غیر معمولی دکھی ضرور نظر آتی تھیں مگر ایک بار بھی ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے گئے' اس طرح انہوں نے اپنے باپ کی ہدایات پر من و عن عمل کر کے دکھایا اور ثابت کیا کہ بھٹو خاندان کے لوگ شاید کسی خاص مٹی سے بنائے گئے ہیں۔

3 جون 1979ء کو بیگم نصرت بھٹو نے اعلان کیا کہ اگر پاکستان کے عوام نے چاہا اور انہیں ووٹ دیا تو وہ وزارت عظمیٰ کے فرائض سرانجام دینے میں ایک سیکنڈ کے لئے بھی پس و پیش نہیں کریں گی' اسی دن جنرل ضیاء الحق کی مارشل لاء حکومت نے بجٹ پیش کیا جس میں سیمنٹ' فرنس آئل' پیٹرول اور گھی کی قیمتیں بڑھا دی گئیں جس کے خلاف ملک بھر میں عوام میں شدید غم و غصہ پیدا ہو گیا' محترمہ بے نظیر بھٹو نے اس بجٹ کو جنرل ضیاء الحق کی حکومت اور پی این اے کے ایک وزیر کے خلاف وائٹ پیپر قرار دیا' اس بجٹ کے خلاف 8 جولائی 1979ء کو ملک بھر میں مکمل ہڑتال کی گئی' اسلامی قوانین کے تحت عدت کا عرصہ مکمل کرنے کے بعد بیگم نصرت بھٹو نے 71 کلفٹن کراچی میں ایک بھرپور پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ملک بھر میں عوام کے پاس جانے کی مہم شروع کرنے کا اعلان کیا۔ انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا کہ ان کے شوہر کو

پھانسی نہیں دی گئی بلکہ تشدد کر کے قتل کیا گیا ہے کیونکہ ان کی گردن پر پھانسی کے کوئی نشان نہیں تھے' 22 نومبر 1979ء کو مشتعل عوام نے امریکہ کے خلاف اپنی شدید نفرت کا اظہار کرتے ہوئے اسلام آباد میں امریکہ کے سفارتخانے کو آگ لگا کر جلا ڈالا' 12 اپریل 1980ء کو بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو چھ ماہ کی نظر بندی کے بعد رہا کر دیا گیا' 5 جنوری 1981ء کو بڑے پیمانے پر پی پی کارکنوں کو 5 جولائی کے لیبیا سازش کیس کے حوالے سے گرفتار کیا گیا' بہت کم لوگوں کو پتہ تھا کہ اس عرصے کے دوران بیگم نصرت بھٹو چند مشیروں کے مشورے سے خاموشی سے جنرل ضیاء الحق کو الگ تھلگ کرنے اور اکثر سیاسی جماعتوں کو ایک جگہ جمع کر کے جنرل ضیاء کی فوجی حکومت کے خلاف ایک نیا اور مضبوط سیاسی اتحاد بنانے کے سلسلے میں کوشاں تھیں اور منصوبہ بندی کر رہی تھیں' اس سلسلے میں وہ سب سے پہلے اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے پی پی کے خلاف بنائے گئے سیاسی اتحاد ''پی این اے'' کے ایک اہم رہنما نوابزادہ نصر اللہ خان کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ نیا اتحاد بنانے میں پردے کے پیچھے نوابزادہ نصر اللہ خان اور پی پی کے رہنما پیار علی الانا کا بڑا اہم کردار ہے' اس سلسلے میں اکثر ابتدائی خفیہ میٹنگیں پیار علی الانا کے گھر پر ہوتی رہیں جب چند سیاسی جماعتوں میں یہ اتحاد بنانے کے بارے میں اتفاق ہو گیا تو اس سلسلے میں پہلا اجلاس 6 فروری 1981ء کو بیگم نصرت بھٹو کی رہائش گاہ 70 کلفٹن پر بیگم صاحبہ کی صدارت میں ہوا جس میں ایم آر ڈی کے نام سے مارشل لاء حکومت کے خاتمے اور جمہوریت کی بحالی کے لئے اتحاد بنانے کا اعلان کیا گیا۔

یہ ایک الگ کہانی ہے کہ یہ اتحاد بنانے اور اس اتحاد میں ایسی سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کو شامل ہونے کے لئے مدعو کیا گیا تھا جن میں سے اکثر ذوالفقار علی بھٹو کی عوامی جمہوری حکومت کا تختہ الٹنے اور بھٹو کو پھانسی چڑھانے کی سازش کا حصہ تھے' ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کے لئے محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنے جذبات کو کس حد تک دبانا پڑا ہوگا؟ اس سے بھی زیادہ بیگم نصرت بھٹو کی برداشت اور تدبر واقعی بے مثال ہے جنہوں نے یہ جتھابندی کی اور ان رہنماؤں کی

میزبانی کے لئے تیار ہوئیں۔ 6 فروری 1981ء کو جو رہنما 70 کلفٹن میں اکٹھے ہوئے ان میں نوابزادہ نصر اللہ خان' خواجہ خیر الدین' معراج محمد خان' فتح یاب علی خان' آزاد جموں وکشمیر کے رہنما سردار عبدالقیوم خان شامل تھے۔ اس اجتماع کی پریس کوریج کے لئے کراچی کے پریس رپورٹر اس وقت وہاں موجود تھے ان میں راقم بھی شامل تھا مجھے جہاں تک یاد ہے اس اجلاس میں جے یو آئی کے اس وقت کے سربراہ مولانا مفتی محمود بھی شامل تھے جو بعد میں جلد ہی انتقال کر گئے' ہمیں یاد ہے کہ اس وقت بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ محترمہ بے نظیر بھٹو بھی موجود تھیں' ان کے اس اجتماع کے بارے میں چہرے کے جذبات آسانی سے پڑھے جاسکتے تھے' ان کے لئے یہ سب کچھ دیکھنا ناقابل برداشت محسوس ہو رہا تھا' آخر کار ایک بار محترمہ بیگم نصرت بھٹو کو بے نظیر بھٹو کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا پڑا کہ ''پنکی'' تم اندر جاؤ' اس تاریخی اجتماع میں ایم آر ڈی بنانے کا اعلان کیا گیا' اس اعلان کے چند دنوں کے بعد سردار عبدالقیوم اس اتحاد سے الگ ہو گئے اور جنرل ضیاء الحق کے اتحادی بن گئے مگر بیگم نصرت بھٹو اس ایک رہنما کی علیحدگی سے دلبرداشتہ نہیں ہوئیں مگر انہوں نے سردار شیر باز مزاری' خان عبدالولی خان' ایئر مارشل اصغر خان اور عوامی تحریک جس کے سربراہ رسول بخش پلیجو تھے کی قیادت سے رابطہ کیا' ان کوششوں میں نوابزادہ نصر اللہ خان نے بھرپور کردار ادا کیا۔

بیگم نصرت بھٹو اور نوابزادہ نصر اللہ خان نے ان کئی بڑے رہنماؤں کو قائل کیا کہ وہ جمہوریت کی اس جنگ میں شامل ہو جائیں' آخر کار ان میں سے اکثر رہنما ایم آر ڈی میں شامل ہونے کے لئے تیار ہو گئے لہٰذا ان رہنماؤں کا ایک توسیعی اجلاس ایک بار پھر 70 کلفٹن پر ہوا جس میں اور رہنماؤں کے علاوہ ایئر مارشل اصغر خان بھی شامل تھے یہاں اس بات کا ذکر کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ اجلاس کے بعد سارے رہنماؤں نے اکٹھے کھانا تناول کیا جس کا اہتمام بیگم نصرت بھٹو نے کیا تھا' اس اجلاس میں اور بعد میں کھانے کی میز پر بیگم نصرت بھٹو نے خاص طور پر ایئر مارشل اصغر خان کو کیسے برداشت کیا یہ واقعی بیگم بھٹو کی برداشت کا امتحان تھا۔ اجلاس کے

دوران اور کھانے کے دوران بیگم نصرت بھٹو اپنے دل پر جبر کر کے ایک اچھے میزبان کے طور پر ان کو پیش آتی رہیں مگر بعد میں نوکروں نے بتایا کہ رات کو بیگم نصرت بھٹو نے وہ سارے برتن منگوائے جن میں اصغر خان نے کھانا کھایا تھا' بیگم صاحبہ نے انتہائی نفرت سے وہ سارے برتن ایک ایک کر کے توڑ ڈالے۔ اتنے اہم رہنماؤں کی طرف سے ایم آر ڈی میں شامل ہونے پر جنرل ضیاء الحق کے حوصلے اتنے پست ہوئے کہ 21 فروری 1981ء کو ایم آر ڈی کے اکثر رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا' دوسری طرف ایم آر ڈی نے جنرل ضیاء الحق کے استعفیٰ کا مطالبہ کرتے ہوئے 23 مارچ 1981ء کو ملک بھر میں ہڑتال کا اعلان کر دیا۔

2 مارچ 1981ء کو پی آئی اے کا طیارہ ہائی جیک کر کے کابل لے جایا گیا' ہائی جیک کرنے والوں نے پاکستان کی جیلوں میں قید 55 سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کا مطالبہ کر دیا حالانکہ بے نظیر بھٹو نے ہائی جیکنگ کے اس واقعہ کی مذمت کی' اس کے باوجود جنرل ضیاء الحق نے ہائی جیکنگ کے اس واقعہ کو ایم آر ڈی کے خلاف استعمال کیا' فقط مارچ 1981ء میں ملک بھر سے ایم آر ڈی کے چھ ہزار رہنما اور کارکن گرفتار کر لئے گئے' ذوالفقار علی بھٹو کے سینئر وکیل اور پاکستان کے سابق اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کو ایک فوجی عدالت نے پانچ سال کے لئے قید سخت کی سزا سنائی' اسی دوران محترمہ بے نظیر بھٹو کو سکھر سینٹرل جیل میں نظر بند کر دیا گیا' اس وقت سندھ اور خاص طور پر سکھر میں گرمیاں عروج پر تھیں' مگر بے نظیر بھٹو کی ہمت فولاد کی طرح مضبوط تھی اور ان کے پاؤں نہیں ڈگمگائے' بے نظیر بھٹو کو بچپن سے ناک کی تکلیف تھی' سکھر سینٹرل جیل میں سخت گرمی سے خون بہنے لگا لہٰذا انہیں فوری طور پر آپریشن کے لئے کراچی اسپتال لایا گیا اور آپریشن کے بعد انہیں واپس سکھر جیل لایا گیا' کچھ عرصے کے بعد بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو جیلوں سے نکال کر کراچی میں ان کی رہائش گاہ پر نظر بند کر دیا گیا' بیگم نصرت بھٹو کو کینسر کی بیماری کی وجہ سے لندن میں علاج کے لئے بیرون ملک جانے کی اجازت دی گئی۔

راقم کو وہ دن اچھی طرح یاد ہے' 70 کلفٹن سے ہوائی اڈے جانے کے لئے باہر نکلتے

وقت نہ فقط صحافی' پی پی کارکن مگر کئی سینئر پی پی رہنما 70 کلفٹن کے مین گیٹ کے باہر جمع ہو گئے تھے ان میں سندھ پی پی کے صدر غلام مصطفیٰ جتوئی بھی شامل تھے' وہاں کھڑے اکثر صحافیوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ گاڑی میں 70 کلفٹن سے باہر نکلنے پر بیگم نصرت بھٹو نے جتوئی صاحب سے بات کرنا کیوں مناسب نہیں سمجھا جبکہ وہ کھڑے تھے کہ بیگم نصرت بھٹو کی گاڑی ان کے پاس پہنچنے پر وہ گاڑی کھڑی کرا کے کھڑکی سے ان سے بات کریں گی' مگر گاڑی جتوئی صاحب کے پاس پہنچنے پر انہوں نے گاڑی کا شیشہ اوپر چڑھا دیا اور جتوئی سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا' اس مرحلے پر جتوئی کے ہاتھ میں سفید کاغذ کی چٹھی نظر آئی' شاید ان کو بھی اندیشہ تھا کہ بیگم بھٹو ان سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھیں گی لہٰذا وہ پہلے سے ایک چٹھی لکھ کر ہاتھ میں لئے کھڑے تھے جب بیگم بھٹو نے جتوئی سے بات نہیں کی اور نہ ان سے چٹھی لی تو جتوئی نے دوسری کھڑکی جس کا شیشہ کھلا ہوا تھا کے پاس بیٹھی ہوئی بیگم بھٹو کی بھانجی کو یہ چٹھی تھما دی' اس سے اکثر صحافیوں نے یہ تاثر لیا کہ بیگم بھٹو شاید جتوئی کے کچھ ''رویوں'' کی وجہ سے ان سے ناراض تھیں مگر جتوئی فوری طور پر دوسری گاڑی میں بیٹھے اور بیگم بھٹو کی گاڑی کے پیچھے ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس طرح صحافیوں اور دوسرے پی پی رہنماؤں نے بھی اپنی گاڑیاں ان گاڑیوں کے پیچھے دوڑا دیں۔ ہوائی اڈے پر بھی ایک عجیب منظر نظر آیا' پر جوش اور دکھی پی پی کارکن اس راستے پر سو گئے تھے اور رو رو کر جذباتی نعرے لگا رہے تھے' اس وجہ سے بیگم نصرت بھٹو کو ہوائی اڈے کے دروازے میں ویل چیئر کے ذریعے داخل ہونے میں سخت دشواری ہو رہی تھی جبکہ بیگم بھٹو کی گرتی ہوئی صحت کا تقاضا تھا کہ ان کی ویل چیئر جلد سے جلد ہوائی اڈے کی عمارت میں داخل ہو جائے' اس موقع پر غلام مصطفیٰ جتوئی نے کسی سے چھڑی لی اور اس کو چاروں طرف گھما کر بیگم بھٹو کے لئے راستہ صاف کیا' اس طرح بیگم بھٹو کے لئے جتوئی کے احترام اور لگاؤ کا اظہار ہو رہا تھا۔ اطلاعات کے مطابق لندن پہنچنے پر بیماری کی اس حالت میں بھی بیگم بھٹو اہم سیاسی اقدامات لینے سے نہیں رکیں اور اس مرحلے پر انہوں نے کسی طرح مزدور کسان پارٹی کے سربراہ افضل بنگش سے

ملاقات کی اور دونوں رہنماؤں نے ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لئے مل کر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپریل 1983ء میں جب پی پی کے کچھ رہنماؤں نے جنرل ضیاء سے ان کے سندھ کے دورے کے دوران ملاقات کی تو محترمہ بے نظیر بھٹو نے اس کا سخت نوٹس لیا اور پارٹی کے سیکریٹری جنرل کو ٹیلی فون پر ہدایات دیں کہ ان سب رہنماؤں کو پی پی سے نکال دیا جائے۔ جب وہ ٹیلی فون پر یہ بات چیت کر رہی تھیں تو ٹیلی فون کی لائن کاٹ دی گئی اور بعد میں ان کے ملاقاتیوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔

5 جولائی 1983ء کو ایم آر ڈی کی طرف سے ملک بھر میں یوم سیاہ منایا گیا' اس مرحلے پر ملک بھر میں احتجاجی جلوس نکالے گئے اور کئی پی پی کارکنوں کو گرفتار کیا گیا' اگست 1983ء کے دوران ایم آر ڈی نے لاہور سے احتجاج شروع کر دیا اس سلسلے میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے پارٹی کارکنوں کے نام ایک خط لکھا اور تحریک بہت زور پکڑ گئی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق 14 سے 21 اگست تک ملک بھر سے 715 پارٹی کارکن گرفتار کیے گئے' 15 اگست کو سندھ پی پی کے صدر غلام مصطفیٰ جتوئی نے کراچی میں ایک بہت بڑے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے کئی سو کارکنوں کے ساتھ ریگل چوک پر گرفتاری پیش کی' اس کے بعد سندھ میں ہر ضلع ہیڈ کوارٹر میں پی پی رہنماؤں نے جن میں کئی فیوڈلسٹ بھی تھے جو کبھی بھی جیل نہیں گئے تھے' لوگوں کے جلوس میں اہم چوکوں پر پہنچ کر گرفتاری پیش کی' مثال کے طور پر میر اعجاز علی تالپور نے ٹنڈو محمد خان سے ایک بڑے جلوس کی قیادت کی اور حیدر آباد میں گرفتاری پیش کی' یہ ایسی صورتحال پیدا ہوگئی کہ سندھ میں پی پی کے زمیندار پی پی رہنماؤں میں گرفتاری پیش کرنے کے سلسلے میں ایک قسم کی ریس شروع ہوگئی' مثال کے طور پر جتوئی کے آبائی ضلع مورو کے جتوئی کے مخالف سیاستدان جمالیوں نے بھی ایک بہت بڑے جلوس کی قیادت کرنے کے بعد ان کے رہنماؤں نے مورو میں گرفتاری پیش کی' اس کے مقابلے میں غلام مصطفیٰ جتوئی کے بڑے بیٹے غلام مرتضیٰ جتوئی کی قیادت میں ایک انتہائی بڑا جلوس نکالا گیا مگر پولیس غلام مرتضیٰ جتوئی کو گرفتار نہ کر سکی' بعد میں غلام مرتضیٰ جتوئی

روپوش ہو گئے اور کسی طرح ملک سے باہر جانے میں کامیاب ہو گئے اور لندن پہنچ گئے۔

23 اگست کو ضلع لاڑکانہ کے مقام قمبر میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا جس کے شرکاء نے قمبر کی جیل پر حملہ کر دیا اور 47 قیدیوں کو رہا کرا کے مظاہرین ساتھ لے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو جب تک جیل میں قید رہے تب تک بھٹو بیگمات کو مارشل لاء حکومت کے ہاتھوں کئی اور مشکلات اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا جن کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ بات بھی تاریخ کا حصہ رہے گی کہ ذوالفقار علی بھٹو اتنے لمبے عرصہ تک ایوب خان کی حکومت کے ساتھ مختلف وزارتوں کے انچارج کی حیثیت میں منسلک رہے، خاص طور پر پاکستان کے ایک اہم وزیر خارجہ رہے، بعد میں وہ ایک خاص عرصے تک پاکستان کے مختارِ کُل وزیر اعظم رہے مگر اس سارے عرصے کے دوران وہ اسلام آباد میں اپنے خاندان کے لئے کوئی عمارت تعمیر کرا سکے نہ خرید سکے۔ لہٰذا جب ذوالفقار علی بھٹو پنڈی جیل میں تھے تو بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو روزانہ جیل میں بھٹو صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے اسلام آباد یا راولپنڈی میں رہائش کے لئے کسی مکان کی ضرورت پڑی، اس مرحلے پر ان کے لواحقین اور پارٹی رہنماؤں کی طرف سے اسلام آباد یا راولپنڈی میں کرایہ پر بھٹو خواتین کے لئے گھر کی تلاش شروع ہوئی، پتہ چلا کہ مارشل لاء حکومت کی ہدایات کے تحت بیوروکریسی اور ایجنسیوں کی طرف سے ایسے مکانات کے مالکان کو سختی سے روک دیا گیا تھا کہ بھٹو خواتین کو رہائش کے لئے کرایہ پر بھی گھر فراہم نہ کیا جائے، یہ عرصہ بھٹو بیگمات کے لئے بڑی پریشانی میں گزرا، اس مرحلے پر خاص طور پر پی پی کی وفادار کارکن اور ممتاز وکیل مس آمنہ پراچا اور بھٹو خاندان کے دوست ڈاکٹر ظفر نیازی اور ان کی بیٹیوں نے دن رات ایسا گھر تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ان کو مکمل ناکامی ہوئی، آخر کار بقول مس آمنہ پراچا کے ڈاکٹر ظفر نیازی نے اپنے کسی عزیز کا گھر خالی کرا کے بھٹو بیگمات کے حوالے کیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے خلاف خاص طور پر سندھ کے عوام میں جوغم و غصہ تھا اور ساتھ ہی جس طرح سندھ پی پی کے زمیندار رہنما بھی جلوسوں کی قیادت کر کے

گرفتاریاں پیش کر رہے تھے اس کے نتیجے میں سندھ بھر میں عام لوگوں کا ردِعمل اس حد تک بڑھا کہ وہ تشدد اور جارحیت پر اتر آئے اور ہر جگہ ان کا ٹارگٹ جیل، پولیس اسٹیشن اور ریلوے اسٹیشن و دیگر سرکاری عمارتیں تھیں، کئی مقامات پر عام لوگوں نے پولیس پر بھی حملے کیے جس کے نتیجے میں کئی اموات ہوئیں، اس مرحلے پر اس احتجاج میں عوامی تحریک جس کے سربراہ رسول بخش پلیجو تھے مگر اس وقت جیل میں تھے، کی بجائے عوامی تحریک کے دوسرے اہم رہنما فاضل راہو نے اس تحریک میں انتہائی اہم کردار ادا کیا، اگر یہ کہا جائے کہ فاضل راہو کی قیادت میں عوامی تحریک نے سندھ میں ایم آر ڈی احتجاج میں Catalist Agent کا کردار ادا کیا تو بلا جواز نہیں ہوگا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ سندھ نے فوجی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف بغاوت کر دی ہے، پنجاب میں پولیس تحریک کو کسی حد تک کچلنے میں کامیاب ہوگئی تھی، یہ صورتحال پیدا ہونے کے بھی کئی ٹھوس اسباب تھے، فوجی اسٹیبلشمنٹ کو پتہ تھا کہ پنجاب کے نچلے طبقے کے عوام اور پارٹی کارکنوں میں نہ فقط بے پناہ سیاسی شعور ہے بلکہ بے حد نڈر بھی ہیں، اسٹیبلشمنٹ کو یہ اچھی طرح پتہ تھا کہ پنجاب کے نچلے طبقے کے لوگوں کا بھٹو صاحب کے ساتھ کس حد تک لگاؤ تھا، لہٰذا جب تک بھٹو صاحب جیل میں رہے حکومت پنجاب بھر میں چن چن کر ان سیاسی کارکنوں کو گرفتار کرتی رہی جن میں Militancy عروج پر تھی لہٰذا جب بھٹو صاحب کی پھانسی کا وقت آیا تو اکثر جیالے اور پرجوش سیاسی کارکن جیل میں تھے جن میں ایک بڑی تعداد کو لاہور قلعے کی تشدد کرنے والی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا تھا اور ایک بڑی تعداد کو فوجی عدالتوں سے دس دس سال تک سخت قید کی سزا دی گئی تھی مگر پنجاب اور خیبر پختونخواہ میں تحریک کے اتنے زور سے نہ ابھرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ جو پارٹیاں ایم آر ڈی کا حصہ تھیں وہ اپنا مطلوبہ کردار ادا کرنے کے بجائے آہستہ آہستہ خاموش ہوگئیں مگر ان صوبوں کے بھی بائیں بازو کے گروپوں نے اپنا کردار ضرور ادا کیا، اسی دوران بے نظیر بھٹو علیل ہوگئیں اور 20 جنوری 1984ء کو وہ علاج کے لئے ملک سے باہر چلی گئیں۔

پی پی کارکنوں کی قربانیاں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں، 5 نومبر 1984ء کو پی پی کے ایک

دلیر کارکن ناصر بلوچ اور اس کے تین اور ساتھیوں کو فوجی عدالت نے سزائے موت سنائی' بعد میں جب ان کو پھانسی دی گئی تو ناصر بلوچ جن کا تعلق لیاری سے تھا' پیدل چلتے ہوئے اور '' جئے بھٹو'' کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے پھانسی گھاٹ پہنچا اور پھانسی کا پھندا خود اپنے گلے میں ڈال کر انتہائی بہادری سے پھانسی چڑھ گیا' اسی بہادری کا مظاہرہ لیاری کے ایک اور بہادر کارکن ایاز سموں نے بھی کیا فوجی عدالت نے پھانسی کی سزا دی۔ ایاز سموں بھی جئے بھٹو کے زوردار نعرے لگاتے ہوئے اور دوڑتے ہوئے پھانسی گھاٹ پر چڑھ گئے اور پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں خود ڈالا اور پھانسی چڑھ گئے' اسی دوران جنرل ضیاء الحق نے ایک بار پھر عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا مگر ایم آر ڈی کی مرکزی کمیٹی نے عام انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا' اس سے قبل ہی محترمہ بےنظیر بھٹو علاج کے لئے بیرون ملک روانہ ہوگئی تھیں' ان کی بہن صنم بھٹو بھی ان کے ہمراہ تھیں' لندن میں ٹھہرنے کے دوران بےنظیر بھٹو نے پاکستان میں سیاسی قیدیوں کا سوال اٹھایا' بعد میں بےنظیر بھٹو امریکا کے دورے پر گئیں جہاں انہوں نے کانگریس اور سینیٹ کے ممبران سے ملاقاتوں کے دوران پاکستان میں انسانی حقوق کا مسئلہ زوردار انداز میں اٹھایا' بعد میں وہ لندن لوٹ آئیں اور لندن کو ہی اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا' بےنظیر بھٹو لندن میں تھیں تو ملک بھر میں اور خاص طور پر سندھ میں ایم آر ڈی تحریک انتہائی زوردار انداز میں جاری تھی' اس دوران بیگم نصرت بھٹو بھی علاج کی خاطر ملک سے باہر تھیں' اس وقت لندن میں پی پی کے اکثر سینئر رہنما بھی موجود تھے ان میں عبدالحفیظ پیرزادہ' غلام مصطفیٰ کھر' ممتاز بھٹو وغیرہ قابل ذکر ہیں' پی پی کے اتنے رہنما لندن میں جمع ہوگئے کہ محترمہ بےنظیر بھٹو کی سربراہی میں پی پی اوورسیز کی مرکزی کمیٹی تشکیل دی گئی' ان دنوں کراچی' پاکستان سے پی پی کے رہنما پیار علی الانا کا بھی لندن جانا ہوا' لندن سے واپسی پر ملاقات میں الانا نے کچھ بڑی دلچسپ باتیں بتائیں' انہوں نے بتایا کہ ان کی موجودگی میں پی پی اوورسیز کی مرکزی کمیٹی کا ایک اجلاس لندن میں محترمہ بےنظیر بھٹو کی صدارت میں ہوا جس میں انہوں نے بھی خصوصی دعوت پر شرکت کی۔

الانا نے بتایا کہ اجلاس میں اکثر پی پی رہنماؤں کا ایک ہی بات پر زور تھا کہ پاکستان میں ایم آر ڈی کی تحریک بڑی زوروں پر ہے اگر محترمہ بے نظیر بھٹو فوری طور پر ملک واپس جائیں اور تحریک کی قیادت کریں تو چند مہینوں میں جنرل ضیاء کی حکومت گرائی جا سکتی ہے۔ الانا نے کہا کہ یہ سب کچھ سن کر انہیں بڑی حیرت ہوئی کیونکہ محترمہ بے نظیر بھٹو ابھی زیر علاج تھیں ان کا ملک واپس جانا ان کے لئے نقصان دہ بھی ہوسکتا تھا لہٰذا موقع کی نزاکت سے انہوں نے اپنی بات رکھی اور کہا کہ پارٹی کا یہ فیصلہ ہے کہ ملک کے اندر پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا فیصلہ باقی ساری مرکزی کمیٹیوں کے لئے ماننا لازمی ہے' یہ پاکستان کی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا فیصلہ ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو تب تک ملک واپس نہ آئیں جب تک ملک کی سینٹرل کمیٹی کوئی ایسا فیصلہ نہ کرے' اس کے برعکس الانا نے کہا کہ پارٹی کے دوسرے کسی بھی رہنما کے بارے میں پاکستان کی پی پی سینٹرل کمیٹی نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا لہٰذا وہ سب کے سب ابھی اور اسی وقت ملک چلیں اور اپنے اپنے علاقوں میں ایم آر ڈی کی تحریک کی قیادت کریں۔ الانا نے بتایا کہ انہوں نے یہ کیا بات کی کہ سارے اجلاس میں خاموشی چھا گئی اور پھر اس موضوع کا ذکر بھی نہیں کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ اس کے بعد انہیں شک ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے جس کی وجہ سے ہر ایک کا زور اس بات پر تھا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو فوری طور پر ملک واپس لوٹیں۔ دوسری طرف سندھ بہت گرم ہو گیا تھا' روزانہ سندھ کے اکثر شہروں اور گاؤں میں پی پی کے مشتعل کارکنوں کے جلوس نکلتے جن کا ٹکراؤ پولیس سے ہوتا یا مشتعل مظاہرین پولیس اسٹیشنوں اور دیگر سرکاری عمارتوں کو نشانہ بناتے' یہاں بھی ایک دلچسپ صورتحال تھی' یہ پہلی بار ہوا تھا کہ پارٹی کے اہم رہنما جن میں اکثریت زمینداروں کی تھی جنہوں نے کبھی جیل کا رخ بھی نہیں کیا تھا، نے سب سے پہلے گرفتاریاں پیش کیں لہٰذا تمام قیادت جیلوں میں چلی گئی اور مظاہروں اور جلوسوں کی قیادت عام لوگ کر رہے تھے یہ سندھ کی سیاست کا ایک نیا رخ تھا' اس ایشو پر بھی سندھ کے اندر کئی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ وڈیروں کا سب سے پہلے جیل جانا ان کی قربانی کے جذبے کی نشاندہی کرتا ہے یا یہ بھی کسی

سازش کا حصہ ہے! کہ زمینداروں اور وڈیروں نے تو قربانی دی مگر عوام کچھ نہ کر سکے اگر یہ سوچ درست تھی تو بھی عام کارکنوں نے وہ غلط ثابت کر دکھایا' نہ فقط سندھ کی تاریخ میں بلکہ میرے خیال میں دنیا بھر میں یہ پہلی بار ہوا کہ قیادت کی غیر موجودگی کے باوجود عام کارکنوں اور عام لوگوں نے انتہائی بہادری اور دانائی سے یہ تحریک چلائی' اس کی کئی مثالیں ہیں' ایسے ایک واقعہ کا راقم بھی عینی گواہ ہے' میں اس وقت ایک قومی انگریزی اخبار سے منسلک تھا اور حیدر آباد میں رپورٹنگ کرتا تھا ان دنوں حیدر آباد شہر کے اردگرد گاؤں کے لوگ جو بھٹو صاحب سے عشق کرتے تھے اور ان کی پھانسی کی وجہ سے انتہائی غمزدہ تھے مختلف جتھوں کی شکل میں چھپ چھپا کر بسوں اور ویگنوں کے ذریعے حیدر آباد پہنچتے اور تین' تین' چار چار کے جتھوں میں سول اسپتال سے امریکن لائبریری تک پیدل مارچ کر کے دفعہ 144 کی خلاف ورزی کرتے تھے' راستے میں پولیس ان پر لاٹھی چارج بھی کرتی تھی اور پکڑ کر گرفتار بھی کر لیتی تھی۔

ایک دن چند مشتعل لوگ جذباتی انداز میں جئے بھٹو کا نعرہ لگاتے ہوئے تلک چاڑی اور سرے گھاٹ کے موڑ پر پہنچ گئے یہاں پولیس نے ان پر زوردار لاٹھی چارج شروع کر دیا جس کی وجہ سے کوئی کس طرف تو کوئی کس طرف بھاگا' گاؤں کے دو بزرگ جنہوں نے پٹکے پہنے ہوئے تھے سرے گھاٹ کی طرف بھاگنے لگے اتنے میں سرے گھاٹ کی طرف جانے والے بازار کے دو آمنے سامنے کی دکانوں سے دو دکاندار نیچے اترے اور ایک نے ایک بزرگ کو دھکا دیکر روڈ پر لٹا دیا تو دوسرے نے دوسرے بزرگ کو دھکا دیکر نیچے روڈ پر گرا دیا جس کی وجہ سے دونوں کے پٹکے اتر کر دور جا پڑے' یہ منظر ہم اخباری رپورٹر دور سے دیکھ رہے تھے' یہ منظر دیکھ کر سرے گھاٹ کے بازار کے دکاندار قہقہے مار کر اور تالیاں بجا کر ان گاؤں کے دو بزرگوں کا مذاق اڑا رہے تھے' اس مرحلے پر دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے ایک دوسرے کو اشارے میں کہا کہ ان دکانداروں کو کچھ نہیں کہنا ہمارا ہدف پولیس اور سرکاری عمارتیں ہیں' یہ کتنی بڑی دانائی تھی اگر اس وقت یہ گاؤں کے بوڑھے حیدر آباد کے ان دکانداروں سے الجھ

پڑتے تو ایم آر ڈی احتجاج کا رخ تبدیل ہو جاتا اور حیدرآباد میں نسلی فسادات پھوٹ سکتے تھے' اسی دوران ضلع نواب شاہ میں سکرنڈ اور قاضی احمد کے درمیان قومی شاہراہ پر ایک انتہائی افسوسناک واقعہ پیش آیا' یہ وقعہ 29 ستمبر 1983ء کو پیش آیا' ان دنوں جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت نے ملک میں بلدیاتی انتخابات کرانے کا اعلان کیا ہوا تھا جبکہ ایم آر ڈی نے ان انتخابات کے خلاف 29 ستمبر 1983ء کو یوم احتجاج منانے کا اعلان کیا تھا' اس دن اس علاقے میں پی پی کے بڑے حمایتی پنہل خان چانڈیو' اس کا بڑا بیٹا شہید غلام عباس چانڈیو سینکڑوں پی پی کارکنوں کے ساتھ سکرنڈ اور رقاضی احمد کے درمیان قومی شاہراہ پر جمع ہو گئے اور شاہراہ پر ٹریفک بند ہو گئی' ان لوگوں نے پہلے جلوس نکالا اور جئے بھٹو کے نعرے لگائے' بعد میں قومی شاہراہ پر بیٹھ گئے اور قرآن شریف کی تلاوت کرنے لگے' اس مرحلے پر ڈیوٹی پر پولیس ایس ایچ او غلام مصطفیٰ چانڈیو متعین تھا' اس نے پنہل خان چانڈیو اور دوسرے رہنماؤں سے مذاکرات کیے اور باہمی طور پر طے ہوا کہ اجتماع ایک خاص وقت تک شاہراہ پر بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت کر کے اس کا ثواب جناب ذوالفقار علی بھٹو کی روح کو ارسال کریگا' اس کے بعد مظاہرین شاہراہ کو خالی کر دیں گے' اجتماع کے شرکاء قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف تھے تو قاضی احمد کی طرف سے بکتر بند گاڑیوں میں فوجی آ گئے' آتے ہی انہوں نے اندھا دھند گولیاں چلا دیں اور کچھ لوگوں پر بکتر بند گاڑیاں بھی چڑھا دیں۔

دریں اثناء سکرنڈ کی طرف سے پولیس نے بھی اکا دکا فائرنگ کر دی۔ اطلاعات کے مطابق قرآن شریف کی تلاوت کرنے والے اس اجتماع پر کوئی 2 سے ڈھائی گھنٹے تک دونوں طرف سے فائرنگ ہوتی رہی اور بکتر بند گاڑیاں بھی لوگوں پر چڑھائی جاتی رہیں' دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ اجتماع مکمل طور پر پرامن تھا' کسی کے ہاتھ میں بندوق اور چاقو تو کیا کوئی لاٹھی بھی نہیں تھی' اس حملے میں تقریباً 17 پرامن اور خالی ہاتھ شہری شہید ہو گئے جبکہ تقریباً 52 افراد زخمی ہوئے' ان سب زخمیوں اور شہیدوں کو نواب شاہ کے سول اسپتال لایا گیا جس کے لئے باقاعدہ کلیئرنس لی

گئی‘ اس حملے میں غلام عباس چانڈیو بھی زخمی ہو گئے جبکہ بزرگ پنہل خان چانڈیو کو ٹرو پس کی نگرانی میں آدھے کلومیٹر تک پیدل چلایا گیا جبکہ ان کی عمر 65 سال تھی‘ بعد میں پنہل خان چانڈیو کو بھی گرفتار کیا گیا‘ گرفتاری کے دوران اس بزرگ پر اتنا تشدد کیا گیا کہ بعد میں وہ دس دن تک آنکھیں جو تشدد سے سوج گئی تھیں کھول نہیں سکتے تھے‘ اس کے بعد اسے جیل بھیج دیا گیا‘ بعد میں یہ بھی اطلاعات آئیں کہ ان قیدیوں کو کئی لاکھ روپے رشوت لیکر رہا کیا گیا‘ ان دنوں حیدرآباد کے قریب ٹمیاری میں بھی ایک اہم واقعہ ہوا‘ ٹمیاری پیپلز پارٹی کے رہنما مرحوم سید فضل علی شاہ نے سیکڑوں لوگوں کے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے شاہراہ کو میلوں تک بند کر دیا‘ اس دن قومی شاہراہ کم سے کم 12 گھنٹے بند تھی‘ بعد میں سید فضل علی شاہ کو گرفتار کر لیا گیا اور کافی عرصے کراچی سینٹرل جیل اور حیدرآباد جیل میں قید رہے‘ اس عرصے کے دوران ایم آر ڈی کی اس تحریک میں سب سے زیادہ گرم دادو ضلع تھا‘ دادو ضلع میں بھی خیرپور ناتھن شاہ سب سے آگے تھا‘ کوئی دن خالی نہ تھا جب خیرپور ناتھن شاہ شہر اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں مشتعل مظاہرین شاہراہ پر جانے والی ٹریفک کو نہ روکتے اور پولیس‘ پولیس اسٹیشنوں و دیگر چھوٹی موٹی سرکاری عمارتوں پر حملہ نہ کرتے‘ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں سندھ میں خیرپور ناتھن شاہ کو سندھ کا ویت نام کہا جاتا تھا۔

اطلاعات کے مطابق ایک دو دن مظاہروں کو منتشر کرنے کے لئے ہیلی کاپٹروں سے مظاہرین پر فائرنگ بھی کی گئی‘ ان دنوں کاٹن کی بوائی کا موسم تھا‘ سندھ بھر میں کاٹن کی بوائی ہاری عورتیں کرتی ہیں۔ اطلاعات کے مطابق ہیلی کاپٹروں سے مظاہرین پر ہونے والی فائرنگ کے دوران کچھ گولیاں نزدیک ہی فصلوں میں کپاس کی بوائی کرنے والی ہاری عورتوں کو بھی جالگیں جس سے کچھ ہاری عورتیں زخمی ہو گئیں‘ اس کی وجہ سے خیرپور ناتھن شاہ‘ ضلع دادو اور سندھ بھر کے عوام میں جنرل ضیاء کی حکومت کے خلاف مزید اشتعال پھیل گیا‘ اس دور میں‘ پاکستان کے دیگر علاقوں اور خاص طور پر سندھ میں ایم آر ڈی کے تحت ہونے والے مظاہروں میں تشدد اور حکومت کے غم و

غصے کے اظہار کے بارے میں خبروں کو دبانے کے لئے حکومت کی طرف سے اخبارات پر زبردست دباؤ تھا کہ ایسی خبریں شائع کرنے سے احتراز کریں یا عوام اور سرکاری اداروں کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف ہونے والی تشدد کی کارروائیوں کو کم کر کے شائع کریں' مگر اس دور میں بی بی سی نے بڑا اہم کردار ادا کیا' ملک کے کونے کونے میں ہونے والے ایسے واقعات کی خبریں بی بی سی کے نمائندے حاصل کر لیتے تھے یا لوگ ٹیلی فون کر کے مقامی بی بی سی کے نمائندوں کو حالات سے آگاہ کرتے تھے لہٰذا بی بی سی نے ایم آر ڈی کے احتجاج کو زیادہ سے زیادہ کوریج دی اور عام لوگ بھی بی بی سی کی آٹھ بجے کی خبروں اور بعد میں نشر ہونے والا سیربین سننے کے لئے ریڈیو پر اکٹھے ہو جاتے تھے' ایم آر ڈی کے احتجاج کے تحت ملک بھر میں اور خاص طور پر سندھ میں ہونے والے ہنگاموں کے بارے میں بی بی سی سے نشر ہونے والی رپورٹوں میں سے ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ ''1983ء کے دوران جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف ایم آر ڈی کی تحریک ایک بہت بڑی بغاوت ہے''۔

سندھ میں چلنے والی اس تحریک کے بارے میں بی بی سی نے اپنی ایک رپورٹ میں اسے ریاست کے خلاف ایک بھرپور مسلح بغاوت قرار دیا' ایک مرحلے پر بی بی سی کو یہ بھی رپورٹ کرنا پڑا کہ پی پی کی قیادت میں سندھ میں شروع کی گئی ایم آر ڈی کی تحریک اس حد تک آگے بڑھ گئی ہے کہ وہ نہ فقط جنرل ضیاء الحق کی رجعت پرست آمریت کے ہاتھوں سے نکل رہی ہے بلکہ ساتھ ہی ایم آر ڈی کی قیادت کے بھی ہاتھوں سے نکل رہی ہے یہ اس وجہ سے ہوا کہ ایم آر ڈی کی قیادت ساری کی ساری جیلوں میں تھی اور اب تحریک مشتعل پی پی کارکنوں اور عام لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی تھی جو کسی طور پر بھی ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا بدلہ لینا چاہتے تھے' یہ اب تاریخ کا حصہ ہے کہ جب 14 اگست 1983ء کو ایم آر ڈی نے ضیاء الحق کی حکومت کے خلاف ملک بھر میں تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا تب سے سندھ مسلسل شدید افراتفری کا شکار رہا' ہم اگر کراچی سے بات شروع کریں تو کراچی میں نہ فقط پی پی کارکنوں اور اس کے ہمدردوں کی

طرف سے بلکہ مزدور یونینوں کے رہنماؤں اور کارکنوں اور ضیاء کے مخالف سیاسی رہنماؤں و کارکنوں کی طرف سے روزانہ کراچی میں گرفتاریاں پیش کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ کراچی کے مقابلے میں اس تحریک کے حوالے سے اصل میں سندھ کے مرکزی اور شمالی علاقے زیادہ شدید تشدد کی گرفت میں تھے' ان علاقوں میں ایم آر ڈی کی تحریک نے پاکستان کی فوج کے خلاف ایک شدید سندھی قوم پرست بغاوت کی شکل اختیار کر لی تھی' اس صورتحال پر جنرل ضیاء الحق کی حکومت کو خاص طور پر بیرونی صحافیوں کے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا جن کا موقف تھا کہ خاص طور پر سندھ میں جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت کے جواز کو شدید چیلنجوں کا سامنا ہے مگر جنرل ضیاء الحق بیرونی صحافیوں کے اس موقف کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے' وہ اس بات پر ڈٹے ہوئے تھے کہ وہ یہ ثابت کر دیں گے کہ سندھ صوبے میں ہونے والے اس تشدد میں فقط گنے چنے شر انگیز ملوث ہیں لہٰذا' مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے پریشان جنرل نے مقامی پریس پر پہلے ہی خاص پابندیاں عائد کیے جانے کے باوجود مزید سخت پابندیاں عائد کرنے کی ہدایات دیتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ سندھ کا طوفانی دورہ کر کے یہ ثابت کریں گے کہ وہ جتنے مقبول پنجاب میں ہیں اتنے ہی مقبول سندھ میں بھی ہیں لہٰذا وہ اپنے چمکتے ہوئے فوجی ہوائی جہاز سی 130 میں اپنے کچھ وزیروں' فوج کے کچھ قریبی ساتھیوں اور اپنے کچھ پسندیدہ صحافیوں کو ساتھ لیکر کراچی پہنچ گئے مگر اسے یہ بھی پتہ تھا کہ بی بی سی کے رپورٹرز کی ایک ٹیم سندھ بھر سے اس سلسلے میں حقائق پر مبنی رپورٹنگ کر رہی ہے' ضیاء الحق کا ہوائی جہاز کراچی اترا' اس کا منصوبہ یہ تھا کہ یہاں سے وہ سپاہیوں کے دستے کے ساتھ حیدر آباد جائیں گے' وہاں ان سے حکومت کے زیر کنٹرول پی ٹی وی کی ایک ٹیم کو آ کر ملنا تھا جسے جنرل صاحب کے ''کامیاب'' دورے کی کوریج کرنا تھی۔

ایک طرف جنرل صاحب اس منصوبے پر عمل کر رہے تھے دوسری طرف کراچی میں بائیں بازو کے طلباء' صحافی' ٹریڈ یونینسٹ' خواتین کے حقوق کے لئے جدوجہد کرنے والے گروپ اور سیاستدان کراچی میں احتجاجی ریلیاں نکال رہے تھے مگر جنرل کو کراچی کی اس

صورتحال کی پرواہ نہیں تھی۔ ملک بھر میں ضیاء کے مخالف اکثر سینئر سیاستدانوں کو گرفتار کرلیا گیا تھا جبکہ احتجاج کرنے والے طلباء، مزدور رہنما' صحافی یونین کے نمائندوں اور ضیاء مخالف پارٹیوں کے کارکنوں کی دوسری بڑی قیادت کو اب سرعام کوڑے مارنے کا سلسلہ شروع کر کے باقی سیاسی کارکنوں کے لئے ایک مثال پیش کی جا رہی تھی کہ ان کا بھی یہ حشر ہوسکتا ہے' جب جنرل ضیاء الحق کا جہاز کراچی کے ہوائی اڈے پر اترا تو ہوائی اڈے کے باہر خواتین گروپس کی رہنما اور کارکن جنرل ضیاء کی حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کر رہی تھیں جن کو منتشر کرنے کے لئے پولیس نے ان پر لاٹھی چارج کیا۔ دریں اثناء پروگرام کے مطابق کراچی پہنچنے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے صحافیوں کے ایک منتخب گروپ سے مختصر بات چیت کے دوران سندھ کی صورتحال کے بارے میں اپنے خیالات کو دہرایا اور زور دیکر کہا کہ سندھ میں سب ٹھیک ہے اور کہا کہ ایم آر ڈی کی تحریک چند سیاستدانوں کے ہاتھوں کا کھیل ہے جو اسلام' پاکستان اور ملک کی مسلح افواج کے خلاف کام کر رہے ہیں' وہ مطمئن تھے کہ سندھ کے ان علاقوں میں جہاں اس وقت بے آرامی ہے' اس کا دورہ کامیاب رہے گا' اس کا یہ اعتماد اس وجہ سے تھا کہ اپنے ساتھ لے آنے والے وزیر' فوجی اہلکار' کچھ مذہبی رہنما اور اپنے مشیر جنہوں نے خوشامدیوں کے ایک ٹولے کی شکل میں اس کا گھیراؤ کیا ہوا تھا اور جو کچھ وہ اسے ان کے اس دورے کے بارے میں بتا رہے تھے' ان وجوہات کی بنا پر انتہائی مطمئن ہو کر سندھ کے ان اندرونی علاقوں کے دورے پر روانہ ہو گئے جہاں شورش تھی' اسے اپنی کامیابی کا اس حد تک یقین تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ خاص طور پر دادو اور مورو جو اس شورش سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے کے دورے کے موقع پر کیمرا مین اس کے اس دورے کی تصویریں بنائیں' دوسری طرف جنرل ضیاء کی سیکورٹی ٹیم نے فیصلہ کیا کہ جنرل صاحب اس دورے میں فوجی ہیلی کاپٹر استعمال کریں گے جبکہ ان کے معاون کافی پریشان' بے چین اور حساس نظر آ رہے تھے کیونکہ تحریک کو دبانے کے لئے اب فوج نے صوبے میں سارے کے سارے گاؤں کو زمیں دوز کرنے کے لئے ٹینکوں اور بھاری اسلحہ استعمال کرنا شروع

کر دیا تھا' مورو اور دادو کے گھنے جنگلات' سیکڑوں سرگرم کارکنوں کے لئے جو ضیاء کی ٹینکوں اور گن شپ ہیلی کاپٹروں سے جان بچا کر بھاگ نکلے تھے' کے لئے پناہ گاہ بن گئے تھے' کچھ دیگر پرجوش کارکنوں نے صوبے بھر میں واقع صوفی درویشوں کے مزاروں میں جا کر پناہ لی' دوسری طرف دادو آنے کے لئے ہیلی کاپٹر شہر سے دادو پہنچنے کے بعد ابھی دادو کے ہیلی پیڈ پر اترنے ہی والا تھا کہ جنرل کے فوجی مشیروں نے جنرل کو علاقے میں فوج کی تازہ ترین ''فتوحات'' سے آگاہ کر کے خوش کرنے کی کوشش کی' اسے بتایا گیا کہ سیکڑوں شورش پسندوں اور غداروں کے ایجنٹوں کو گرفتار کیا گیا ہے یا ان کا صفایا کر دیا گیا ہے۔

مزید انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ باغیوں کو جنگلوں اور مزارات سے باہر نکال کر ان کا صفایا کرنے کا بھی منصوبہ تیار کر دیا گیا ہے' یہ سب سن کر جنرل ضیاء مزید حساس ہو گیا' سندھ کے اکثر بااثر پیر اس کے خلاف تھے' ان میں خاص طور پر مخدوم آف ہالا مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ شامل تھے لہٰذا جنرل نے سندھ کے دوسرے بااثر پیر' پیر پگارا سے رابطہ کیا اور اس سے مدد مانگی کہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سندھ کے مزارات سے سندھی باغیوں کو بیدخل کیا جائے' پگارا نے اس سلسلے میں کوشش کی مگر وہ اس مشن میں کامیاب نہ ہو سکے' ستمبر 1983ء کی ایک شام کو عوام نے پی ٹی وی کی 9 بجے کی خبروں کے بلیٹن میں ایک ویڈیو کلپ دیکھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ دادو کے ایک مقام پر جنرل ضیاء فوجی ہیلی کاپٹر سے نیچے اتر رہے ہیں اور نیچے ایک درجن کے قریب نوجوان سندھی ٹوپیاں پہنے اس کا استقبال کر رہے ہیں' ناظرین کو بتایا گیا کہ سندھ کے دورے کے دوران محبِّ وطن سندھی جنرل ضیاء کا پرتپاک استقبال کر رہے ہیں' یہ سب کچھ دیکھ کر جنرل ضیاء خوشی سے چہک رہے تھے مگر جب دوسرے دن لوگ بی بی سی کی آٹھ بجے رات کی خبریں سننے بیٹھے تو بتایا گیا کہ سارا دن ضیاء کے خلاف ریلیاں نکالی گئیں' احتجاجی مارچ کیے گئے اور سارا دن مسلسل تشدد کیا گیا۔ بی بی سی اور دیگر ذرائع سے جو اس دن کے بارے میں رپورٹیں آئیں ان کے ذریعے جو منظر کشی کی گئی وہ دوسرے دن خاص طور پر کراچی پریس کلب میں جمع ہونے

والے صحافیوں کے لئے تماشے سے کم نہیں تھی' کچھ رپورٹرز کے مطابق جنرل ضیاء کو یقین تھا کہ جب ان کی گاڑیاں دادو کی روڈز پر چلیں گی تو دادو کے روڈ استقبال کرنے والے سندھیوں سے بھرے پڑے ہوں گے' مگر ہوا یہ کہ ان رپورٹس کے برعکس جب ان موٹر کاروں کا جلوس ہیلی پیڈ سے باہر نکل کر اس عمارت کی طرف بڑھنے لگا تو راستے میں ایک کتا آ کر اس تیز رفتار لیموزین سے ٹکرایا' یہ کتا کوئی عام قسم کا نہیں تھا' اس لئے کہ اس کے بدن پر سرخ رنگ کے بڑے الفاظ میں ''ضیاء الحق'' لکھا ہوا تھا' صحافی اور بی بی سی کے نمائندے جو موٹر کاروں کے اس جلوس کے پیچھے آ رہے تھے انہوں نے بھی یہ نظارہ دیکھا مگر ان کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ یہ نظارہ دیکھنے پر جنرل صاحب کا کیا ردعمل تھا' بات یہاں تک ختم نہیں ہوئی' ان صحافیوں کے مطابق جنرل ضیاء کا موٹر کاروں کا جلوس جیسے آگے بڑھا تو ایک گدھا اسے روڈ پر آگے دوڑتا نظر آیا اور چھوٹے لڑکے اس گدھے کو دوڑا رہے تھے' گدھے کے بدن پر بھی سرخ رنگ میں بڑے الفاظ میں ''ضیاء الحق'' لکھا ہوا تھا۔

اس کے بعد جنرل ضیاء کی گاڑیوں کا قافلہ آگے بڑھا' آگے ایک موڑ تھا' جنرل ضیاء کی گاڑی کے آگے ایک فوجی جیپ چل رہی تھی' فوجی جیپ اچانک رک گئی' راستے میں ایک درخت کٹا ہوا پڑا تھا' فوجی جیپ اور جنرل ضیاء کی گاڑیوں کا قافلہ رکتے ہی درخت کی شاخوں سے ایک بزرگ شخص باہر نکل آیا' وہ سندھی ٹوپی پہنے ہوئے تھا' ساتھ دھوتی (سندھی میں اسے گوڈ کہتے ہیں) بھی پہنے ہوئے تھا' جیسے ہی فوجی اس کے پیچھے دوڑے تو اس نے وہ دھوتی کھول کر اپنے ننگے بدن کی فوجیوں اور جنرل ضیاء کے سامنے نمائش کرتے ہوئے سندھی میں کہنے لگا ''بھلی کرے آیا'' (ہم آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں) بات فقط وہاں تک ختم نہیں ہوئی بلکہ دادو سے آنے والی اطلاعات کے مطابق دادو میں اور بھی کافی اہم واقعات ہوئے مگر ان کی تشہیر کو سختی سے دبا دیا گیا' ایسی ایک اطلاع کے مطابق جنرل ضیاء کی گاڑیوں کا قافلہ دادو شہر میں آگے بڑھ رہا تھا تو 20' 25 سندھیوں کا ایک گروپ جو سندھی ٹوپیاں اور دھوتی (گوڈ) پہنے ہوئے تھے کے شرکاء

اچانک دھوتیاں کھول کر گاڑیوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور ''جئے بھٹو'' کے نعرے لگانے لگے' ایک اور اطلاع ایک زیادہ سنگین واقعہ کے بارے میں ہے مگر جب دادو کے متعلقہ لوگوں سے رابطہ قائم کیا گیا تو اکثر خاموش رہے اور کچھ بھی نہ بولے' مگر ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ جنرل ضیاء کے ساتھ بہت کچھ ہوتے ہوتے رہ گیا' بہرحال چند لوگوں نے ضرور اس واقعہ کی تصدیق کی۔ان کی اطلاع کے مطابق جب جنرل ضیاء پولیس اور فوجی دستوں کے تحفظ میں اس عمارت میں پہنچے جہاں اسے دادو کے معززین سے خطاب کرنا تھا جن میں اکثریت سرکاری اہلکاروں یا ایجنسی کے لوگوں کی تھی' جنرل ضیاء بنائی گئی اسٹیج پر ان کے لئے مخصوص کرسی پر بیٹھے' ابھی تقریب شروع ہی ہونے والی تھی کہ پتہ نہیں کس طرح ایک سو کے قریب مشتعل لوگ نعرے لگاتے ہوئے پولیس کے گھیرے کو توڑتے ہوئے اس عمارت میں نہ فقط گھس گئے بلکہ جنرل ضیاء کے قریب پہنچ گئے' نعرے لگاتے ہوئے ان لوگوں کے پاس لاٹھیاں بھی تھیں' کلہاڑیاں بھی تھیں اور چند ایک کے پاس ایک آدھ بندوق اور پستول بھی تھا' وہ جنرل ضیاء کے اتنے قریب پہنچ چکے تھے کہ وہ چاہتے تو آسانی سے جنرل ضیاء کو نشانہ بنا سکتے تھے' مگر ان کا مقصد کچھ اور تھا' وہ جنرل ضیاء کو پکڑ کر اپنے ساتھ اغوا کر کے نزدیک کے پہاڑوں میں لے جا کر کسی پہاڑ کے اوپر سے پھانسی دیکر اس کی لاش پہاڑ کے اوپر سے نیچے پھینک کر ذوالفقار علی بھٹو کو پنڈی جیل میں دی گئی پھانسی کا بدلہ لینا چاہتے تھے' مگر وہ یہ سب نہ کر سکے' اس سے پہلے کہ یہ مجمع جنرل ضیاء تک پہنچتا فوجی دستے حرکت میں آ گئے اور پولیس اور رینجرز بھی پہنچ گئی' ہجوم پر فائرنگ بھی کی گئی' ڈنڈے بھی برسائے گئے' ان میں سے کئی وہیں پر مارے گئے جبکہ کئی زخمی ہوئے اور اکثر گرفتار کر لئے گئے' فقط کچھ لوگ ہی وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو سکے' یہ سب کچھ ہونے کے بعد دوسرے دن جنرل ضیاء نے سندھ کا اپنا یہ ''مشہور'' دورہ ختم کر کے واپس اسلام آباد لوٹنے کا فیصلہ کیا' سندھ کو فتح کرنے کے خواب کی تکمیل نہ ہونے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے اپنے کچھ ''دانا'' مشیروں کے مشورے سے سندھ کو ایک طریقے سے قابو میں لانے کا فیصلہ کیا' اس سلسلے میں جو پالیسی اختیار کی گئی اسے

Gold and Guns پالیسی کہا جا سکتا ہے' سندھ کے عوام اور خاص طور پر نوجوانوں کو شروع سے ہی شکایت تھی کہ انہیں وفاقی حکومت' وفاقی اداروں تو کیا خود سندھ حکومت کے مختلف محکموں اور اداروں میں بھی افسران کے طور پر مقرر کرنا تو درکنار عام قسم کی ملازمتیں بھی فراہم نہیں کر رہی تھی لہٰذا تیار کی گئی نئی پالیسی کے تحت سندھ کے سارے ڈویژنل کمشنروں کو احکامات جاری کیے گئے کہ وہ اخبارات میں اشتہارات دیکر نوجوانوں کو انٹرویوز کے لئے بلائیں اور انہیں مختلف کیٹگریوں کی ملازمتیں فراہم کی جائیں' اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا کیا گیا اور سینکڑوں نوجوانوں کو ایسی ملازمتیں ملیں مگر اس قدم سے بھی حکومت مطلوبہ نتائج حاصل نہ کر سکی کیونکہ سندھ کے عوام بھٹو کی پھانسی کو نہیں بھولے تھے وہ یہ جرم کسی طور پر بھی جنرل ضیاء کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھے' جنرل ضیاء بدستور سندھ کے عوام کے لئے قابل نفرت اور ان کے ولن رہے۔

بہرحال نئی پالیسی کے Guns والے دوسرے حصے کے تحت جو اقدامات کیے گئے اس کے نتائج انتہائی خطرناک نکلے اور ان منفی نتائج کو سندھ کے مختلف حلقے ابھی تک بھگت رہے ہیں' اس پالیسی کے تحت جنرل ضیاء کی حکومت نے اپنی ایجنسیوں کے ذریعے جنگلات میں چھپے ہوئے ڈاکو (جسے سندھ میں دھاڑیل) کہتے ہیں سے رابطہ قائم کیا' ان کو اسلحہ بھی فراہم کیا گیا اور ان کی مختلف طریقوں سے سرپرستی کی گئی' یہ جو کہا جاتا ہے کہ منفی اقدامات کے نتائج بھی ہمیشہ منفی نکلتے ہیں' اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدائی طور پر اس ڈاکو فیکٹر نے سندھ کے وسیع دیہاتی علاقوں میں بدامنی کی انتہا کر دی' لوگ راتوں کو سو نہیں سکتے تھے' ایسے علاقوں میں رہنے والے اکثر لوگوں کو یہ علاقے چھوڑ کر نزدیک کے ٹاؤنز اور شہروں کو بسانا پڑا' دیکھا جائے تو حکومت کے اس منفی اقدام کا سندھ کے حوالے سے اس طرح مثبت نتائج نکلے کہ سندھ کے لوگ urbanise ہونا شروع ہو گئے' حالانکہ ذوالفقار علی بھٹو نے 70ء کی دہائی میں سندھ کے دیہاتی لوگوں کو شہری کلچر اپنانے کے لئے ایگروول کے نام سے ایک اسکیم شروع کی تھی مگر سندھ کے لوگ اپنے صدیوں سے رہائش پذیر جھونپڑیوں اور ٹوٹے پھوٹے گھروں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوئے مگر اس

منفی قدم کا ایک منفی نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکو اب شیر ہو گئے تھے انہوں نے پنجاب اور سندھ سے سامان سے لدے ٹرکوں کو راستے میں روک کر لوٹنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے خاص طور پر پنجاب کے مختلف شہروں کے بیوپاری بہت پریشان ہوئے۔ جنرل ضیاء کی اس سندھ دشمن پالیسی کے تحت ایک قدم یہ اٹھایا گیا کہ کراچی اور حیدرآباد میں نسلی سیاست کرنے والی تنظیموں کو نہ فقط وجود میں لایا گیا بلکہ ان کی مختلف انداز میں حوصلہ افزائی کی گئی جس کے نتیجے میں خاص طور پر کراچی' حیدرآباد' سکھر' میر پور خاص وغیرہ میں نسلی فسادات تھوڑے تھوڑے عرصے بعد پھوٹ پڑتے تھے' نسلی سیاست کا یہ جو پودا سندھ کے شہروں میں لگایا گیا اب یہ شہر نسلی سیاست کے جنگل بن چکے ہیں اور ان فسادات میں اب تک پتہ نہیں کتنے معصوم لوگ جن میں مرد' خواتین اور بچے بھی شامل ہیں' اس آگ میں جل کر خاکستر ہو گئے۔ ملک بھر میں ایم آر ڈی کی تحریک کے نتیجے میں جنرل ضیاء کی حکومت کافی کمزور ہو گئی تھی اور عوام میں حکومت کے خلاف نفرت بھی بڑھ گئی تھی۔

جنوری سے مارچ 1986ء تک بے نظیر بھٹو نے امریکا کا تفصیلی دورہ کیا اور کانگریس کے اہم ممبروں سے تفصیلی ملاقاتیں کیں اور ان سے پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے لئے مدد طلب کی' ان ملاقاتوں میں خاص طور پر وہ ملاقاتیں بہت اہم تھیں جو انہوں نے امریکہ کے سابق صدر جان ایف کینیڈی کی بیٹیوں اور بیٹوں سے کی تھیں جو اس وقت کانگریس کے ممبران تھے۔ جب بے نظیر بھٹو امریکہ میں پڑھ رہی تھیں تو یہ بھی ان کے ساتھ ایک ہی تعلیمی ادارے میں پڑھتے تھے اور ان کے ساتھ محترمہ کے قریبی تعلقات تھے بعد میں بے نظیر بھٹو عمرہ کرنے گئیں جس کے لئے ان کو بھٹو صاحب نے پھانسی سے پہلے خاص طور پر تاکید کی تھی وہاں سے وہ روس کی خواتین کی ایک تنظیم کی دعوت پر روس بھی گئیں' 10 اپریل 1986ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو اپنی لمبی ملک بدری ختم کر کے پاکستان لوٹیں اور وہ پاکستان واپسی پر جب لاہور ہوائی اڈے پر اتریں تو ان کا پاکستان کی تاریخ کا عظیم الشان استقبال کیا گیا' سارے صحافی اس بات پر متفق تھے کہ لاہور شہر تو سارے کا سارا اس استقبال میں شامل تھا مگر سندھ' پنجاب اور کے پی صوبے' بلوچستان حتیٰ کہ

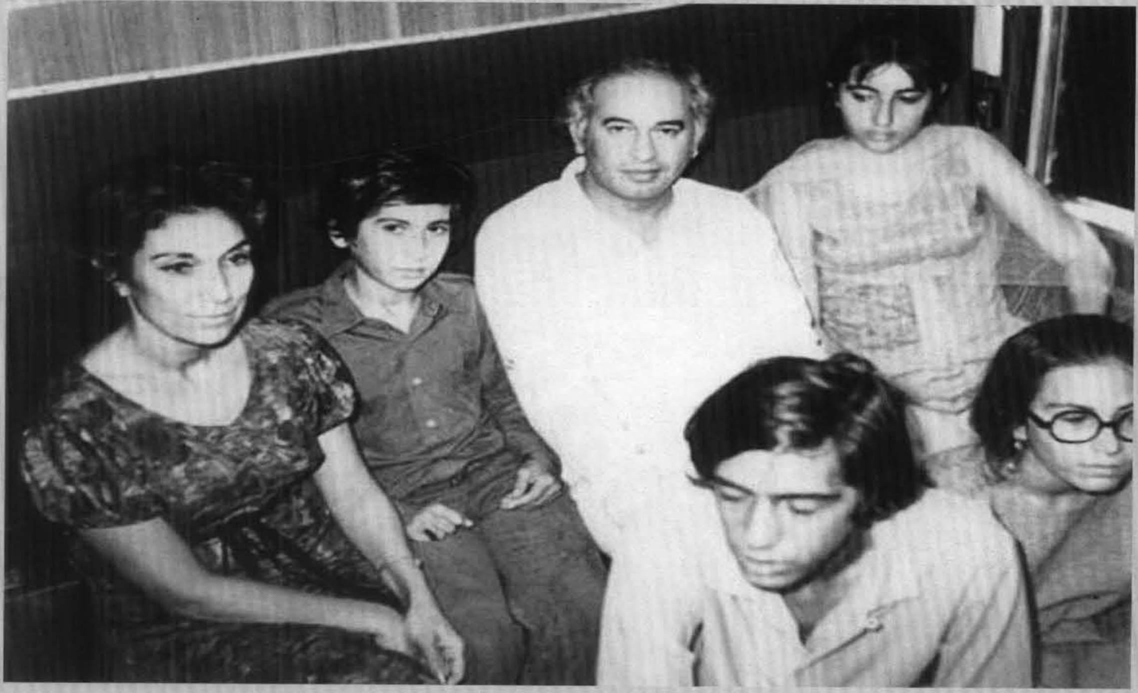

بھٹو خاندان کی ایک تاریخی تصویر

محترمہ بے نظیر بھٹو، بیگم نصرت بھٹو اور مرتضیٰ بھٹو

بیگم نصرت بھٹو اپنے منیجر قیوم اور دیگر خاندانی سٹاف کے درمیان

بیگم صاحبہ اور محترمہ بے نظیر بھٹو، خوشگوار موڈ میں

بیگم نصرت بھٹو کی رخسانہ بنگش کے لیے آٹو گراف تصویر

قائدعوام ذوالفقار علی بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو

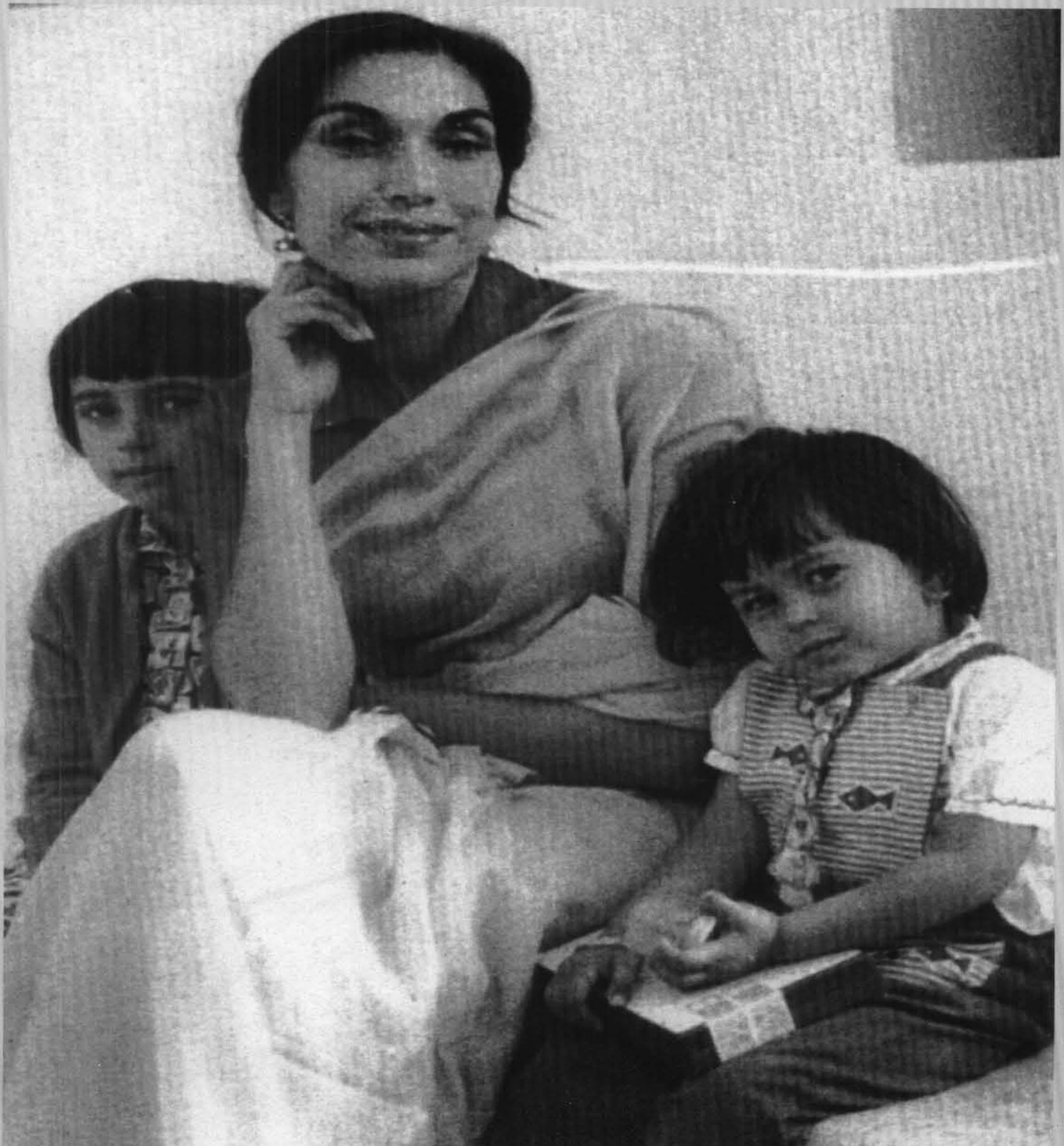

بیگم صاحبہ بچوں کے ساتھ

بیگم نصرت بھٹو صحت یابی کے بعد (لندن، 1984ء)

لندن میں بیگم نصرت بھٹو، ذوالفقار علی بھٹو کی برسی پر فاتحہ خوانی کرتے ہوئے

ذوالفقار علی بھٹو اپنے بچوں بے نظیر بھٹو، میر مرتضیٰ بھٹو، صنم بھٹو اور شاہ نواز بھٹو کے درمیان

بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو فرانس میں

نومبر 1982ء میں میونخ جرمنی میں بشیر ریاض بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ

برمنگھم سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''ایشیا'' نے 1969ء میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کے اعزاز میں ایک ظہرانہ کا اہتمام کیا تھا اس موقع پر دائیں سے بائیں یوسف قمر مدیر ایشیا، بشیر ریاض، مسٹر ذکریا منیجر حبیب بینک اور یونائیٹڈ بینک کے منیجر مسٹر بیگ نظر آ رہے ہیں

محترمہ بے نظیر بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو، 70 کلفٹن میں

میر مرتضیٰ بھٹو کے لیے بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو فاتحہ خوانی کر رہی ہیں

بی بی کی منگنی کے موقع پر دائیں سے صنم بھٹو، جناب آصف زرداری، محترمہ بے نظیر بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو

(لندن، 29 جولائی 1981ء)

بیگم نصرت بھٹو، جرمنی میں پارٹی کارکنوں کے ساتھ (نومبر 1982ء)

فروری 1979ء میں لندن میں احتجاجی جلوس کی قیادت کرتے ہوئے میر مرتضیٰ بھٹو اور میر شاہنواز بھٹو

بیگم نصرت بھٹو، حامد میر کے گھران کی والدہ کی تعزیت کرتے ہوئے

حامد میر کے لیے بیگم صاحبہ کی ایک آٹوگراف تصویر

بیگم نصرت بھٹو اپنے بچوں کے ساتھ

بیگم نصرت بھٹو، شاہ ایران کی ہمشیرہ اشرف پہلوی کے ہمراہ

70 کلفٹن، صنم بھٹو کی منگنی کے موقع پر اپنی بیٹیوں کے ساتھ

معروف دانشور اور ٹی وی اینکر پرسن مجاہد بریلوی کی صاحبزادی بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی محبتوں کے سائے میں

ہم پاکستان کے لیے
نسل در نسل لڑیں گے

بیگم نصرت بھٹو

چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی

بیگم نصرت بھٹو کی ایک یادگار تصویر

خاتون اوّل بیگم نصرت بھٹو

بیگم نصرت بھٹو اپنی سیکرٹری رخسانہ بنگش کے ساتھ

وزیراعظم ہاؤس اسلام آباد میں بیگم نصرت بھٹو، محترمہ بے نظیر بھٹو اور رخسانہ بنگش
بچوں کی سالگرہ کی تقریب میں

بیگم نصرت بھٹو

آصفہ بھٹو، بلاول بھٹو، بشیر ریاض اور بختاور بھٹو

آصفہ بھٹو اور بشیر ریاض

نسل در نسل کا ایک تاریخی لمحہ

بختاور بھٹو، بلاول بھٹو اور آصفہ بھٹو، بشیر ریاض سے بات چیت

نسل در نسل

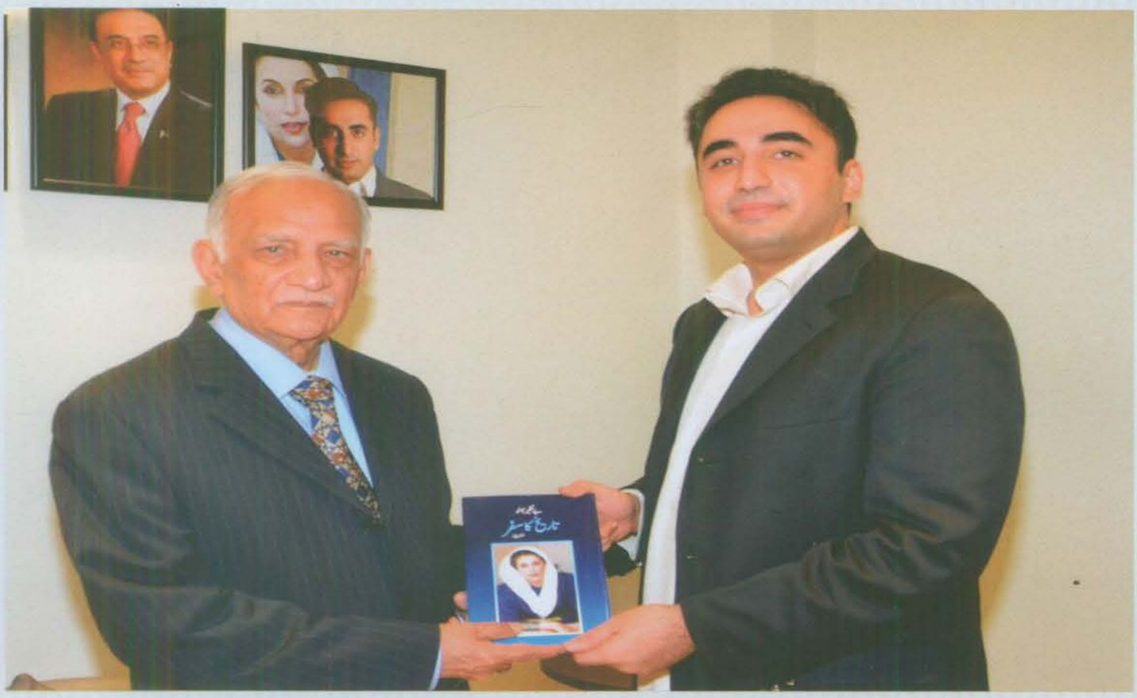

بلاول بھٹو، بشیر ریاض کے ساتھ

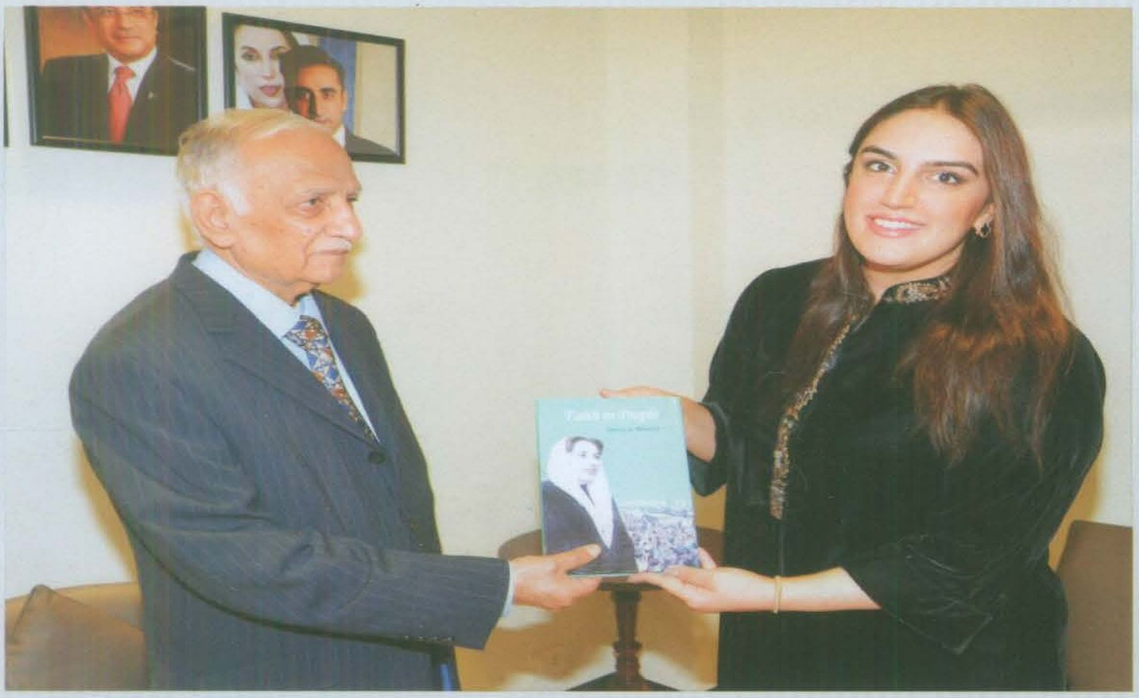

بختاور بھٹو اور بشیر ریاض

ایک فیملی پوٹریٹ

بیگم نصرت بھٹو، میر مرتضیٰ بھٹو اور اپنی پوتی فاطمہ بھٹو کے ساتھ

بیگم نصرت بھٹو، محترمہ بے نظیر بھٹو اور محترمہ کی بچپن کی دوست سمیعہ وحید

آصف علی زرداری، محترمہ بے نظیر بھٹو اور بیگم صاحبہ

لندن میں آصفہ کی پیدائش کے موقع پر دائیں سے ڈاکٹر عذرا افضل، بیگم نصرت بھٹو
آصفہ کو گود میں اٹھائے ہوئے، حاکم علی زرداری اور صنم بھٹو

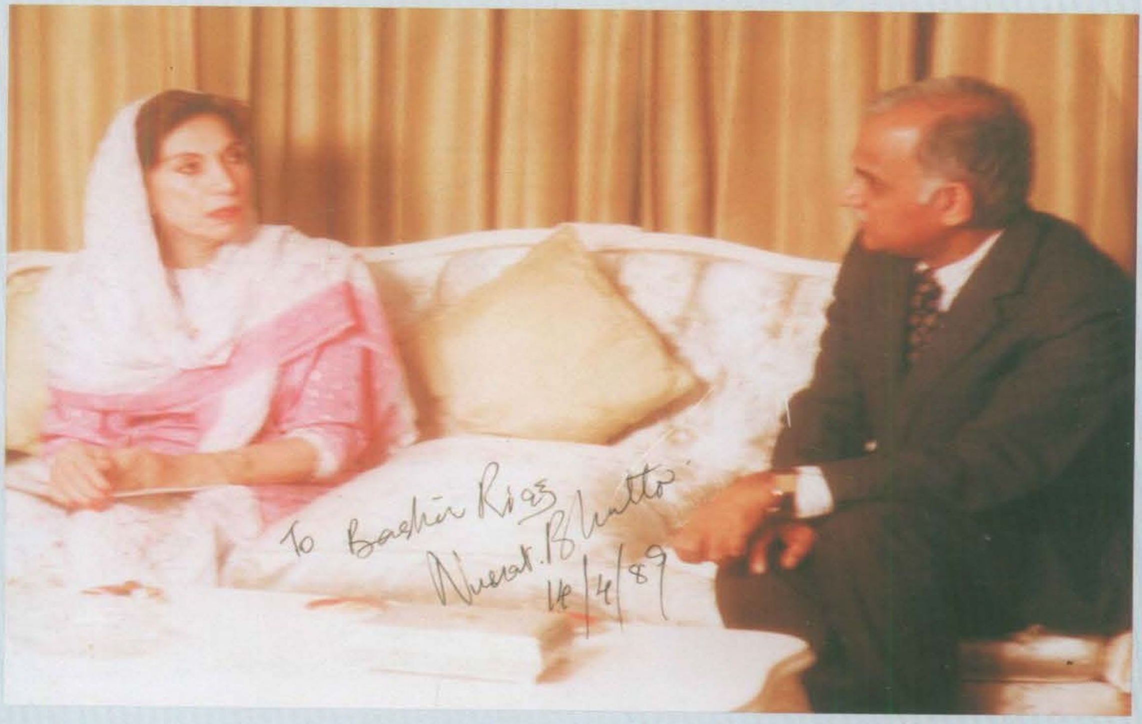

وزیراعظم ہاؤس راولپنڈی میں بشیر ریاض، بیگم صاحبہ سے بات چیت کرتے ہوئے (1989ء)

بیگم نصرت بھٹو، اپنی بھانجی بیگم فخری، فاطمہ بھٹو، محترمہ بے نظیر بھٹو اور بلاول بھٹو کے ہمراہ

بیگم نصرت بھٹو اور صنم بھٹو، لندن میں آصفہ کی ولادت کے موقع پر (فروری 1993ء)

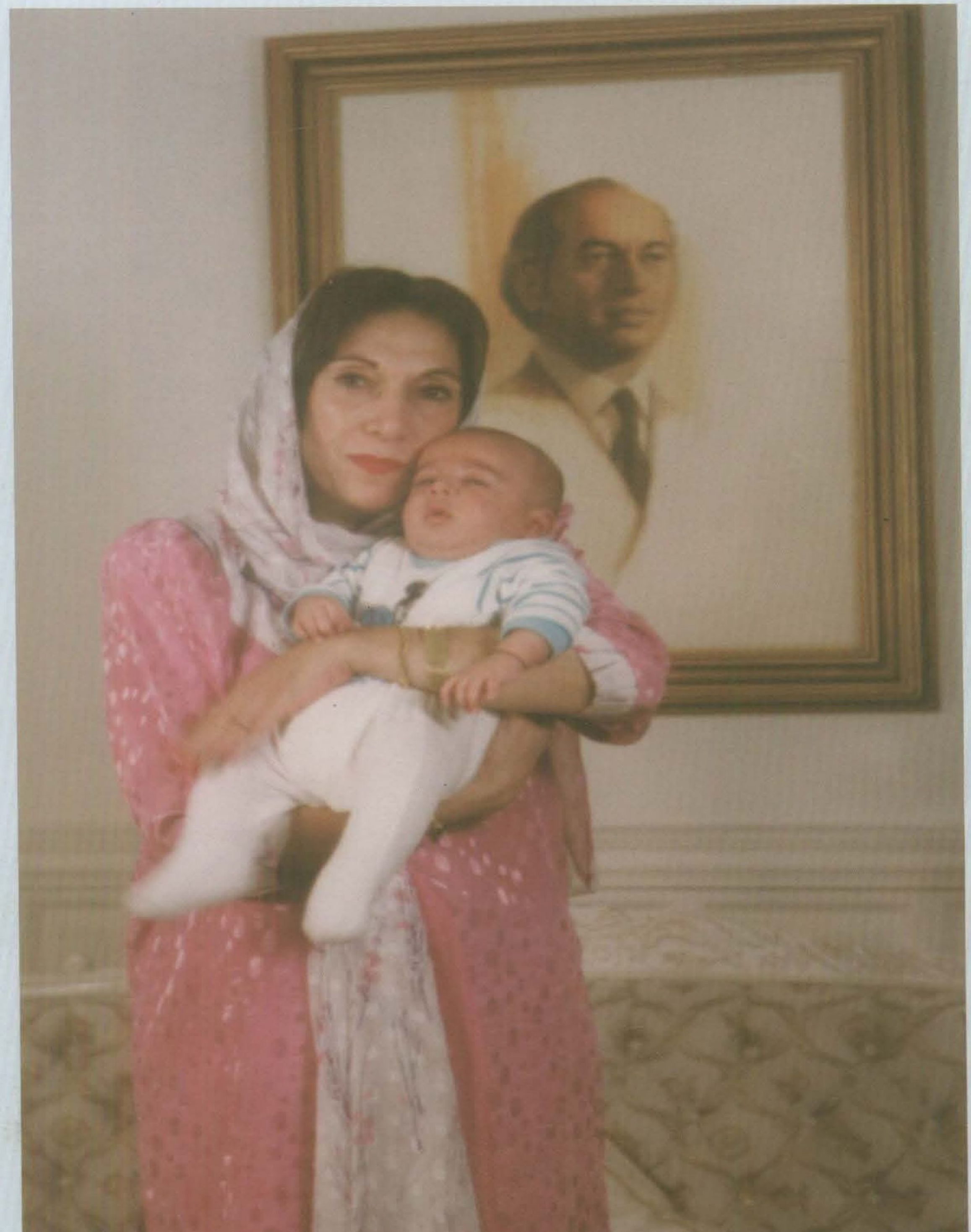

ننھا بلاول اپنی نانی کی گود میں (وزیراعظم ہاؤس، راولپنڈی 1989ء)

آصف علی زرداری، محترمہ بے نظیر بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو

ھر اندھیرے کے بعد روشنی
نمودار ھوتی ھے۔ انشاء اللہ
بہت جلد ظلم کی اس رات
کے سینے کو چاک کرکے حق اور
انصاف کا سورج طلوع ھوگا۔
(بے نظیر بھٹو)

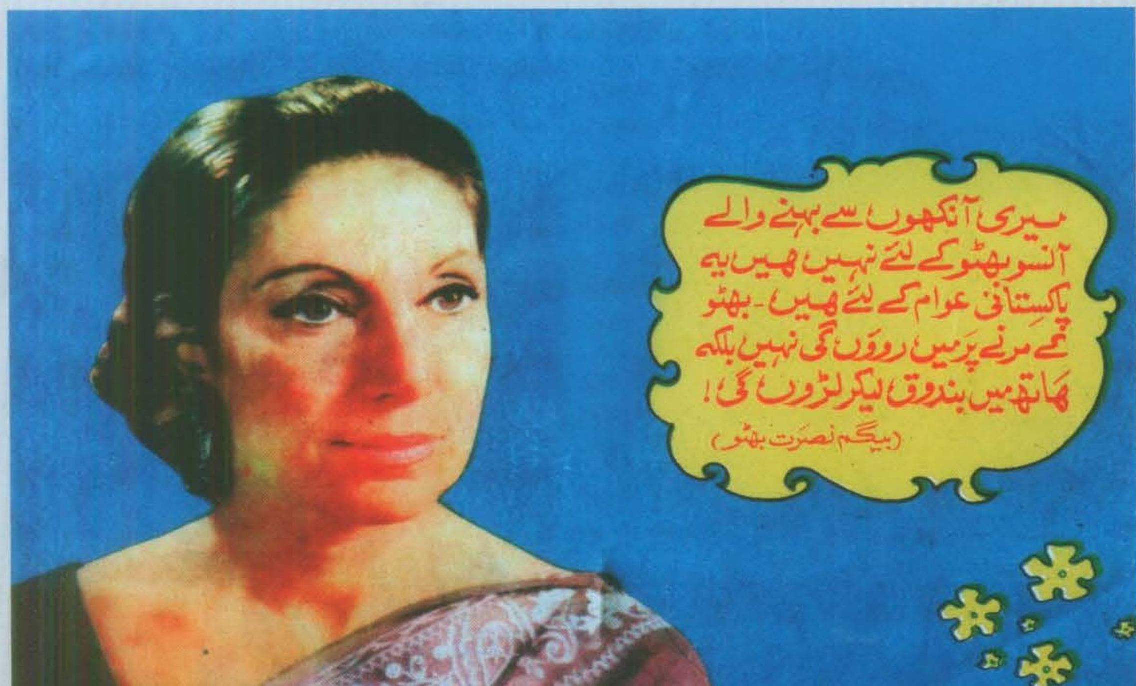
میری آنکھوں سے بہنے والے
آنسو بھٹو کے لئے نہیں ھیں یہ
پاکستانی عوام کے لئے ھیں۔ بھٹو
کے مرنے پر میں رووں گی نہیں بلکہ
ھاتھ میں بندوق لیکر لڑوں گی!
(بیگم نصرت بھٹو)

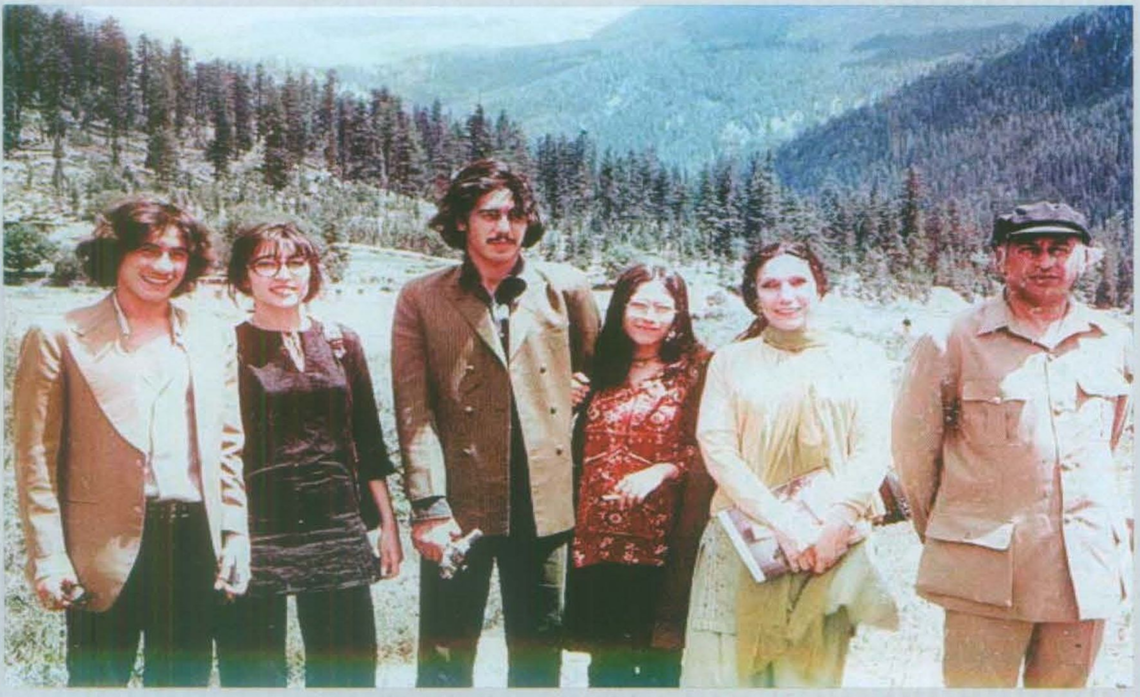

قائدِ عوام، مادرِ جمہوریت اپنی فیملی کے ہمراہ

صعوبتوں اور آزمائشوں کے انگاروں میں خوشیوں کے کھلتے پھول

بیگم نصرت بھٹو

فاٹا کے علاقوں اور گلگت بلتستان سے بھی لاکھوں کی تعداد میں لوگ اس استقبال میں شرکت کے لئے وہاں پہنچے' ان دنوں میں یہ بات بھی بہت مشہور ہوئی کہ جب تک محترمہ بے نظیر بھٹو کا یہ لاکھوں کا جلوس لاہور شہر میں رواں دواں تھا پی پی کے کسی رہنما نے شاید مذاقاً یہ تجویز دی کہ اس وقت اگر محترمہ ان لاکھوں لوگوں کو حکم دیتیں کہ لاہور کے گورنر ہاؤس پر قبضہ کرلو تو ان لوگوں کے لئے یہ قطعی ناممکن نہیں تھا' 11 اپریل 1986ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے لندن ٹائمز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ وہ بدلہ لینے پر یقین نہیں رکھتیں اور وہ اپنے ملک کو بنانا چاہتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ایک دن پہلے عوام کے جس جم غفیر نے ان کا استقبال کیا وہ فوجی حکومت کو گرانے کے لئے کافی تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ایک ریٹائرڈ میجر ان کی رہائش گاہ کے کمرے میں گھس آئے اسے گرفتار ضرور کیا گیا مگر فوج نے قرار دیا کہ وہ ایک پاگل شخص ہے لہٰذا چند دنوں کے بعد اسے رہا کردیا گیا۔

12 اپریل کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے ایک بہت بڑے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے پنجاب کا دورہ کیا۔ سنڈے ٹائمز نے 15 اپریل 1986ء کو لکھا کہ بے نظیر بھٹو نے جمہوریت کی جنگ کا پہلا راؤنڈ جیت لیا ہے' دوسرے دن پشاور پہنچنے پر بے نظیر بھٹو کا شاندار استقبال کیا گیا' 3 اور 4 مئی 1986ء کو بے نظیر بھٹو کراچی پہنچیں جہاں لاکھوں لوگوں کے اجتماع نے ان کا استقبال کیا' اب صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ ایم آر ڈی تحریک کا دوسرا دور شروع ہوگیا ہے' کراچی کے بعد بے نظیر بھٹو نے سندھ صوبے کا دورہ کیا وہ جہاں بھی گئیں عوام نے ان کا شاندار استقبال کیا' بے نظیر کے ان استقبالوں سے جنرل ضیاء اتنے گھبرا گئے کہ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر محاذ آرائی شروع کی گئی تو وہ ملک میں ایک بار پھر مارشل لاء لگادیں گے' اسی دوران جنرل ضیاء الحق کا کراچی آنا ہوا جہاں انہوں نے گورنر ہاؤس میں ایک تقریب سے خطاب کیا۔ تقریب کے بعد تیزی سے گورنر ہاؤس میں داخل ہونے کے دوران راقم نے ان کا راستہ روک لیا اور سوال کیا کہ جنرل صاحب چیف آف اسٹاف کی حیثیت سے آپ کا Tenure دو دن کے بعد ختم ہورہا ہے

تو آپ کے بعد فوج کا چیف آف اسٹاف کون ہوگا۔ انہوں نے انگریزی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ I have extended myself as army chief of staff is indifinately جب جنرل صاحب یہ جواب دے رہے تھے تو دیگر صحافی بھی وہاں پہنچ گئے لہٰذا دوسرے دن کے اکثر اخبارات کی شہ سرخی جنرل صاحب کا یہ بیان ہی تھا' 2 جون 1986ء کو قومی اسمبلی نے جنرل ضیاء کے اس بیان پر بحث کی' 10 اگست 1986ء کو 70 کلفٹن میں ایم آر ڈی کے رہنما جمع ہوئے اور مطالبہ کیا کہ انتخابات پارٹی بنیاد پر کرائے جائیں۔ پی پی کی طرف سے شروع کی گئی بحالی جمہوریت کی تحریک 14 اگست 1986ء کو اور تیز ہوگئی' کراچی کے گلی کوچوں میں پی پی کارکنوں کی پولیس کے ساتھ محاذ آرائی شروع ہوگئی' صورتحال اس وقت انتہائی خراب ہوگئی جب سندھ میں پی پی کے 30 کارکن قتل کردیے گئے' ساتھ ہی بے نظیر بھٹو کو بھی نظر بند کردیا گیا' امریکہ اور جرمنی کی حکومتوں نے بے نظیر بھٹو کی نظر بندی کی مذمت کی' آخرکار بے نظیر بھٹو کو رہا کردیا گیا۔

سندھ عوامی تحریک کے رہنما فاضل راہو جن کی قیادت میں سندھ عوامی تحریک نے ایم آر ڈی کی تحریک میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا انہیں اپنے آبائی علاقے میں قتل کردیا گیا' دوسرے دن جب بے نظیر بھٹو گاڑی میں لاڑکانہ جا رہی تھیں تو راستے میں ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا مگر وہ معجزانہ طور پر بچ گئیں' اسی دوران بیگم نصرت بھٹو کی خواہش پر محترمہ بے نظیر بھٹو کی آصف زرداری سے شادی ہوگئی' 21 جولائی 1988ء کو جنرل ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ 16 نومبر 1988ء کو غیر پارٹی بنیادوں پر ملک میں انتخابات کرائے جائیں گے مگر 17 اگست 1988ء کو جب جنرل ضیاء الحق' امریکی سفیر آرنلڈ رافیل' جنرل اختر عبدالرحمان و دیگر کئی اعلیٰ فوجی افسران کے ساتھ بہاولپور سے سی 130 جہاز کے ذریعے اسلام آباد جا رہے تھے تو حادثے میں سب مارے گئے' اس طرح جنرل ضیاء الحق کی طرف سے فوج کی مدد سے پاکستان کے پہلے منتخب عوامی وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ختم کرنے کے دن سے پاکستان میں جو سیاہ رات مسلط ہوئی تھی اس کا خاتمہ 17 اگست 1988ء کو ہوا' اسی طرح یہ دن پاکستان میں ایک نئے عوامی دور کی بھی ابتداء ہے'

درحقیقت اس عوام دشمن سیاہ دور کے خاتمے کا اعزاز بھی بیگم نصرت بھٹو کو جاتا ہے جو نہ فقط ایم آر ڈی تحریک کی ماسٹر مائنڈ تھیں بلکہ انہوں نے جنرل ضیاء کی فوجی حکومت کے ہر قسم کے جبر کا انتہائی بہادری سے سامنا کیا' اس سلسلے میں عوام بھی جنرل ضیاء سے اس حد تک متنفر ہو چکے تھے کہ جنرل ضیاء کے لئے بددعاؤں نے بھی اپنا اثر دکھایا اور آخر ایک ہوائی حادثے کا شکار ہو کر نہ فقط یہ ملک بلکہ یہ جہاں بھی چھوڑ گئے' 17 اگست کے حادثے کے حوالے سے دی نیشن اخبار نے لکھا کہ جنرل ضیاء الحق ایک ڈکٹیٹر تھے جنہوں نے غیر قانونی طور پر اقتدار پر قبضہ کیا اور فراڈ پر مبنی ریفرنڈم کرا کے اپنے اقتدار کو دوام بخشا' اس کے بعد انہوں نے ملک کو اپنی پسند کا ایک نام نہاد سویلین سیٹ اپ دیا یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ حادثے میں مرنے سے پہلے انہوں نے اپنے ہاتھ سے چنے ہوئے وزیر اعظم محمد خان جونیجو کو ڈسمس کر دیا۔

درحقیقت ضیاء نے ہمارے معاشرے کے ہر ادارے کو تباہ کر دیا' درحقیقت اس کی حکمرانی کا دور ایک ڈراؤنا خواب تھا' اس کے فوری بعد عام انتخابات کرائے گئے جو پارٹی بنیاد پر ہوئے انتخابات میں آٹھ پارٹیوں کے اتحاد اور پی پی کے درمیان مقابلہ تھا' اس الیکشن میں بیگم نصرت بھٹو نے لاڑکانہ سے آبائی سیٹ سے انتخاب لڑا اور بہت بڑی اکثریت سے قومی اسمبلی کی ممبر منتخب ہو گئیں۔ لاڑکانہ کی دوسری نشست سے محترمہ بے نظیر بھٹو بہت بڑی اکثریت سے قومی اسمبلی کی ممبر منتخب ہو گئیں' انتخابی نتائج کے مطابق پی پی 207 نشستوں میں سے 90 پر کامیاب ہو گئی جبکہ پی پی کا مقابلہ کرنے والا آئی جے آئی اتحاد 54 نشستیں حاصل کر سکا' ان انتخابات میں خاص طور پر سندھ میں انتہائی حیران کن نتیجے بھی سامنے آئے۔ الیکشن کمیشن کی طرف سے انتخابی نتائج سامنے آنے کے بعد صدر کا فرض تھا کہ اکثریتی پارٹی کو حکومت بنانے کی دعوت دیتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اندرون خانہ حلقوں کے مطابق درحقیقت جنرل ضیاء الحق کے حادثے میں مر جانے کے بعد فوجی طاقت کے انچارج دو جنرل یعنی جنرل اسلم بیگ جو وائس چیف آف اسٹاف تھے اور جنرل حمید گل جو اس وقت آئی ایس آئی کے سربراہ تھے ان دو جنرلوں نے سب

سے پہلے صدر غلام اسحاق خان کو بلوایا اوران کو ہدایات دیں کہ انہیں فلاں فلاں طریقے سے نئی حکومت کو چلانا ہے' راقم بھی اس وقت اسلام آباد میں تھا اور اپنے اخبار کی طرف سے حکومت سازی کی کوریج کرنی تھی حالانکہ سندھ کے سابق وزیر خزانہ پیار علی الانا قومی اسمبلی کے ممبر منتخب نہیں ہو سکے تھے مگر انہیں محترمہ بے نظیر بھٹو نے جو پارٹی کی طرف سے اور بیگم بھٹو کی طرف سے وزارت عظمیٰ کی امیدوار تھیں کو اسلام آباد بلایا اور انہیں بتایا کہ وہ انہیں وفاقی حکومت میں وزیراعظم کے مشیر خزانہ کے طور پر لے رہی ہیں' بے نظیر صاحبہ نے الانا کو ہدایات دیں کہ وہ فوری طور پر بجٹ تیار کریں اور وہ اس کام میں لگ گئے مگر نئی بننے والی حکومت کے ساتھ صدر غلام اسحاق خان کی طرف سے پہلی چال یہ چلی گئی کہ نئے وزیراعظم کی طرف سے حلف اٹھانے والے دن سے ایک دو دن پہلے انہوں نے حکومت پاکستان کی طرف سے آئی ایم ایف کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے جس میں پاکستان کے سامنے کئی شرائط رکھی گئی تھیں اس کے نتیجے میں پاکستان کا بجٹ ان شرائط کی روشنی میں بننا تھا۔

صدر غلام اسحاق خان کا یہ قدم نہ فقط غیر آئینی تھا بلکہ غیر اخلاقی بھی تھا مگر انہیں اس سلسلے میں اسٹیبلشمنٹ کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ راقم چونکہ ان دنوں اسلام آباد میں تھا لہٰذا کچھ حلقوں کی طرف سے یہ اطلاعات بھی آئیں کہ جنرل اسلم بیگ اور جنرل حمید گل کی طرف سے محترمہ بے نظیر بھٹو کو جی ایچ کیو میں بلایا گیا اس وقت یہ باتیں بھی عام تھیں کہ اسٹیبلشمنٹ کو پی پی کی طرف سے حکومت بنانے پر شدید اعتراضات تھے لہٰذا اطلاعات کے مطابق ان دو جنرلوں نے بے نظیر بھٹو کے سامنے کچھ شرائط رکھیں کہ اگر وہ یہ شرائط تسلیم کرتی ہیں تو انہیں حکومت بنانے کی دعوت دی جاسکتی ہے' کہا جاتا ہے کہ بے نظیر بھٹو صاحبہ نے اس بات پر پارٹی کے ساتھ غور کرنے کے لئے کچھ ٹائم مانگا' پارٹی سے مشورے کے بعد انہوں نے ایک شرط مانی جس کے مطابق خزانہ کا انچارج صدر غلام اسحاق خان نامزد کرینگے۔ ان ذرائع کے مطابق اس کے علاوہ ایک دو اور چھوٹی موٹی شرائط تھیں وہ بھی پارٹی کو ماننی پڑیں کیونکہ پارٹی کافی مشکلات کا مقابلہ

کر کے آگے آئی تھی اور اسے سانس لینے کے لئے کچھ وقت چاہیے تھا یہاں میں اپنے حوالے سے بھی ایک بات رقم کرتا چلوں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو شروع سے مجھ پر کافی مہربان رہیں وہ کبھی کبھار پیغام دیکر مجھے ون ٹو ون ملاقات کے لئے مدعو کرنے کی مہربانی کرتی تھیں میں یہاں یہ بات بھی ریکارڈ پر لاتا چلوں کہ خود کچھ پی پی حلقوں سے بھی کبھی کبھار یہ رائے سامنے آتی تھی کہ بے نظیر بھٹو صاحبہ ڈکٹیٹر ٹائپ کی رہنما تھیں وہ اس وقت اس جہاں میں نہیں میں حلف اٹھا کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ بے نظیر بھٹو صاحبہ ایک بہت بڑی پارٹی کی بہت بڑی قائد تھیں، اول تو وہ مجھ جیسے ایک چھوٹے سے صحافی کو مشورہ کے لئے بلاتی تھیں مگر دوسری بات یہ کہ میری یہ عادت رہی کہ ان ملاقاتوں میں پی پی اور محترمہ کے اچھے اقدامات کی تعریف کرنے کی بجائے ان کے کمزور فیصلوں کی نشان دہی کرتا تھا۔

خدا گواہ ہے کہ جب میں یہ بات کرتا رہتا تھا تو محترمہ کو غصہ آنے کے بجائے وہ مسکرا کر میری باتیں سنتی تھیں مجھے یاد ہے کہ میں نے ان سے ملاقات میں بھی یہ بات رکھی کہ عام رائے یہ ہے کہ آپ کو یہ اقتدار چند شرائط پر مل رہا ہے جواب میں انہوں نے مجھے کہا کہ یہ میرا اکیلے کا فیصلہ نہیں یہ پارٹی کے سینئر رہنماؤں سے مشورہ کر کے کیا گیا ہے، اس سلسلے میں انہوں نے ایک اہم بات بتائی۔ انہوں نے بتایا کہ ایم آر ڈی احتجاج کے دوران پنجاب میں ہمارے کئی اہم کارکنوں کو فوجی عدالتوں سے لمبی مدت کی قید سخت کی سزائیں دی گئیں اور ان میں سے اکثر اب بھی لاہور شاہی قلعے کے ٹارچر سیلز میں پڑے ہوئے ہیں لہٰذا ہماری پارٹی کی رائے یہ تھی کہ اگر انکی سزائیں معاف کر کے انہیں رہا کر دیا جائے تو ہمیں اسٹیبلشمنٹ کی ایک دو شرائط مان لینی چاہئیں لہٰذا محترمہ نے بتایا کہ وہ دونوں جنرلوں سے ملیں اور ان کے سامنے یہ شرط رکھی کہ صدر غلام اسحاق خان آئین کے تحت ان کارکنوں کی یہ سزائیں ختم کر کے انہیں رہا کر سکتے ہیں۔ بقول محترمہ کے ان کی یہ شرط مان لی گئی اور آئندہ چند دنوں کے دوران پی پی کے ایسے سینکڑوں کارکن رہا ہو کر اپنے عزیزوں سے جا ملے۔ یہاں میں یہ بات بھی ریکارڈ پر لانا چاہونگا کہ کوئی

آٹھ سال پہلے میرا فرانس جانا ہوا جہاں ہماری ایسے کئی پی پی کارکنوں سے ملاقاتیں ہوئیں جو جنرل ضیاء کی جیل میں لمبی قید کاٹ چکے تھے مگر اب وہ پیرس میں Assylum لیکر وہاں کے شہری بن چکے تھے' ان میں سے ایک دوست نے مجھے رات کو ڈنر پر بلایا' بات چیت کے دوران انہوں نے بتایا کہ وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جنہیں شاہی قلعے کے ٹارچر ہاؤس میں رکھا گیا تھا اور محترمہ کے اس فیصلے کے بعد وہ رہا ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے فرانس جانے کا تہیہ کرلیا مگر ملک چھوڑنے سے پہلے محترمہ سے ملاقات کے لئے انٹرویو مانگا جو مل گیا اس دوست نے کہا کہ جب وزیراعظم صاحبہ سے ملنے گیا تو میرے ساتھ پی پی کا ایک اور کارکن بھی تھا جو اس ساری مصیبت سے گزر چکا تھا اس دوست نے بتایا کہ محترمہ سے بات چیت کے لئے وہ دونوں اٹھے اور سامنے صوفے پر بیٹھی محترمہ کے پاؤں پر گر گئے اور گڑگڑا کر کہنے لگے کہ ہم تو ملک چھوڑ کر جارہے ہیں مگر خدارا آپ بھی یہ ملک چھوڑ دیں یہاں آپ کی زندگی خطرے میں ہے' اس دوست نے کہا کہ ہم دونوں نے ہاتھ جوڑ کر اور منت کر کے محترمہ کو قائل کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ جو فوجی ہمیں ٹارچر کرتے تھے تو وہ خاص طور پر آپ کا ذکر کرتے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ اسے بھی زندہ نہیں چھوڑنا مگر اس دوست نے کہا کہ محترمہ نے ان کی بات نہیں مانی اور کہنے لگیں کہ مجھے بھٹو صاحب کے مشن کو آگے بڑھانا ہے۔

بیگم نصرت بھٹو نہ فقط ایم این اے منتخب ہوئیں بلکہ وہ اپنی پیاری بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو کی کابینہ میں سینئر وزیر بھی تھیں یہ شاید اس وجہ سے کیا گیا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو ابھی اتنی تجربہ کار نہیں تھیں اور انہیں ہر اہم ایشو پر اپنی والدہ بیگم بھٹو صاحبہ کی رہنمائی کی ضرورت تھی' بیگم بھٹو پارٹی اور حکومت کے ڈسپلن اور حکومت کے قواعد اور ضوابط کی کس حد تک پابندی کرتی تھیں اس کی ایک مثال 1988ء کے بعد سندھ کی پہلی کابینہ میں سندھ کے ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کے وزیر مرحوم عبدالسلام تھہیم نے پیش کی اور کہا کہ وزیر کی حیثیت سے میں سندھ کے وزیراعلیٰ سید قائم علی شاہ کے ساتھ کسی ایشو پر بات چیت کرنے کے لئے ان کے کمرے میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا

تھا کہ سی ایم صاحب کو اسلام آباد سے ایک اہم ٹیلی فون کال آئی جو سینئر وفاقی وزیر بیگم نصرت بھٹو کی تھی۔ تھہیم صاحب نے بتایا کہ یہ بات چیت 15-20 منٹ تک جاری رہی وہ بیگم صاحبہ کی آواز تو نہیں سن سکتے تھے مگر شاہ صاحب کی بات چیت سے مجھے ساری بات چیت سمجھ میں آ گئی' واضح رہے کہ جب جناب ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیر اعظم تھے تو ان کے دبئی کے حکمرانوں سے انتہائی گہرے ذاتی تعلقات تھے' انہوں نے بھٹو صاحب کو فنڈز فراہم کئے کہ ان میں سے وہ عوام کی بھلائی کے لئے کوئی پروجیکٹ شروع کر سکیں' بھٹو صاحب نے دبئی کے حکمران زید بن سلطان النہیان کے نام سے کراچی میں ایک فاؤنڈیشن بنایا جس کی چیئرمین بیگم نصرت بھٹو کو بنایا گیا' اس فاؤنڈیشن کے تحت نہ فقط سندھی ڈیلی ہلال پاکستان بلکہ اردو میں ڈیلی مساوات بھی شائع ہوتے تھے۔ کئی تعلیمی ادارے اور سماجی ادارے بھی اسی فاؤنڈیشن کے تحت چلائے جاتے تھے مگر جب جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کی حکومت کے خلاف مارشل لاء لگا کر ان کو قید میں بند کر دیا تو کراچی کا یہ فاؤنڈیشن بیگم نصرت بھٹو کی چیئرمین شپ سے نکال کر اسے کراچی میں پہلے مرحلے میں آئی ایس پی آر کی ایک ٹیم کی سرپرستی میں دیدیا گیا اور بعد میں ایک مارشل لا آرڈر کے ذریعے اسے ایک خود مختار ادارے کی شکل دی گئی۔

تھہیم کے مطابق بیگم صاحبہ کا موقف تھا کہ یہ فاؤنڈیشن ان کی ملکیت ہے لہٰذا ضروری احکامات صادر کر کے یہ فاؤنڈیشن انہیں واپس کر دیا جائے تا کہ ایک بار پھر تعلیمی ادارے' سماجی ادارے اور اخبارات چلائے جا سکیں۔ بقول تھہیم صاحب کے سید قائم علی شاہ صاحب نے بیگم صاحبہ کو یقین دلایا کہ وہ جلد اس سلسلے میں اقدامات کریں گے' کوئی ایک ڈیڑھ سال کے بعد تھہیم صاحب نے راقم کو انتہائی دکھی انداز میں بتایا کہ یار کل میں وزیر اعلیٰ سید قائم علی شاہ کے آفس میں ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا تو ان کی موجودگی میں ایک بار پھر اسلام آباد سے بیگم نصرت بھٹو کا ٹیلی فون آیا' انہوں نے کہا کہ اس بار بھی انہوں نے شاہ صاحب اور بیگم صاحبہ کی ساری گفتگو سنی' ایشو وہی پیپلز فاؤنڈیشن والا تھا' بیگم صاحبہ کو شاہ صاحب بتا رہے تھے کہ اس سلسلے میں قانونی

ماہرانہ رائے معلوم کرنے کے لئے یہ ایشو سندھ کے محکمہ قانون کو ریفر کیا گیا ہے۔ تھہیم نے کہا کہ یہ سب کچھ سن کر اور دیکھ کر اسے بہت دکھ ہوا' یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ایک سال ہو چکا ہے مگر ابھی تک وزیر اعلیٰ صاحب نے بیگم صاحبہ کے ان احکامات پر عمل نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس مرحلے پر ان سے نہیں رہا گیا اور شاہ صاحب کو مخاطب ہو کر کہا کہ آپ اور ہم سب کو پتہ ہے کہ یہ فنڈ دبئی کے حکمران نے بھٹو صاحب کے حوالے کیے تھے' ان فنڈز سے انہوں نے یہ فاؤنڈیشن چلایا جو اچھا کام ہے۔ تھہیم نے کہا کہ میں نے شاہ صاحب کو کہا کہ آپ اور ہم سب آج ان عہدوں پر بھٹو خاندان کی وجہ سے بیٹھے ہوئے ہیں' کیا ہم ان کے ان احکامات پر بھی عمل نہیں کر سکتے۔ تھہیم نے کہا کہ میں نے جرات کر کے شاہ صاحب کو کہا کہ میں بھی صوبائی وزیر ہوں' آپ یہ ایشو مجھے ریفر کر دیں میں کل ہی احکامات جاری کر دیتا ہوں کہ یہ فاؤنڈیشن بیگم نصرت بھٹو کی چیئر مین شپ میں بحال کی جائے' کئی سالوں کے بعد جب تھہیم مرحوم سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے انتہائی افسوس سے کہا کہ بھٹو خاندان کی حکومت ختم ہوگئی مگر بیگم نصرت بھٹو کے ان احکامات پر عمل نہیں ہوا مگر سلام ہے بیگم نصرت بھٹو پر کہ وہ سندھ کے وزیر اعلیٰ کے احکامات کا انتظار ہی کرتی رہیں اور ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے سے پرہیز کیا۔

اسٹیبلشمنٹ نے نہ چاہتے ہوئے بھی چند شرائط پر محترمہ بےنظیر بھٹو اور پی پی کی حکومت کو قبول کر لیا تھا مگر حکومت بننے کے بعد بھی ان کی حکومت کے خلاف سازشیں عروج پر رہیں' الیکشن کے دوران بھی کیا کیا کھیل نہیں کھیلے گئے' 1988ء کے انتخابات قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے لئے الگ الگ ہوئے تھے' صوبائی اسمبلی کے انتخابات قومی اسمبلی کے انتخابات سے چند دن بعد ہوئے تھے' جب قومی اسمبلی کی اکثر نشستیں پی پی نے حاصل کر لیں' مگر یہ بات نہ مسلم لیگ (ن) کو قبول تھی اور نہ اسٹیبلشمنٹ کو لہٰذا صوبائی انتخابات سے پہلے پنجاب میں نواز مسلم لیگ نے کھل کر ''پنجابی شاؤنزم'' کا پتہ کھیلا اور پنجاب کے کونے کونے میں یہ نعرہ لگا کر پنجاب کے عوام کو مخاطب ہوتے ہوئے ان کو ابھارا گیا کہ ''جاگ پنجابی جاگ' تیری پگ نو لگ گیا داغ'' حیرت

یہ ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے یہ نعرہ لگانے کے بارے میں کوئی مداخلت نہیں ہوئی' اگر پی پی سندھ میں ایسا نعرہ لگاتی تو کیا اسے ایسا نعرہ لگانے دیا جاتا۔ بہرحال یہ نعرہ لگانے کے نتیجے میں پنجاب کی صوبائی اسمبلیوں کی اکثریتی نشستوں پر نواز مسلم لیگ کامیاب ہوگئی لہٰذا میاں نواز شریف پنجاب کے وزیراعلیٰ بن گئے وہ جب تک پنجاب کے وزیراعلیٰ رہے انہوں نے پنجاب کا دورہ کرتے وقت وزیراعظم بےنظیر بھٹو کا کبھی بھی استقبال نہیں کیا' پھر تھوڑے ہی دنوں میں محترمہ بےنظیر بھٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک لائی گئی' اب یہ بات کسی کے لئے راز نہیں کہ اس تحریک کو لانے والے اور آگے بڑھانے والوں میں آئی بی کے افسران شامل تھے' مگر یہ تحریک ناکام ہوگئی' مگر اس کے باوجود بےنظیر بھٹو کی حکومت کو چین سے حکومت چلانے نہیں دی گئی' آج یہ سازش تو کل یہ سازش' آخرکار ایجنسیوں کی طرف سے نامزد کیے گئے صدر غلام اسحاق نے محترمہ بےنظیر بھٹو کی حکومت کو فروعی اسباب کی بنیاد پر تحلیل کردیا' پھر جو انتخابات کرائے گئے تو نواز شریف کی حکومت کو بڑی اکثریت میں کامیاب کرایا گیا' مگر نواز شریف کی حکومت بھی نہیں چل سکی اور اس حکومت کو بھی تحلیل کردیا گیا' اب کی بار جو انتخابات ہوئے اس کے نتیجے میں ایک بار پھر پی پی مرکز اور بشمول سندھ کچھ صوبوں میں حکومتیں بنانے میں کامیاب ہوگئی' ایک بار پھر محترمہ بےنظیر بھٹو پاکستان کی وزیراعظم بنیں' ساتھ ہی بیگم نصرت بھٹو کو ایک بار پھر وفاقی وزیر بنایا گیا مگر ان دنوں بیگم صاحبہ کی طبیعت ایک بار پھر خراب ہونے لگی۔

یاد رہے کہ جب بھٹو صاحب جیل میں تھے اور بیگم صاحبہ کو قذافی اسٹیڈیم لاہور میں ہزاروں کارکنوں کی قیادت کرنے پر پولیس کے لاٹھی چارج کا سامنا کرنا پڑا جس سے خاص طور پر ان کے سر اور چہرے سے خون بہنے لگا تھا' اس کے کچھ عرصے بعد جب وہ جیل میں تھیں تو وہ کینسر کی مریضہ ہوگئیں اور حکومت نے ان کو علاج کے لئے بیرون ملک بھیجا تھا' ان کا علاج ہوا تھا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا' اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے' ان کی یادداشت اس حد تک متاثر ہونے لگی کہ نہ فقط وہ باتیں بھول جانے لگی تھیں بلکہ لوگوں کو پہچاننے میں بھی انہیں دشواری ہونا

شروع ہوگئی تھی۔ راقم کو پنجاب کی ممتاز سیاستدان سیدہ عابدہ حسین نے بتایا کہ انہوں نے بیگم بھٹو کے ساتھ خواتین کو متحرک کرنے کے سلسلے میں اکٹھے مل کر خاصہ کام کیا لہٰذا وہ ان کا بے حد احترام کرتی تھیں مگر انہوں نے افسوس کے ساتھ بتایا کہ جب محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم تھیں اور بیگم صاحب نائب وزیراعظم تھیں اور ان کا اسلام آباد میں قومی اسمبلی میں جانا ہوا تو ان کی نظر دور بے نظیر بھٹو کے ساتھ بیٹھی ہوئی بیگم بھٹو پر جا کر پڑی۔ انہوں نے کہا کہ وہ بڑھ کر جب بیگم بھٹو کے پاس پہنچیں اور ان کو سلام کیا تو انہیں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ انہوں نے میرے سلام کا کوئی جواب نہیں دیا' مگر انہوں نے کہا کہ بے نظیر بھٹو ساتھ بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں لہٰذا وہ روہانسو ہو کر ان کے قریب آئیں اور کہا کہ معاف کرنا بیگم صاحبہ کی نہ فقط یادداشت متاثر ہوئی ہے بلکہ وہ اکثر کو مشکل سے پہچان سکتی ہیں' بیگم نصرت بھٹو کو اس وقت تک بھی پتہ نہیں کتنے جھٹکے لگ چکے تھے جن میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے جیل کے دوران مقدمہ چلتے ہوئے کئی مصیبتوں کا سامنا کرنا' بڑے پیمانے پر کبھی جیل کی قید تو کبھی گھر اور سہالہ ریسٹ ہاؤس کی نظر بندی' پھر بھٹو کو انتہائی غیر قانونی طور پر پھانسی کے تو ایسے واقعات ہیں جن کا دنیا بھر میں ذکر ہوا اور بیگم نصرت بھٹو انتہائی صبر' بردباری اور بہادری سے ان صدموں کو برداشت کرتی آئیں' مگر شاید قدرت نے عموماً بھٹو خاندان اور خصوصاً بیگم نصرت بھٹو کے صبر و برداشت کا امتحان لینے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ انہی دنوں جناب ذوالفقار علی بھٹو کے چھوٹے بیٹے شاہنواز بھٹو جو اس وقت فرانس کے ایک ساحلی شہر میں ٹھہرے ہوئے تھے خفیہ ہاتھ کے ذریعے انہیں زہر دیکر قتل کر دیا گیا' بیگم بھٹو کے لئے یہ صدمہ بھی ناقابل برداشت تھا' وہ اب تک ان صدموں کا مقابلہ تو کرتی رہیں مگر اس صدمے کی وجہ سے انہیں لاحق کینسر کی بیماری بھی اپنا اثر دکھاتی رہی' اسی دوران ایک بار پھر بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی اور ان کی جگہ ایک بار پھر نواز شریف کی حکومت آ گئی' مگر وہ حکومت بھی زیادہ دنوں تک نہیں چل سکی' ایک بار پھر انتخابات ہوئے اور ان میں ایک بار پھر پی پی اکثریتی پارٹی سے منتخب ہوگئی مگر ان انتخابات سے پہلے ایک اہم واقعہ ہوا' بیگم نصرت بھٹو کے بڑے بیٹے میر مرتضیٰ

بھٹو سارے خطرے مول لیکر پاکستان پہنچ گئے' محترمہ بے نظیر بھٹو اس مرحلے پر میر مرتضیٰ بھٹو کی پاکستان آمد کے سخت خلاف تھیں حالانکہ ان کی یہ سوچ میر مرتضیٰ بھٹو کی خیر خواہی کا ایک حصہ تھی' ان کو جب پتہ چلا کہ میر پاکستان آنے کی تیاری کر رہے ہیں تو انہوں نے ان کو شام میں پیغام بھیجا کہ وہ ابھی پاکستان نہ آئیں بلکہ صحیح وقت کا انتظار کریں' درحقیقت وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی معلومات یہ تھیں کہ میر مرتضیٰ بھٹو کا ان کی حکومت میں قتل کر دیا جائے گا۔

دوسری طرف کچھ باخبر ذرائع کا کہنا تھا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو اپنی بہن بے نظیر بھٹو کی زندگی کی بڑی فکر تھی' انہیں جو اطلاعات ملی تھیں ان کے مطابق ایجنسیوں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کے خلاف اپنا گھیرا تنگ کرلیا ہے اور وہ کسی وقت بھی ان کی زندگی لے سکتی ہیں' یہ ایک عجیب ''اختلاف'' تھا جو دونوں طرف سے ایک دوسرے کے مفاد کے لئے جذبات پر مبنی تھا مگر افسوس کہ بیچ کے لوگوں نے دونوں میں ایک دوسرے کے خلاف منفی جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی' اس دور میں انتخابات ہو رہے تھے' محترمہ بے نظیر بھٹو نے لاڑکانہ کی ساری قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں پر پی پی کے کارکنوں کو ٹکٹ جاری کر دیئے جبکہ دو دوسری طرف میر مرتضیٰ بھٹو نے لاڑکانہ شہر سے صوبائی اسمبلی کے حلقے سے کھڑے ہونے کے لئے نامزدگی فارم بھر لئے' پی پی کے کئی خیر خواہوں کو یہ بات پسند نہ آئی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے بھائی کے لئے لاڑکانہ شہر کی نشست خالی نہیں چھوڑی جن لوگوں کے یہ جذبات تھے ان میں راقم بھی شامل تھے دوسری طرف بیگم نصرت بھٹو نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی الیکشن مہم سے ہاتھ کھینچ لئے اور انہوں نے خود کو فقط ایک سیٹ یعنی لاڑکانہ شہر کی سیٹ سے میر مرتضیٰ بھٹو کے لئے مہم چلانے کے لئے خود کو مخصوص کر دیا' بیگم نصرت بھٹو نے میر مرتضیٰ بھٹو کے لئے جو الیکشن مہم چلائی اس کی مثال ملنا مشکل ہے' وہ اس حد تک بڑے بیٹے کو منتخب کرانے کے لئے متحرک تھیں کہ لاڑکانہ کے قابل اعتماد حلقوں کے مطابق وہ ننگے پاؤں شہر کی گلی گلی اور گھر گھر گئیں اور میر مرتضیٰ بھٹو کے لئے ووٹ مانگا دوسری طرف میر مرتضیٰ بھٹو کو پی پی کا ٹکٹ نہ دیئے جانے والے ایشو پر اچانک راقم اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے

درمیان سانگھڑ کے ہیلی پیڈ پر دلچسپ گفتگو ہوئی جس کی پہلے سے کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی‘ ہوا یوں کہ پیپلز پارٹی نے سانگھڑ کے اسٹیڈیم میں ایک بڑے انتخابی جلسے کا اہتمام کیا تھا جس سے بے نظیر بھٹو اور پی پی کے دیگر رہنماؤں کو خطاب کرنا تھا‘ اس جلسے کی کوریج کرنے کے لئے حیدرآباد سے ایک پریس ٹیم لائی گئی تھی جس میں راقم بھی شامل تھا۔ جلسے سے خطاب کے بعد محترمہ اور آصف زرداری کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے مورو پہنچ کر مورو میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا‘ مورو کی قومی اسمبلی کی نشست سے غلام مصطفیٰ جتوئی کا مقابلہ آصف زرداری کر رہے تھے‘ سانگھڑ کا جلسہ ختم ہونے کے بعد مجھے محترمہ بے نظیر بھٹو کا پیغام منور سہروردی اور عبدالسلام تھہیم نے پہنچایا کہ بیگم صاحبہ آپ سے کچھ بات چیت کرنا چاہتی ہیں لہٰذا آپ ان کے ساتھ پجیرو میں سانگھڑ کے ہیلی پیڈ تک چلیں جہاں سے آپ چاہیں تو حیدرآباد چلے جائیں‘ میں اس گاڑی میں محترمہ کے ساتھ ہولیا‘ محترمہ نے جو بات کرنی تھی وہ انہوں نے ہیلی پیڈ تک پہنچتے کردی‘ نیچے اترنے پر کئی پی پی رہنما اور آصف زرداری بیچ میں کھڑے تھے اور ہمارے اطراف گول دائرے میں پی پی کے کارکن جئے بھٹو کا نعرہ لگا رہے تھے‘ آصف زرداری کے ساتھ ہیلی پیڈ کی طرف جانے سے پہلے محترمہ میری طرف آئیں‘ میرا شکریہ ادا کرنے لگیں‘ یہاں مجھے پتہ نہیں کیا ہوا کہ بنا سوچے سمجھے میں محترمہ کو کہہ بیٹھا کہ محترمہ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک اہم ایشو پر یہاں آپ سے پرائیوسی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں‘ مجھے احساس تو ہوا کہ میں غلط بات کر بیٹھا ہوں کیونکہ محترمہ کو مورو جانے کی بہت جلدی تھی مگر یہ محترمہ کی مہربانی تھی کہ انہوں نے آصف زرداری صاحب کو کہا کہ آپ چل کے ہیلی کاپٹر میں بیٹھیں میں مغل سے بات کر کے آتی ہوں‘ اس کے بعد ہمارے گرد دائرہ چھٹ گیا‘ بیچ دائرے میں فقط محترمہ اور میں رہ گئے‘ محترمہ میری طرف دیکھ رہی تھیں‘ آخر کار ان کو کہنا پڑا کہ مجھے جلدی ہے‘ آپ کو جو بات کرنی ہے وہ جلدی کریں‘ مجھ سے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی‘ بات کرتے کرتے اٹک رہا تھا‘ محترمہ نے مجھے پھر ٹوکا کہ میں آپ کی وجہ سے رکی ہوں‘ سب میرا انتظار کر رہے ہیں‘ آخر کار میں بولا اور انگریزی میں شاید کسی حد تک سخت

لہجے میں بولا' میں نے کہا ''محترمہ امید ہے کہ آپ ناراض نہیں ہونگی مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ لاڑکانہ کی سیٹ سے ٹکٹ ہر ایرے غیرے کو دے رہی ہیں جبکہ آپ کے پاس آپ کے رشتے کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کے لئے ٹکٹ نہیں ہے' محترمہ کا ردعمل دیکھ کر میں بہت پریشان ہوگیا' میں نے ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے' انہوں نے مجھے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ مغل آپ ہمارے فیملی فرینڈ اور خیر خواہ ہیں' آپ بھی ایسا سوچتے ہیں؟۔ اسی دوران انہوں نے مجھے ایک ایسی بات کہی جس کے لئے سچی بات ہے کہ میں بالکل تیار نہیں تھا' محترمہ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اچھا آپ ہم بھائی بہن میں صلح کرادیں' میں ایسی کسی بات کے لئے بالکل تیار نہیں تھا' میں نے کہا کہ محترمہ آپ مجھ پر اعتماد کررہی ہیں اس کی مہربانی مگر سچی بات یہ ہے کہ اس کے لئے میں بالکل مناسب نہیں' ایک تو مجھے ایسے معاملوں میں پڑنے کا کوئی تجربہ نہیں' دوسری بات یہ کہ میر صاحب مجھے جانتے بھی نہیں' محترمہ نے کہا کہ آپ اس کام کے لئے بالکل مناسب ہیں۔

دوسری بات یہ کہ ''میر'' آپ کو اچھی طرح سے جانتے ہیں جب آپ ان سے ملیں گے اور ان کا ردعمل دیکھیں گے تو حیران ہوجائیں گے' میں یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ میں ایک صحافی ہوں' صحافی ایسے معاملوں میں نہیں پڑتے کیونکہ یہ تو ایک مکمل سیاسی کردار ہوگا' محترمہ نے کہا کہ مغل میں دنیا کے ایسے کئی ممتاز صحافیوں کے نام گنوا سکتی ہوں جنہوں نے ایسے سیاسی کردار ادا کئے' محترمہ مجھے اپنے دلائل سے ناک آؤٹ کرچکی تھیں مگر آخر میں انہوں نے مجھے کہا کہ میں آپ سے امید کرتی ہوں کہ آپ انکار نہیں کرینگے' اب میرے پاس یہ بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا' میں نے محترمہ سے وعدہ کیا کہ میں پوری کوشش کرونگا' باقی اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مجھے اس کوشش میں کامیاب کرے' میں ان دنوں حیدرآباد میں تھا' دوسرے دن اخبارات میں آیا کہ میر مرتضیٰ بھٹو ایک دن کے بعد 71 کلفٹن میں پریس کانفرنس سے خطاب کررہے ہیں میں بھی اس دن 71 کلفٹن پہنچ گیا' میں میر صاحب سے تخلیہ میں ملنے کی

تاک میں تھا' پریس کانفرنس سے خطاب کرنے کے بعد وہ 70 کلفٹن کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں سارے لوگوں سے ملتے جارہے تھے یہ بات مشہور ہے کہ میر صاحب اپنے کارکنوں سے عشق کرتے تھے' میں 70 کلفٹن کے دروازے کے نزدیک ایک کونے میں کھڑا ہوگیا کہ دروازے کی طرف آئے تو مجھ پر نظر ضرور پڑے گی نگران کے ساتھ جو ورکر تھا وہ میرے ساتھ اس وقت کراچی سینٹرل جیل میں تھا جب صحافیوں کی تحریک چل رہی تھی اور یہ جوان بھٹو کی گرفتاری کے خلاف مظاہرے کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا' وہ جیل میں بھی میری عزت کرتے تھے' اس کارکن کی جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی' اس نے میر کے ہاتھ پکڑ لئے اور سیدھا لیکر میرے پاس آئے' پتہ نہیں میری کتنی تعریفیں کرتے ہوئے انہوں نے میر صاحب کو کہا کہ سب کو چھوڑیں سب سے پہلے مغل سے ملیں' میر صاحب بھی بڑی محبت سے ملے' ہمارے ہاتھ ملے ہوئے تھے میں نے کہا کہ میر صاحب میں حیدرآباد سے خاص طور پر آپ سے ملنے آیا ہوں' مجھے آپ سے ایک انتہائی اہم ایشو پر تخلیہ میں ملاقات کرنی ہے۔

میر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ میرے ساتھی دروازے پر میرے انتظار میں کھڑے ہیں' ہمیں کہیں جانا ہے ابھی نہیں کسی اور وقت ضرور ملاقات کرینگے اس کے بعد میں نے تین چار بار 70 کلفٹن کے چکر لگائے مگر افسوس کہ ملاقات نہ ہوسکی اور محترمہ سے کیا گیا وعدہ پورا نہیں کرسکا' اس مرحلے پر میں محترمہ کے لئے میر مرتضیٰ کے احترام اور محبت کے بارے میں بھی ایک بات یہاں رپورٹ کرنا مناسب سمجھوں گا' یہ بات مجھے اسلام آباد میں ایک انگریزی اخبار کے اس وقت کے بیورو چیف نے بتائی۔ اس نے بتایا کہ وزیراعظم بےنظیر بھٹو کو قومی اسمبلی سے سالانہ خطاب کرنا تھا' مسلم لیگ کی طرف سے اعلان کیا گیا تھا کہ وہ محترمہ کی تقریر میں انتشار پیدا کرینگے' اس صحافی دوست نے بتایا کہ جب محترمہ ڈائس پر تقریر کرنے آئیں تو پی ایم ایل (ن) کے ایم این اے ہر طرف سے ڈائس کی طرف بڑھنے لگے اسی دوران پی پی ایم این ایز نے دیوار بنادی کہ کوئی بھی کراس کرکے محترمہ کی طرف نہ بڑھ سکے' اسی صحافی دوست نے کہا کہ

جب محترمہ نے تقریر شروع کی اور پی ایم ایل (ن) ایم این ایز اور پی پی ایم این ایز اپنی اپنی تیاریاں کرنے لگے تو پریس گیلری میں بیٹھے سارے صحافی ہاؤس کی دیوار پر کھڑے ہو گئے اور سب نیچے دیکھ رہے تھے' اس صحافی دوست نے کہا کہ اچانک اس کی نظر مہمانوں کی گیلری میں بیٹھے میر مرتضیٰ بھٹو پر جا پڑی' اس نے کہا کہ میں نے میر کو بہت بے چین محسوس کیا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی وقت بھی کچھ بھی کر سکتے ہیں لہٰذا انہوں نے اپنی نظر میر مرتضیٰ سے نہیں ہٹائی' اس نے بتایا کہ جب پی ایم ایل (ن) کے ایم این اے محترمہ کی طرف بڑھنے لگے تو میر مرتضیٰ بھٹو خاموشی سے دیوار پر چڑھ گئے وہ چھلانگ لگا کر اسمبلی میں کودنے والے تھے' ان کے ارادے بالکل واضح تھے کہ اگر پی ایم ایل (ن) کے ایم این ایز محترمہ کے نزدیک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ بھی نیچے چھلانگ مار دیں گے مگر یہ موقع نہیں آیا کیونکہ بیچ میں پی پی کے ایم این ایز آ گئے اور بی بی تقریر مکمل کر کے واپس اپنی سیٹ پر آ گئیں اور میر مرتضیٰ بھٹو بھی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے خاموشی سے اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔

فقط یہ دو مثالیں میرے لئے یہ یقین کرنے کے لئے کافی ہیں کہ بھائی بہن آخری وقت تک ایک دوسرے سے بے حد محبت بھی کرتے تھے اور عزت بھی کرتے تھے' اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں کی صفوں میں ایسے عناصر داخل تھے جن کا مشن دونوں میں مخاصمت پیدا کرنا تھا جب ایک بدنصیب واقعہ میں 70 کلفٹن کے قریب میر مرتضیٰ بھٹو کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا اور اس کی ارتھی مڈایسٹ اسپتال میں رکھ دی گئی' اسلام آباد میں بے نظیر بھٹو کو بتایا گیا کہ میر کو گولی مار کر شدید زخمی کر دیا گیا ہے' وہ بے چین ہو گئیں۔ انہوں نے کہا کہ انہیں جلد کراچی پہنچاؤ' ہوائی جہاز میں سارے سفر کے دوران محترمہ کو بتایا جاتا رہا کہ میر زخمی ضرور ہے مگر ابھی زندہ ہے حالانکہ ان کا زور تھا کہ انہیں ہوائی اڈے سے سیدھا اسپتال لایا جائے مگر انہیں بلاول ہاؤس میں لایا گیا' بلاول ہاؤس میں اپنے کمرے کے باہر ان کے دو نوکروں کی گفتگو محترمہ کے کانوں میں پڑی تو ننگے پاؤں چیختی ہوئی بلاول ہاؤس سے باہر نکلی اور کہا کہ ان کے بھائی کو مار دیا گیا ہے اور آپ مجھے

یہاں لے آئے ہیں، اسی طرح ایک اطلاع یہ ہے کہ اس وقت کے صدر فاروق لغاری بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو سے تعزیت کرنے آئے تو ایک ایم این اے نے کمرے سے باہر نکل کر بتایا کہ محترمہ چیخ کر فاروق لغاری سے کہہ رہی ہیں کہ جب میرے احکامات تھے کہ میر پر گولی نہ چلائی جائے تو آخر کس نے میر پر گولی چلائی، مگر فاروق لغاری خاموش رہے، بیگم نصرت بھٹو جن کے ہوش حواس اس وقت کسی حد تک ختم ہو چکے تھے، فاروق لغاری کے چہرے کو دیکھ کر اتنے غصے میں آئیں کہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئیں، تیزی سے باہر نکلنے کے دوران دیوار سے ٹکرا گئیں اور گر گئیں بہر حال بیگم نصرت بھٹو مختلف صدمات کی وجہ سے پہلے ہی نڈھال ہو چکی تھیں، اب ان کے حواس تیزی سے جواب دینے لگے محترمہ بے نظیر بھٹو ان کو دبئی لیکر گئیں جہاں صنم بھٹو بھی ان کی تیمارداری کرتی تھیں، اسی دوران بیگم نصرت بھٹو کی آخری اولاد محترمہ بے نظیر بھٹو کو دبئی سے پاکستان لوٹنے کے بعد راولپنڈی کے جلسہ عام سے باہر نکلتے وقت خودکش حملہ کر کے شہید کر دیا گیا مگر جب بیگم صاحبہ تک بے نظیر بھٹو صاحبہ کی شہادت کی خبر پہنچی تو وہ پہلے ہی سکتے میں تھیں، وہ پہلے ہی نہ اس جہاں میں تھیں، نہ اس جہاں میں!

شاید یہ قدرت کی بیگم نصرت بھٹو پر مہربانی تھی کہ جب ان تک اپنی پیاری بڑی بیٹی بے نظیر بھٹو کی شہادت کی خبر پہنچے تو وہ پہلے ہی ہوش گنوا بیٹھی تھیں، آخر میں پاکستان کی اس بہادر، دلیر اور مدبر سیاسی خاتون کا انتقال ہوا اور انہیں 25 اکتوبر 2011ء میں اپنے بچوں کے درمیان اور شوہر ذوالفقار علی بھٹو کی سائیڈ میں ابدی نیند کے حوالے کیا گیا۔ بہت کم لوگوں کو پتہ ہے کہ گڑھی خدا بخش بھٹو کا قبرستان موہن جودڑو جو دنیا کی خیر سب سے پرانی انسانی تہذیب کا نشان ہے، ذوالفقار علی بھٹو نے جیل میں لکھے گئے وائٹ پیپر میں لکھا تھا ''آپ مجھے پھانسی دیدیں مگر یقین دلاتا ہوں کہ جب بھی پاکستان میں عوامی مارچ ہوگا تو اس میں دریائے سندھ کے اس پار قبر میں بیٹھے بھی شامل ہوں گے'، مگر اب تو گڑھی خدا بخش کے قبرستان میں ذوالفقار علی بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو کے علاوہ دیگر شہداء یعنی شہید بے نظیر بھٹو، شہید میر مرتضٰی بھٹو اور شہید شاہنواز بھٹو بھی مدفن ہیں، اب تو جب عوام کی فتح کا مارچ ہوگا تو اس کی آواز یہ سب

شہید سن سکیں گے اور شاید وہ مرحلہ بھی آ جائے جب مارچ کرتا ہوا عوام کا جم غفیر بھٹو خاندان کے ان شہیدوں کی ان کی قربانیوں پر گڑھی خدا بخش پہنچ کر سلامی دے۔ امید رکھنی بھی چاہیے کہ یہ دن بھی آئے گا' اس دن یقیناً بھٹو کی اولاد تو خوش ہوگی مگر خاص طور پر مادر جمہوریت بیگم نصرت بھٹو' شہید ذوالفقار علی بھٹو کی طرف مسکرا کر دیکھ رہیں ہوں گی' یہ مسکراہٹ اور بھٹو کا خوشی میں ردعمل دونوں انمول ہونگے۔ تاریخ اور عوام بھٹو خاندان کی ان قربانیوں کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ عوام کے فتح مارچ کو دیکھ کر جہاں بھٹو خاندان کے یہ شہید افراد مسکرا رہے ہوں گے وہیں تاریخ بھی تو یہ سب کچھ دیکھ کر مسکرا رہی ہوگی۔

بھٹو خاندان کی اولاد

پاکستان کے پہلے منتخب وزیراعظم شہید ذوالفقار علی بھٹو نے دو شادیاں کی تھیں' ان کی بڑی بیگم جن کا تعلق بھٹو خاندان سے تھا جو ان کی پہلی بیگم تھیں ان کا نام امیر بیگم تھا اور ان سے بھٹو صاحب کی کوئی اولاد نہیں ہوئی جبکہ بھٹو صاحب نے دوسری شادی ایرانی نسل کی بیگم نصرت اصفہانی سے کی جو شادی کے بعد بیگم نصرت بھٹو کہلائیں اور بھٹو صاحب کو جو بھی اولاد ہوئی وہ بیگم نصرت بھٹو سے ہوئی' جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں' بڑی بیٹی کا نام محترمہ بے نظیر بھٹو تھا جو سب سے بڑی تھیں جبکہ چھوٹی بیٹی کا نام محترمہ صنم بھٹو ہے' بیٹوں میں سے بڑے بیٹے کا نام میر مرتضیٰ بھٹو تھا جو ان کے پڑدادا کا نام تھا' باقی چھوٹے بھائی کا نام شاہنواز بھٹو تھا ان کا یہ نام ان کے دادا سر شاہنواز بھٹو پر رکھا گیا تھا۔ بھٹو خاندان کی ان اولاد کا فرداً فرداً مختصر طور پر احوال اس طرح ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو: ولادت 21 جون 1953ء' شہادت 27 دسمبر 2007ء تھی' محترمہ پاکستان کی 11ویں وزیراعظم بنیں۔

میر غلام مرتضیٰ بھٹو: تاریخ ولادت 19 ستمبر 1954ء اور ان کی بھی شہادت ہوئی جو 20 ستمبر 1998ء کو ہوئی' انہوں نے جنرل ضیاء کی فوجی حکومت کی طرف سے ان کے والد سابق وزیر اعظم شہید ذوالفقار علی بھٹو کو 1981ء میں پھانسی دیئے جانے کے بعد ''الذوالفقار'' نامی تنظیم کی

بنیاد ڈالی' انہوں نے رجعت پسند سیاستدان چوہدری ظہور الٰہی کے قتل اور پاکستان کے ایک مسافر بردار ہوائی جہاز کو ہائی جیک کرنے کی ذمہ داری قبول کی' پاکستان میں ایک فوجی عدالت کی طرف سے میر مرتضیٰ بھٹو کو ان کی غیر موجودگی میں موت کی سزا سنائی گئی۔

بھٹو خاندان کی تیسری اولاد شاہنواز بھٹو تھے جن کی تاریخ ولادت 21 نومبر 1958ء تھی جبکہ فرانس کے ایک سمندری علاقے میں انہیں قتل کیے جانے کی تاریخ 18 جولائی 1985ء تھی۔

بھٹو خاندان کی آخری اولاد ان کی چھوٹی بیٹی صنم بھٹو ہیں' ان کی تاریخ پیدائش 28 جنوری 1957ء تھی اور وہ الحمدللہ حیات ہیں' اس طرح بھٹو خاندان کی اولاد میں سے واحد صنم بھٹو زندہ ہیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی ابتدائی تعلیم کراچی میں حاصل کی' انہوں نے ابتداء میں کراچی کے لیڈی جیننگس نرسری اسکول اور کونوینٹ آف جیس اینڈ میری اسکول میں داخلہ لیا' بعد میں انہوں نے راولپنڈی کے پریزنٹیشن کونوینٹ اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے مری کے جیسس اینڈ میری کونوینٹ اسکول میں تعلیم حاصل کی' انہوں نے 15 سال کی عمر میں اولیول امتحان پاس کیا' اس کے بعد انہوں نے اے لیول کی تعلیم مکمل کرنے کے لئے کراچی گرامر اسکول میں داخلہ لیا' پاکستان میں ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو نے 1969ء سے 1973ء تک اعلیٰ تعلیم امریکہ میں حاصل کرنے کی ابتداء کی' اس سلسلے میں انہوں نے ہارورڈ کے ریڈکلف کالج میں داخلہ لیا جہاں انہوں نے بی اے کی ڈگری آنرز کی حیثیت میں حاصل کی' بعد میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنا اکثر وقت ہارورڈ میں گزارا' محترمہ نے اپنے اس دور کو ایک مرحلے پر ''میرے انتہائی خوشی سے بھرے سال'' قرار دیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان سالوں میں انہوں نے یہاں جو تعلیم حاصل کی اس نے جمہوریت میں میرے یقین کو اور پختہ کیا۔ بعد میں 1995ء میں پاکستان کی وزیراعظم کی حیثیت میں ہارورڈ لا اسکول کے لئے حکومت کی طرف سے تحفہ پیش کیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے بعد میں 1973ء سے 1977 کے دوران برطانیہ میں تعلیم حاصل کی جہاں انہوں نے مارگریٹ ہال میں فلاسفی' سیاست اور اقتصادیات کی تعلیم حاصل کی' بعد میں انہوں نے آکسفورڈ میں داخلہ لیا جہاں انہوں نے

انٹرنیشنل کورسز' انٹرنیشنل لا اور ڈپلومیسی میں اضافی کورس کیے' اس کے بعد انہوں نے سینٹ سیڈرسٹ کالج آکسفورڈ میں داخلہ لیا اور دسمبر 1976ء میں وہ آکسفورڈ یونین کی صدر منتخب ہوئیں' یہ کسی ایشیائی طالبہ کے لئے ایک بہت بڑا اعزاز تھا' اسی دوران ان کے والد جناب ذوالفقار علی بھٹو بنگلا دیش کی آزادی کے بعد جب پاکستان کے سربراہ بنے اور اس حیثیت میں وہ پاکستان کے ایک اعلیٰ سطحی وفد کے سربراہ کی حیثیت میں ہندوستان گئے جہاں انہوں نے ہندوستان کے وزیراعظم اندرا گاندھی کے ساتھ مذاکرات کیے اور ان مذاکرات کے نتیجے میں شملہ معاہدہ ہوا جس کے نتیجے میں نہ فقط 90 ہزار پاکستانی جنگی قیدی آزاد ہوکر پاکستان پہنچے بلکہ 1971ء کی جنگ میں جو پاکستانی علاقے ہندوستان کی تحویل میں چلے گئے تھے وہ بھی واپس پاکستان کو ملے' اس وفد میں نوجوان محترمہ بے نظیر بھٹو بھی شامل تھیں اور ان مذاکرات میں اپنے والد کی مدد کی اور اس طرح اتنی کم عمری میں انہوں نے حساس خارجہ تعلقات کو سنبھالا۔ 18 دسمبر 1987ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کی شادی کراچی میں آصف زرداری سے ہوئی جس کا عوامی جشن کراچی کے علاقے لیاری میں منایا گیا' 1977ء میں جنرل ضیاء الحق کی قیادت میں پاکستان کی فوج نے محترمہ بے نظیر بھٹو کے والد جناب ذوالفقار علی بھٹو کو وزارت عظمیٰ سے ہٹایا اور بعد میں نواب محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں انہیں پھانسی دیدی گئی' ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے نتیجے میں ملک بھر میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت کے خلاف بے پناہ نفرت پیدا ہوگئی جو بتدریج احتجاج میں تبدیل ہوتی گئی حالانکہ بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے بعد جہاں ملک بھر میں پی پی رہنماؤں اور کارکنوں کو سینکڑوں کی تعداد میں گرفتار کرلیا گیا تھا وہیں محترمہ بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو کبھی نظر بند کیا جاتا تو کبھی جیل میں بند کیا جاتا' یہ صورتحال چھ سال تک جاری رہی' یہ سلسلہ تب تک جاری رہا جب اگست 1988ء میں بہاولپور کے نزدیک ایک ہوائی حادثے میں کئی اور لوگوں کے ساتھ جنرل ضیاء الحق بھی فوت ہوگیا' جناب ذوالفقار علی بھٹو کے گرفتار کیے جانے کے بعد ہی بیگم نصرت بھٹو کو پارٹی نے اپنا چیئرمین بنادیا تھا' جنرل ضیا کے مرنے کے بعد ہونے والے انتخابات پارٹی نے محترمہ بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی قیادت میں لڑے اور پیپلز پارٹی ملک بھر میں واضح اکثریت سے کامیاب ہوکر سامنے آئی جس کے نتیجے میں ان

انتخابات کے بعد حکومت پیپلز پارٹی نے بنائی اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو پاکستان کی وزیراعظم کے طور پر منتخب کر دیا گیا' محترمہ بے نظیر بھٹو نے 2 دسمبر 1988ء کو پاکستان کی 11 ویں وزیراعظم کا چارج سنبھالا' اسی طرح وہ پاکستان کی اور کسی مسلم ملک کی پہلی منتخب وزیراعظم بنیں' جب یہ انتخابات ہوئے تو سینیٹ کے چیئرمین غلام اسحاق خان تھے اور فوج کے نائب چیف آف اسٹاف ریٹائرڈ جنرل اسلم بیگ اور آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل حمید گل تھے' ان تینوں کو ایک خاتون کی وزارت عظمیٰ قبول نہیں تھی' اس ٹولے نے پوری کوشش کی کہ اول تو محترمہ بے نظیر بھٹو ملک کی وزیراعظم نہ بنیں اور اگر ان کو بنایا جانا ضروری ہو تو اس کی کارکردگی کو کسی خاص رخ میں محدود کر دیا جائے' یہی وجہ ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی طرف سے وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھانے کے چند سال بعد ان کے خلاف اسمبلی میں عدم اعتماد کی تحریک پیش کی گئی' بعد میں یہ بات راز نہ رہی کہ اس تحریک کے پیچھے کن قوتوں کا ہاتھ تھا' مگر بہر حال یہ تحریک ناکام رہی مگر ان ''قوتوں'' اور ملک کے دائیں بازو کی قوتوں نے دوبارہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خلاف سازشیں جاری رکھیں' ان سازشوں میں پاکستان کے اس وقت کے صدر غلام اسحاق خان کا کلیدی کردار تھا' ان سازشوں میں کچھ بین الاقوامی قوتوں کا بھی ہاتھ تھا' آخر کار یہ سازشیں کامیاب ہوئیں اور صدر غلام اسحاق خان نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت اور اس وقت کی اسمبلیوں کو ختم کیا اور دوبارہ انتخابات کرائے گئے جن میں دائیں بازو کے عناصر کو کامیاب کرایا گیا اور انتخابات کے نتیجے میں وزیراعظم نواز شریف اور پنجاب کے وزیراعلیٰ ان کے بھائی شہباز شریف بنے اور محترمہ بے نظیر بھٹو پہلی بار پاکستان میں لیڈر آف دی اپوزیشن کے طور پر نمودار ہوئیں' نواز شریف کی حکومت بھی زیادہ دن نہ چل سکی' دوبارہ انتخابات ہوئے جس میں ملک بھر سے پیپلز پارٹی ایک بار پھر اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی' اس طرح محترمہ بے نظیر بھٹو دوسری بار پاکستان کی وزیراعظم بنیں' مگر عوام دشمن قوتوں کی سازشیں پی پی حکومت کے خلاف جاری رہیں' آخر کار انتخابات ہوئے جس میں نواز شریف کی پارٹی کو ملک بھر سے بڑی اکثریت سے کامیاب کرانے کے اقدامات کیے گئے اور نواز شریف بھی دوبارہ وزیراعظم اور دوسری طرف محترمہ بے نظیر بھٹو بھی دوبارہ لیڈر آف دی اپوزیشن بنیں' کچھ سالوں کے اندر اس وقت کے چیف آف اسٹاف جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف

کی حکومت کا تختہ الٹ دیا' محترمہ بے نظیر بھٹو تو پہلے سے ہی ملک بدری کی زندگی گزار رہی تھیں' مگر اب نواز شریف کی باری تھی' کچھ عرصے کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو ملک واپس آئیں تو کراچی کے ہوائی اڈے پر ملک بھر سے آئے ہوئے لاکھوں لوگوں نے ان کا استقبال کیا' یہ جلوس جاری تھا تو محترمہ بے نظیر بھٹو کی گاڑی پر خودکش حملہ کیا گیا' وہ ان دھمکیوں کے باوجود ملک واپس آئی تھیں کیونکہ وہ عوام سے الگ نہیں رہ سکتی تھیں' اس حملے میں محترمہ بے نظیر بھٹو خود تو معجزانہ طور پر بچ گئیں مگر ملک بھر سے آئے ہوئے سیکڑوں پی پی کارکن شہید ہوئے یا زخمی ہو گئے' اس کے باوجود محترمہ نے عوام سے رابطہ کا سلسلہ منقطع نہیں کیا اور وہ ملک بھر کے عوامی دورے پر نکل پڑیں' اس دورے کے دوران پنڈی کے جلسے کے بعد ان پر خودکش حملہ کیا گیا جس میں وہ شہید ہو گئیں۔

میر مرتضیٰ بھٹو: مرتضیٰ بھٹو نے ابتدائی تعلیم سینٹ ماریاس اکیڈمی راولپنڈی' بعد میں انہوں نے او لیول کا امتحان 1971ء میں کراچی گرامر اسکول سے پاس کیا' مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے مرتضیٰ بھٹو ہارورڈ یونیورسٹی روانہ ہو گئے جہاں انہوں نے بیچلرز ڈگری حاصل کی' کچھ وقت کے لئے وہ ٹیکساس کے ایک طالب علم اور ہوسٹن کے میرِ بل وائٹ کے ساتھ ایک کمرے میں رہے' 1976ء میں انہوں نے ایک بین الاقوامی ایشو پر ایک اہم تھیسز لکھی' ان کی اس تھیسز کا تعلق ایٹمی اسلحہ کے پھیلنے سے تھا' اس تھیسز کا ایک مقصد ہندوستان کی طرف سے کیے گئے ایٹمی تجربے اور ایٹمی اسلحہ تیار کرنے کے ارادوں کو ٹارگٹ بنانا بھی تھا' مرتضیٰ بھٹو یہ سب کچھ محض ہندوستان کی دشمنی میں نہیں کر رہے تھے بلکہ انہوں نے اپنے والد کی سیاست سے جو کچھ سیکھا تھا یا ان کو اپنی والدہ بیگم نصرت بھٹو کی طرف سے جو تربیت کی گئی تھی اس کے نتیجے میں وہ بچپن سے امن کے داعی اور غریب و نچلے طبقوں سے زبردست ہمدردی رکھتے تھے' وہ فقط نظریاتی طور پر ہی نہیں عملی طور پر بھی ان رجحانات کی ترغیب دیتے رہتے تھے' حالانکہ وہ ایک بڑے خاندان کے ایک فرد تھے مگر جو لوگ ان کے بچپن سے واقف ہیں وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ انہوں نے بچپن میں 70 کلفٹن میں ایک جھونپڑی بنائی ہوئی تھی اور اکثر وہاں وقت گزارتے تھے' جب 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاءالحق کی قیادت میں فوج نے ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹا تھا تو اس وقت مرتضیٰ بھٹو پاکستان میں تھے' اس واقعہ کے بعد مرتضیٰ بھٹو اپنے خاندان کے

دیگر افراد کے ساتھ لاڑکانہ آ گئے حالانکہ اس وقت وہ اکتوبر 1977ء میں ہونے والے انتخابات کے لئے تیاریاں کر رہے تھے مگر جب 16 اکتوبر 1977ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کرلیا گیا تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو ہدایات جاری کیں کہ وہ ملک سے روانہ ہو جائیں مگر ذوالفقار علی بھٹو کو عدالت کی طرف سے سزا سنائے جانے کے بعد انہوں نے لندن میں اپنے چھوٹے بھائی شاہنواز بھٹو کے ساتھ مل کر جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت کے خلاف بین الاقوامی سطح پر تحریک شروع کی' بعد میں یہ تحریک اس حد تک آگے بڑھی کہ دونوں بھائی اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ افغانستان منتقل ہو گئے جہاں الذوالفقار نام کی تنظیم بنا کر پاکستان کی فوجی حکومت پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ فوری طور پر عام انتخابات کرائیں بعد میں کچھ عرصے کے بعد وہ افغانستان سے واپس چلے گئے' شاہنواز بھٹو فرانس چلے گئے اور مرتضیٰ بھٹو نے شام میں اپنا کیمپ قائم کیا' افغانستان میں رہنے کے دوران دونوں بھائیوں مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو نے افغانستان کے ایک شاہی پختون خاندان سے تعلق رکھنے والی دو بہنوں سے شادیاں کیں' مرتضیٰ بھٹو کو اپنی افغان بیوی جس سے اس کی ایک بیٹی تھی مگر فرانس کے سمندر کے شہر نائیس میں پراسرار انداز میں اپنے بھائی شاہنواز بھٹو کے قتل کے بعد انہوں نے اپنی افغان بیوی کو طلاق دیدی کیونکہ نہ فقط بھٹو خاندان بلکہ خود فرانس کے تحقیقاتی اداروں کو شک تھا کہ شاہنواز بھٹو کو ان کی افغان بیوی ریحانہ نے زہر دیکر قتل کر دیا ہے' بعد میں شاہنواز بھٹو کی لاش محترمہ بےنظیر بھٹو لیکر پاکستان آئی تھیں اور گڑھی خدا بخش کے قبرستان میں شاہنواز بھٹو کی نماز جنازہ اور تدفین کی رسمی کارروائی میں لاکھوں سوگوار لوگوں نے شرکت کی۔ اس مرحلے پر اس بات کا ذکر کرنا بھی بلاجواز نہیں ہوگا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے حوالے سے ہالا میں دو ہالا کانفرنسیں منعقد ہوئیں' پہلی ہالا کانفرنس کے میزبان مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ تھے اور یہ کانفرنس پاکستان پیپلز پارٹی کے بننے کے فوری بعد ہوئی جبکہ دوسری ہالا کانفرنس کے میزبان مخدوم خلیق الزمان تھے' اس کانفرنس کی صدارت محترمہ بےنظیر بھٹو نے کی' اس کانفرنس میں پی پی کے ایک عوامی اور انقلابی رہنما قاضی محمد بخش دھامراہ کی تقریر بڑی اہم اور دلچسپ تھی' اس وقت غلام مصطفیٰ جتوئی پی پی چھوڑ چکے تھے' قاضی محمد بخش دھامراہ نے اپنی تقریر میں جتوئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ بےنظیر بھٹو صاحبہ کو ''چھوکر'' (لڑکی) کہہ کر مخاطب

کرتے ہیں' اس کے بعد جذباتی ہو کر انہوں نے سوال کیا کہ کیا بھائیوں کی لاش بہنیں دفناتی ہیں' لہٰذا انہوں نے کہا کہ ''بے نظیر بھٹو لڑکی نہیں بلکہ سندھ کا ایک بہادر سپوت (بیٹا) ہے'' بہرحال شام سے جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت کے خلاف تحریک چلانے کے دوران میر مرتضٰی بھٹو نے محسوس کیا کہ ان کی بہن' جو اس وقت پاکستان کی وزیراعظم تھیں کی جان خطرے میں ہے' ان کو یہ اندیشہ ان اطلاعات کی وجہ سے پیدا ہوا کہ ان کے خاندان کے دشمن عناصر نے خفیہ طور پر محترمہ بے نظیر بھٹو کا گھیراؤ کر لیا' اطلاعات کے مطابق محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی یہ اطلاعات موصول ہوئیں کہ میر مرتضٰی بھٹو پاکستان لوٹنا چاہتے ہیں' دوسری طرف محترمہ بے نظیر بھٹو کی اطلاعات یہ تھیں کہ اگر مرتضٰی بھٹو اس وقت پاکستان آئے تو ان کو ان کی حکومت ہوتے ہوئے قتل کرا دیا جائے گا' لہٰذا وہ اس بات کے حق میں نہیں تھیں کہ میر مرتضٰی بھٹو فی الحال پاکستان لوٹیں' یہ ایک عجیب صورتحال تھی' دونوں بہن بھائی کی ایک دوسرے سے محبت ساری حدود پار کر رہی تھی مگر دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں خوف تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے' دونوں کے کچھ قریبی حلقوں کو جب یہ علم ہوا تو اس کو ایکسپلائٹ کیا اور ایک دوسرے کے درمیان خلیج پیدا کرنے کی کوشش کی گئی' بہرحال میر مرتضٰی بھٹو محترمہ بے نظیر بھٹو کی مخالفت کے باوجود پاکستان پہنچ گئے' اس وقت ایسی صورتحال پیدا ہوگئی کہ بھٹو خاندان کے دشمنوں نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میر مرتضٰی بھٹو کو قتل کر دیا جبکہ کچھ عرصے کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی شہید کر دیا گیا' اس طرح سوائے صنم بھٹو کے جس نے اب تک خود کو سیاست سے دور رکھا ہوا ہے' بھٹو خاندان کے سب افراد ایک ایک کر کے شہید اور فنا کر دیئے گئے۔

سیاسی جدوجہد

نشانِ پاکستان

بشیر ریاض

بیگم نصرت بھٹو عزم و استقلال کا پیکر اور غیر جمہوری قوتوں کے خلاف مزاحمت کی علامت تھیں۔ جنرل ضیاء کے بدترین مظالم کا انہوں نے جس جرأت و بہادری سے مقابلہ کیا وہ ایک شاندار مثال ہے۔ انہوں نے مسلسل قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، لیکن سر نہیں جھکایا۔ بیگم صاحبہ نے اپنے کارکنوں کو جنرل ضیاء کی وحشیانہ کارروائیوں کے خلاف یہ پیغام دیا تھا کہ ہمارے سر کٹ سکتے ہیں لیکن جھک نہیں سکتے۔ ہم پاکستان کے لیے نسل در نسل لڑیں گے۔ اس اعلان نے کارکنوں میں بہت حوصلہ اور جوش پیدا کر دیا اور انہوں نے جنرل ضیاء کے ظلم و تشدد کا آہنی عزم کے ساتھ مقابلہ کیا۔

بھٹو صاحب کی شہادت کے بعد بیگم نصرت بھٹو بطور چیئرمین پی پی مارشل لاء کے خلاف سینہ سپر ہو گئیں۔ انہوں نے جرأت و بہادری کے ساتھ عوام کے جمہوری حقوق کی آواز بلند کی، انہیں جدوجہد سے روکنے کے لیے جیل اور گھر میں قید کر دیا گیا مگر اس بہادر خاتون نے مضبوط اعصاب کے ساتھ تمام مشکلات و مصائب برداشت کیے، اپنی قائد کی پیروی میں پارٹی کارکنوں نے جمہوری جدوجہد میں بہادری کے نئے باب رقم کیے اور اپنے کردار و عمل سے سیاست کو عبادت کا درجہ دے کر پاکستان پیپلز پارٹی کا پرچم سر بلند رکھا۔ انہیں یہ تقویت بیگم صاحبہ

کی ولولہ انگیز قیادت سے ملی۔ قذافی سٹیڈیم میں بیگم صاحبہ پر تشدد کیا گیا اور زخمی بیگم صاحبہ کی یہ تصویر تمام دنیا میں شائع ہوئی جس سے جنرل ضیاء کی بربریت آشکار ہوئی اور جنرل ضیاء کے مارشل لاء کا سیاہ چہرہ بے نقاب ہوا۔

بیگم نصرت بھٹو پر دوسرے درجے کا ذہنی تشدد بھی کیا گیا۔ ان کی جواں سال بیٹی بے نظیر کو قید اور نظر بند کر کے بیگم صاحبہ سے علیحدہ رکھا گیا۔ سکھر جیل میں بے نظیر بھٹو پر جو بہیمانہ تشدد کیا گیا اور جس گرمی میں انہیں رکھا گیا وہ ان کا حوصلہ نہ توڑ سکا، انہوں نے یہ سب کچھ برداشت کیا اور نئے عزم کے ساتھ جنرل ضیاء کے جبر کو چیلنج کر کے اس کی نیندیں حرام کر دیں۔

قائدعوام کے عدالتی قتل کے بعد بیگم نصرت بھٹو نے سیاسی اور جمہوری جدوجہد تیز کر دی۔ پاکستانی عوام ان کے ساتھ تھے۔ انجام کار جنرل ضیاء نے اپنی بزدلی کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے 16 اکتوبر 1979ء کو انتخابات منسوخ کر دیئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے ترجمان اخبار مساوات کو بند کر دیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔

فوجی ڈکٹیٹر کی اس بزدلانہ کارروائی سے کارکنوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا لیکن انہوں نے حوصلہ مندی سے جبر اور ظلم برداشت کیا۔ انہوں نے کوڑے کھانے کی مثالیں قائم کیں۔ اور جئے بھٹو کے نعروں سے سیاسی فضا گونجنے لگی۔ صحافی بھی ڈکٹیٹر کے عتاب کا نشانہ بنے انہوں نے کوڑے کھائے اور جیل کاٹی۔

یہ بدترین تاریک دور تھا۔ بیگم صاحبہ نے اپنے دونوں بیٹوں مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو کی جدائی کا غم برداشت کیا۔ انہوں نے جنرل ضیاء کی امیدوں کی کمر توڑ دی۔ ان کا جذبہ حریت اور خودی تابناک رہا۔ بیگم صاحبہ طویل قید کے دوران پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا ہوئیں۔ جنرل ضیاء کی یہ کوشش تھی کہ وہ اس موذی مرض سے جانبر نہ ہو سکیں لیکن عوامی اور بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے انہیں بغرض علاج بیرونِ ملک جانے کی اجازت دیدی۔ بیگم صاحبہ 22 نومبر 1982ء کو جرمنی کے شہر میونخ پہنچیں۔ ان کی صحت بے حد تشویشناک تھی۔ ان کی ہمشیرہ مسز بہجت

حریری تیمارداری کے لیے ان کے ساتھ تھیں۔ بیگم صاحبہ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتی تھیں۔ بیگم نصرت بھٹو علیل تھیں لیکن یورپی ملکوں سے آئے ہوئے پارٹی ورکروں کے ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا!

''ملک میں جمہوریت اور مارشل لا کے خاتمے، انسانی حقوق اور آئین کی بحالی کے لیے آگے بڑھیں اور مارشل لاء کی پابندیوں کی پرواہ کیے بغیر سراپا احتجاج بن جائیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور دیگر جمہوریت پسند پاکستانیوں کا یہ فرض ہے کہ ملک میں مارشل لاء کے بظاہر مضبوط لیکن اندر سے کھوکھلے ستونوں کو آخری ٹھوکر لگا کر زمین بوس کر دیں۔''

بیگم نصرت بھٹو نے بے نظیر بھٹو کے بارے میں فخر سے کہا کہ ''وہ بڑی ذہین، بہادر اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والی لڑکی ہے اور پاکستان پیپلز پارٹی کو کامیابی سے ہمکنار کرانے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ بھٹو شہید نے اپنی بیٹی کو بطور خاص سیاسی تربیت دی ہے۔ جب شہید بھٹو جیل میں تھے تو ہفتے میں صرف ایک بار ایک گھنٹہ کی ملاقات کی اجازت تھی۔ وہ اس ایک گھنٹے میں سیاسی لیکچر دیتے تھے، شہید بھٹو کے آخری ایام میں یہ سیاسی تربیت ہماری بیٹی کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوئی۔ بے نظیر ہر آزمائش میں پوری اتری ہے وہ پارٹی کو فعال اور مؤثر قیادت فراہم کرے گی۔''

بیگم نصرت بھٹو صاحبہ 23 مارچ 1928ء کو پیدا ہوئیں اور 23 اکتوبر 2011ء کو وفات پا گئیں۔

ٹوٹ جائیں وہ ہاتھ جنہوں نے ماں پر گولیاں چلائیں

الطاف احمد قریشی

یہ بیگم نصرت بھٹو کی تخلیقی صلاحیتیں ہی تھیں جنہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے وجود کو قائم رکھنے میں مدد کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بھٹو صاحب کی پہلی گرفتاری اور بعدازاں ان کی شہادت سے پیدا ہونے والے خلاء کو پُر کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ مرحوم غلام مصطفیٰ جتوئی اور مولوی کوثر نیازی کی سازشوں کو جس تحمل، بردباری اور ترکیب کے ساتھ بیگم صاحبہ نے ناکام بنایا، وہ انہی کا حصہ تھا۔ اگر پارٹی کو بیگم نصرت بھٹو کا سیاسی تدبر حاصل نہ ہوتا تو شاید پاکستان پیپلز پارٹی آمریت کے عفریت کے خلاف نہ تو اتنی طویل جنگ کامیابی کے ساتھ لڑ پاتی اور نہ ہی ایم آر ڈی کا وجود قائم ہوتا اور نہ پاکستان میں جمہوریت پسند سیاسی عناصر اور غیر جمہوری قوتوں کے درمیان وہ تاریخی جدوجہد ہوتی جس میں آخرکار آمریت کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بھی بیگم نصرت بھٹو کا حوصلہ تھا کہ پاکستان کو خونخوار آمریت سے نجات دلانے کے لیے انہوں نے اُن سیاسی رہنماؤں اور سیاسی جماعتوں کے ساتھ وسیع تر اتحاد بنایا جنہوں نے شہید ذوالفقار علی بھٹو کی منتخب جمہوری حکومت کے خلاف غیر ملکی طاقتوں کے مالی اور مادی تعاون سے محاذ بنایا، تحریک چلائی اور نہ صرف یہ کہ ان کی حکومت کا تختہ الٹ کر امریکی سامراج کے پٹھو جرنیلوں کی حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے میں مدد کی بلکہ اس کا حصہ بنے۔ انہی میں سے

ایک نے کہا تھا ''اس سانپ کا سر اپنے بھاری بوٹوں تلے کچل ڈالو' تو دوسرے نے کہا تھا کہ ''پی این اے کے اقتدار میں آنے کے بعد بھٹو کو ہالہ کے پل پر پھانسی دی جائے گی''۔

یہ بیگم نصرت بھٹو کی سیاسی ذہانت اور بصیرت ہی کا نتیجہ تھا کہ یہ سب لوگ 70 کلفٹن میں بیگم صاحبہ کے قدموں میں بیٹھ گئے اور ایک نئے جمہوری اتحاد نے جنم لیا۔ اس اتحاد میں وہ تمام سیاسی جماعتیں شامل تھیں جو ضیائی مارشل لاء سے اکتا چکی تھیں۔ شاید اس لئے کہ ان کی قیادتوں کو ان کی خواہشوں کے مطابق اقتدار میں حصہ نہیں ملا تھا۔ ایم آر ڈی (تحریک بحالی جمہوریت) کے قیام کے وقت جن رہنماؤں نے اعلان نامے پر دستخط کئے تھے، مرحوم سردار عبدالقیوم خاں، سابق صدر اور وزیراعظم آزاد جموں وکشمیر کے سوا سبھی آخری وقت تک ایم آر ڈی کا حصہ رہے اور جدوجہد میں اپنا حصہ باقاعدگی کے ساتھ ڈالتے رہے۔

ایم آر ڈی کو قائم ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ مجھے اپنے دفتری کام کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا۔ کراچی پہنچنے کے اگلے روز سہ پہر کے وقت میں 70۔ کلفٹن بیگم صاحبہ سے ملنے گیا۔ انہوں نے فوراً اندر بلوالیا۔ بھٹو صاحب کی شہادت کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ بھٹو صاحب کی بات ہوئی تو میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور ہچکیوں سے رونے لگا۔ بیگم صاحبہ مجھے گلے لگا کر رونے لگیں۔ میری حالت کچھ نارمل ہوئی تو میں نے تلخی کے ساتھ سوال کیا کہ بیگم صاحبہ شہید بابا کے قاتلوں کے ساتھ آپ نے کیوں ہاتھ ملایا؟ ان کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ کہنے لگیں'' تم میری اندرونی کیفیت کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہو۔ مجھ کو بھٹو صاحب کے قاتلوں کے ساتھ بیٹھنا پڑ رہا ہے لیکن کیا کروں۔ بھٹو صاحب اس پاکستان کے لیے پھانسی چڑھ گئے اور پاکستان کو ہم نے ہی بچانا ہے۔ لیکن ہم اکیلے یہ کام نہیں کر سکتے اس لیے میں نے ان تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ طویل گفت وشنید کی ہے اور ان کی کسی شرط کو تسلیم کئے بغیر ان کو متحد ہو کر آمریت کے خلاف اور جمہوریت کی بحالی کے لیے جدوجہد کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ تم نے دیکھا کہ اس کے کتنے مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں اور جب ہم تمام سیاسی لوگ مل کر جمہوریت کی بحالی کے لیے

سڑکوں پر نکلیں گے تو آمریت کا سورج ضرور غروب ہوگا اور یہ فتح ہوگی ذوالفقار علی بھٹو کی سوچ کی، ان کی فکر کی''۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ سوسارا غصہ کافور ہوگیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی باگ ڈور صحیح ہاتھوں میں ہے، ایک ایسی ماں کے ہاتھوں میں ہے جو پیار سے، محبت سے اپنے بچوں کو قائل کرنا جانتی ہے اور انہیں ایک بڑی جدوجہد کے لیے تیار کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔ انہوں نے ایسا کر دکھایا۔ ہم نے دیکھا کہ انہوں نے کس جمہوری انداز سے ایم آر ڈی کو چلایا۔ کوئی رہنما ناراض ہوا تو اُسے قائل کیا، اسے منایا اور اس کی حیثیت کو دوسروں سے اس طرح منوایا کہ اس سے دوسروں کی ہیٹی نہ ہو۔

میری اس تحریر میں نظم وضبط نہیں ہوگا، واقعات میں ترتیب نہیں ہوگی۔ کون سا واقعہ پہلے ہوا اور کون سا بعد میں، یہ بھی مسئلہ ہے اس لیے کہ تاریخیں یاد نہیں رہتیں۔ عمر کا تقاضہ ہے لیکن واقعات بہرحال ذہن میں موجود ہیں۔

بیگم نصرت بھٹو سے میرا تعارف 1972ء میں ایوان صدر راولپنڈی میں ہوا۔ میں نے بھٹو صاحب سے کہا تھا کہ میں ان کے ساتھ ایک ہفتہ گزاروں گا۔ صبح کے معمولات سے لے کر رات کو بستر پر جانے تک کے دوران میں ان کے ساتھ رہوں گا۔ ان کے معمولات دیکھوں گا اور پھر روزنامہ مساوات میں ایک بھرپور فیچر تحریر کروں گا۔ اس سے پہلے اردن کے شاہ حسین کے ساتھ ایک ہفتہ گزار کر ان کے معمولات اور ان کی روزمرہ زندگی کے حوالے سے روزنامہ مشرق لاہور میں فیچر لکھ چکا تھا۔ بھٹو صاحب نے مجھ کو اجازت دے دی چنانچہ میں راولپنڈی پہنچ گیا۔ ایوان صدر اطلاع کی اور آدھ گھنٹے کے بعد مجھے ایوان صدر طلب کرلیا گیا۔ بھٹو صاحب نئے نئے صدر ہوئے تھے۔ وہ عارضی آئین کے ساتھ ساتھ پاکستان کے مستقل آئین اور مختلف شعبوں میں اصلاحات، جن میں فوقیت قومیانے کی پالیسی کو حاصل تھی، کی تیاری میں مصروف تھے۔ ایوان صدر میں بھٹو صاحب کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنے پرنسپل سیکرٹری اور ملٹری سیکرٹری سے میرا تعارف کروایا اور انہیں بتادیا کہ میں ایک ہفتہ ایوان صدر ہی

میں رہوں گا اور صدرِ مملکت (بھٹو صاحب اس وقت صدر تھے) کے ساتھ ہر اجلاس، ہر گفتگو میں شریک رہوں گا۔ پھر وہ مجھے رہائشی حصے میں لے گئے جہاں انہوں نے بیگم نصرت بھٹو صاحبہ سے میرا تعارف کروایا۔ اور انہیں میری آمد کے حوالے سے بتاتے ہوئے کہا ''جلدی بھاگ جائے گا'' اور پھر ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ بیگم صاحبہ نے بہرحال میری پشت پر تھپکی دیتے ہوئے کہا ''نوجوان ہے۔ بھاگے گا کیوں؟ میں اس کی ماں کی طرح ہوں۔ میں اس کا دھیان رکھوں گی''۔ یہ بیان تو بیگم صاحبہ کا تھا لیکن لفظ میرے ہیں۔ میں وہاں تین دن رہا اور پھر چوتھے روز بیگم صاحبہ کو رازداں بنا کر وہاں سے بھاگ کر واپس لاہور آ گیا۔ ان تین ساڑھے تین دنوں کے دوران جس طرح بیگم صاحبہ نے میرا دھیان رکھا، وہ شاید میری اپنی ماں بھی نہیں رکھ سکتی تھیں۔ ناشتہ، دوپہر کا کھانا، سہ پہر کی چائے، رات کا کھانا اور رات گئے بھٹو صاحب کی لائبریری میں بلیک کافی کا کپ۔ یہ ہم تینوں یعنی بھٹو صاحب بیگم صاحبہ اور میں اکٹھے پیتے۔ دوپہر اور رات کے کھانوں پر چاروں بچے بھی ہمراہ ہوتے۔ بی بی بے نظیر بھٹو اُن دنوں برطانیہ سے پاکستان آئی ہوئی تھیں۔

بیگم صاحبہ اور بھٹو صاحب دونوں ہی بچوں کے تعلیمی معاملات میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ رات کے کھانے پر بھٹو صاحب چاروں بچوں سے ان کی تعلیم کے بارے میں سوال جواب کرتے۔ امتحان میں ان کی کارکردگی کے بارے میں سوال کرتے۔ جب امتحان کا نتیجہ آتا تو اُن کی سرزنش بھی ہوتی۔ کھانے پینے کے معاملات بیگم نصرت بھٹو ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھتیں۔ کیا چیز کتنی پکنی ہے وہ براہ راست ملازموں سے بات کرتیں۔ گھر کے کچن کا سودا ہر ماہ اکٹھا آتا۔ ایوانِ صدر اور بعد میں ایوانِ وزیراعظم کے ملازموں کے لیے کھانے پینے کا انتظام الگ سے ہوتا۔ ملازمین کے کھانوں میں پراٹھے، گھی میں تلی ہوئی اشیاء ضرور ہوتیں۔ ان کے لیے تیار کئے گئے سالنوں میں بھی گھی کی مقدار کافی ہوتی جبکہ بھٹو صاحب کے گھر کے افراد کے لیے پکنے والا کھانا عام طور پر سادہ ہوتا۔ میں جب وہاں قیام کے لیے گیا تو بیگم صاحبہ نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اس کھانے کو ترجیح دی جو ان کے گھر کے لیے تیار ہوتا تھا۔ ان تین دنوں کے دوران جو

میں نے وہاں گزارے، میں نے اس کو انتہائی منظم گھرانہ پایا۔ رات کا کھانا ساڑھے آٹھ بجے لگ جاتا تھا اور اگر کوئی سرکاری عشائیہ نہ ہوتا تو بھٹو صاحب بیگم صاحبہ اور بچوں کے ساتھ کھانا کھاتے۔ کھانے کے دوران میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز خان بھٹو" جل تُو جلال تُو" کا ورد کرتے رہتے۔ لیکن بے نظیر بھٹو اور صنم بھٹو چہکتی رہتیں۔ ان کی کوشش ہوتی کہ ان کی کسی بات پر دونوں بھائی غصے کا اظہار کریں تاکہ پاپا سے ڈانٹ کھائیں لیکن عام طور پر بیگم صاحبہ دونوں بہنوں کی "سازش" کو ناکام بنادیا کرتیں۔

ایوانِ صدر میں میرے قیام کے دوسرے روز دوپہر کے کھانے کے بعد بھٹو صاحب حسب معمول قیلولہ کے لیے اپنے بیڈ روم میں چلے گئے اور بیگم صاحبہ مجھ کو لے کر بیٹھ گئیں۔ میرے بارے میں معمولی سے معمولی تفصیل معلوم کرنے کی کوشش انہوں نے کی۔ ہم دونوں ڈیڑھ گھنٹہ گپ شپ کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھٹو صاحب کے معمولات کے بارے میں بہت سے سوالات کئے۔ بھٹو صاحب کے نیند سے جاگ جانے کے بعد ہماری یہ گفتگو ختم ہوگئی۔ بھٹو صاحب صبح ساڑھے چھ بجے اٹھ کر لان میں پندرہ بیس منٹ تک سیر کرتے، پھر شیو کرتے، نہاتے اور ناشتے کی میز پر آ بیٹھتے۔ بچے سکولوں کو جا چکے ہوتے۔ ناشتے میں ایک توس، ایک انڈہ اور دو کپ چائے لیتے۔ چائے بڑے مزے لے لے کر پیتے۔ اس دوران اخبارات کا مطالعہ کرتے اور ساتھ ساتھ ان اخباری تراشوں کو دیکھتے جاتے جو پریس سے متعلقہ شعبہ کی طرف سے انہیں فائل میں بھجوائے جاتے تھے۔ وہ خبروں پر اپنے تاثرات لکھتے اور بعض پر احکامات بھی درج کرتے۔ اس سارے کام سے وہ پونے نو بجے فارغ ہو جاتے۔ اپنے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کرتے اور پھر اپنے دفتر میں چلے جاتے اور بیگم صاحبہ باورچی خانے میں خانساماؤں کے ساتھ مغزماری کرتی رہتیں۔

دوپہر ڈیڑھ بجے بھٹو صاحب رہائش گاہ میں واپس آتے۔ بچے سکولوں سے آ کر کپڑے تبدیل کر کے کھانے کی میز پر بیٹھے ہوتے۔ کھانا کھاتے ہوئے بھٹو صاحب ہر بچے سے

اس کی تعلیمی کارکردگی کے حوالے سے گفتگو کرتے، شاباش دیتے، ڈانٹ ڈپٹ کرتے۔ بیگم صاحبہ بچوں کی شکایتیں کرتیں اور بھٹو صاحب سخت گیر والد بن کر ڈانٹ ڈپٹ کرتے۔ بیگم صاحبہ نے مجھ کو بتایا کہ ایک مرتبہ میر صاحب (میر مرتضیٰ بھٹو بڑے بیٹے ہونے کے ناطے میر صاحب کہلواتے تھے جبکہ شاہنواز، خان صاحب کہلواتے تھے) کی پرنسپل نے فون کر کے بھٹو صاحب کو سکول بلوایا۔ کوئی اور ہوتا تو اس بات کا بُرا مناتا لیکن بھٹو صاحب اگلے ہی روز مقررہ وقت پر پرنسپل صاحبہ کے دفتر پہنچ گئے۔ پرنسپل نے انہیں میر صاحب کی سرگرمیوں کے بارے میں مطلع کر کے خبردار کیا۔ گھر واپس آ کر بھٹو صاحب نے میر صاحب کی خاصی کلاس لی۔ تو دونوں میاں بیوی بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے اسی طرح سخت گیر تھے جس طرح متوسط طبقے کے والدین ہوتے ہیں۔

شام کی چائے بھٹو صاحب عموماً غیر ملکی مہمانوں یا اراکین اسمبلی کے ساتھ گھر کے لان میں پیتے۔ بیگم نصرت بھٹو سفیروں، غیر ملکی مہمانوں اور ملکی مہمانوں کی بیگمات کے ساتھ بیٹھ کر سفارتی فرائض سرانجام دیتیں۔ شام سات بجے سے نو بجے تک کا وقت بھٹو صاحب کا اپنا وقت ہوتا تھا۔ اس دوران وہ اپنے ذاتی دوستوں، وزیروں، جو ان کے قریب تھے، کے ساتھ گپ شپ کرتے۔ اس گپ شپ میں ملکی اور غیر ملکی حالات بھی زیر بحث آتے۔ نو بجے وہ کھانے کی میز پر آ جاتے اور بچوں کے ساتھ کھانا کھاتے۔ ان سے گپ شپ کرتے۔ ان سے لاڈ پیار کرتے، ان کی کھچائی کا بھی یہی وقت ہوتا تھا۔ کھانے کی میز پر وہ بیگم صاحبہ کے ساتھ سیاسی حالات پر بھی گفتگو کرتے اور ان سے مشورے لیتے۔ بیگم صاحبہ کے مزاج میں دھیما پن تھا۔ وہ ہر معاملے میں توازن رکھنے کی قائل تھیں۔ انتہائی کشیدہ حالات میں بھٹو صاحب عموماً بیگم صاحبہ کے مشورے پر عمل کرتے۔ ساڑھے دس بجے بھٹو صاحب اپنی لائبریری میں چلے آتے اور بارہ بجے تک مطالعہ میں مصروف رہتے۔ وہ اپنی کتابوں کی مدد سے اپنے ساتھیوں کی سیاسی تربیت بھی کرتے تھے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ غلام مصطفیٰ کھر پر بہت زیادہ توجہ دیتے تھے۔ وہ ہر ہفتے انہیں

ایک کتاب دیتے اور اگلے ہفتے اس کتاب کے موضوع کے حوالے سے کھر صاحب سے سوالات کرتے اور میں نے ان کی ڈانٹ ڈپٹ ہوتے بھی دیکھی۔ یہ ہر ہفتے کا معمول تھا۔ رات کو ساڑھے بارہ بجے وہ بستر پر جاتے اور صبح چھ ساڑھے چھ بجے اٹھ جاتے۔

میں ایوان صدر میں بھٹو صاحب کی مصروفیات سے تنگ آ چکا تھا۔ چنانچہ چوتھے روز میں نے بیگم صاحبہ کو منا لیا کہ میں واپس لاہور چلا جاؤں۔ وہ ہنستے ہوئے کہنے لگیں ''لوگ سمجھتے ہیں کہ بھٹو صاحب اور ہم لوگ یہاں عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ہماری زندگیوں میں کس قدر آرام ہے؟ تمہارا شکریہ کہ تم نے ہمارے ساتھ تین دن گزارے۔ تم جاؤ۔ میں صاحب کو سمجھا لوں گی''۔ یقین کریں میں وہاں سے بگٹٹ بھاگا اور لاہور پہنچ کر اس رات سکون کی نیند سویا۔ مجھے بیگم صاحبہ کی موجودگی میں گزارے وہ تین روز تاحیات یاد رہیں گے۔ ماں کی محبت کیا ہوتی ہے، اس کا احساس ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات میں ہوا۔ جب تک بھٹو صاحب وزیراعظم رہے، بیگم صاحبہ کے ساتھ میری ملاقات نہ ہو سکی۔ بھٹو صاحب کے ساتھ تقریباً ہر ہفتے ملاقات ہو جاتی تھی اس لیے کہ وہ تقریباً ہر ہفتے کی شام لاہور آیا کرتے اور پیر کی صبح اسلام آباد واپس جاتے۔ سو ہوائی اڈے پر، گورنر ہاؤس میں یا کسی تقریب میں ان کے ساتھ ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ وہ میرے تینوں بچوں کو ان کے ناموں سے جانتے تھے لیکن ان سے کبھی ملے نہیں تھے اور ہر بار تینوں کے فرداً فرداً نام لے کر ان کی خیریت دریافت کرتے۔ بھٹو صاحب اور بیگم نصرت بھٹو صاحبہ دونوں ہی مضبوط انسانی رشتوں میں یقین رکھتے تھے۔ عوام میں ان کی بے پناہ پذیرائی کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

ہاں یاد آیا۔ ایک ملاقات بیگم صاحبہ سے اس وقت ہوئی تھی جب وزیراعظم کی حیثیت سے بھٹو صاحب 1973ء میں سرکاری دورے پر ایران گئے۔ میں بھی ایک صحافی کے طور پر ان کے وفد کا حصہ تھا۔ اصفہان میں چند گھنٹے کا قیام تھا۔ ہم سب لوگ گورنر اصفہان کے سرکاری ظہرانے میں مدعو تھے۔ ہم صحافیوں نے فیصلہ کیا کہ ہم میز کے اس حصے میں بیٹھیں گے جو

دروازے کے قریب ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب گورنر اصفہان اور بھٹو صاحب تقریریں کر چکے اور کھانا شروع ہوا تو ایچ کے برکی نے مجھے اشارہ کیا۔ چنانچہ میں جھکا اور نیچے ہوکر چپکے سے دروازے سے باہر آ گیا۔ دس منٹ کے اندر اندر سبھی صحافی باہر آ گئے۔ ہم وہاں سے بازار میں گئے جو بالکل ہی قریب تھا۔ وہاں سے بیوی بچوں کے لیے تحائف خریدنے کے علاوہ سبھی نے زعفران خریدا اس لیے کہ اصفہان زعفران کے لئے مشہور تھا۔ ہم واپس آ کر اس بڑے کمرے میں ایک دوسرے کو اپنی اپنی چیزیں دکھانے میں اس قدر مشغول تھے کہ آس پاس سے بالکل بے خبر ہو چکے تھے۔ اچانک میری نظر دروازے پر پڑی اور وہاں میں نے بھٹو صاحب کو چوکھٹ کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے دیکھا۔ وہ ٹائی اور کوٹ نہیں پہنے ہوئے تھے۔ میں نے ایچ کے برکی سے کہا ''بھٹو صاحب!''۔ وہ بھنا کر بولے ''اوئے تینوں کیہہ بھٹوفوبیا ہوگیا۔ اے۔ ارام نال بیٹھ''۔ میں نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے پھر کہا ''بھٹو صاحب کھڑے ہیں''۔ برکی صاحب نے دیکھا تو بھٹو صاحب سے مخاطب ہوکر بولے ''آؤ سر۔ آؤ''۔ وہ امریکہ میں بھٹو صاحب کے ساتھ پڑھتے تھے، اُن میں خاصی دوستی تھی۔ بھٹو صاحب اندر آ گئے اور آتے ہی کہنے لگے ''یقیناً تم میں سے ہر کوئی زعفران ضرور لایا ہوگا۔ (انہوں نے اخبار کا صفحہ بچھاتے ہوئے کہا) تم سے ہر کوئی آدھا آدھا زعفران اس کاغذ پر میرے لیے ڈالتا جائے''۔ برکی صاحب نے کہا ''سر! آپ کے لیے کونسا مسئلہ ہے۔ سفیر کو کہیں، سیروں کے حساب سے اسلام آباد پہنچا دے گا'' تو بھٹو صاحب بولے ''وہ پیسے نہیں لے گا۔ ایرانی سفیر مجھے تحفہ دے سکتا ہے لیکن میں کیوں مفت میں لوں۔ یہ میں اپنے گھر کے لیے لے رہا ہوں۔ میں خود بازار نہیں جاسکتا پروٹوکول کی وجہ سے۔ جس افسر سے کہوں گا وہ لے آئے گا لیکن قیمت نہیں لے گا۔ تمہارے ساتھ میں یہ حرکت کرسکتا ہوں۔ اس لیے تم سب آدھا آدھا زعفران اس کاغذ پر ڈالو'' چنانچہ سب نے ایسا ہی کیا اور سب سے زیادہ زعفران بھٹو صاحب کے حصے میں آیا۔ انہوں نے پڑیا لپیٹی اور پتلون کی جیب میں رکھ لی۔ وہ صحافیوں کے ساتھ گپ کر رہے تھے کہ پروٹوکول افسر

آیا اور میرے کان میں کہا کہ بیگم صاحبہ یاد کر رہی ہیں۔ میں اس کے ساتھ ہولیا۔ تین کمرے چھوڑ کر وہ ایک کمرے میں اکیلی تھیں۔ مجھے دیکھ کر خوش ہوئیں اور فوراً ہی مقصد پر آ گئیں ''یہ پیسے لو اور جلدی سے بازار سے اس رقم کا جتنا بھی آئے زعفران لے آؤ۔ صاحب کو پتہ نہ چلے''۔ ''میری ہنسی چھوٹ گئی۔ مجھ سے ہنسنے کی وجہ پوچھنے لگیں تو میں نے بتایا کہ ''صاحب پہلے ہی آپ کے لیے زعفران جمع کر چکے ہیں''۔ وہ حیرت سے مجھ کو دیکھتی رہیں اور پھر ہنسنے لگیں۔ ''ٹھیک ہے تم جاؤ''۔ میں وہاں سے صحافیوں والے کمرے میں واپس آیا تو بھٹو صاحب نے دیکھتے ہی پوچھا۔ ''بیگم صاحبہ نے بلایا تھا۔ اور زعفران خریدنے کے لیے کہا ہوگا''۔ میں نے اثبات میں جواب دیا اور انہیں بتا دیا کہ میں نے بیگم صاحبہ کو آگاہ کر دیا ہے کہ آپ نے پتلون کی کون سی جیب میں زعفران کا ''پُڑا'' (بڑی پڑیا کے لیے پنجابی کالفظ) رکھا ہے۔ کمرے میں زوردار قہقہہ پڑا۔

ایوب خان کی کابینہ سے استعفیٰ دینے کے بعد شہید ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ ان کی انتہائی متحرک شخصیت نے چند ماہ کے اندر اندر پیپلز پارٹی کو عوام کی آواز بنا دیا۔ ہر جلسہ میں شہید بھٹو معاہدہ تاشقند پر شدید تنقید کرتے اور کہتے کہ پاکستان نے جو جنگ میدان میں جیتی تھی، ایوب خان نے گفتگو کی میز پر ہار دی۔ بھٹو صاحب کی طرف سے حکومت اور پاکستان میں موجود سیاسی سماجی و اقتصادی نظام پر شدید تنقید نے حکمران طبقات کی راتوں کی نیندیں اڑا دیں۔ اس ملک کے سرمایہ دار، جاگیردار، جو پہلے خود خوف پھیلاتے تھے، اب سوشلزم کے نعرے نے انہیں بے حد خوفزدہ کر دیا تھا۔ چنانچہ پنجاب کے گورنر جنرل موسیٰ خان نے بھینسیں چوری کرنے کے الزام میں بھٹو صاحب کو گرفتار کر کے ساہیوال جیل بھیج دیا۔ بھٹو صاحب کی غیر حاضری میں پارٹی کی قیادت فوری طور پر بیگم صاحبہ نے سنبھال لی۔ بھٹو صاحب کی گرفتاری کے تیسرے روز ہی بیگم صاحبہ نے بھٹو صاحب کی گرفتاری کے خلاف نکالے جانے والے ایک بہت بڑے احتجاجی جلوس کی قیادت کی۔ یہ جلوس ناصر باغ سے شروع ہوا۔

جلوس کا پہلا حصہ ہائی کورٹ کے چوک میں تھا جبکہ آخری حصہ ابھی ناصر باغ سے باہر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسمبلی ہال کے سامنے مال روڈ پر بیگم صاحبہ نے جلوس سے خطاب شروع کیا تو اس وقت مال روڈ کے ہر طرف انسانی سر ہی سر تھے اور جلوس کا آخری حصہ وائی ایم سی اے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ یہ بیگم صاحبہ کی کسی احتجاجی جلوس میں پہلی شرکت تھی اور یہاں انہوں نے اپنی زندگی کی پہلی سیاسی تقریر کی۔ ان کی تقریر کا لب لباب یہ تھا ''موسیٰ خان! تم نے ایوب خان کے کہنے پر بھٹو صاحب کو بھینس چرانے کے الزام میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ ہم جیلوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ یہ عوام کا جمِ غفیر دیکھ رہے ہو! ان کے نعروں کی آوازیں سن رہے ہو!! میں تمہیں کہتی ہوں کہ تم لوگوں کی آواز کو گرفتار نہیں کر سکتے۔ لوگوں کے جذبوں کو قید نہیں کر سکتے۔ ذوالفقار علی بھٹو لوگوں کی آواز ہیں، لوگوں کے جذبوں کا نام بھٹو ہے۔ میں تمہیں کہتی ہوں کہ بھٹو صاحب کو اگلے تین روز میں رہا کر دو، ورنہ یہ لوگ انہیں خود جیل سے لے آئیں گے''۔ بیگم صاحبہ کی تقریر کے دوران اور بعد میں اس قدر تیز نعرے بازی ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اگلے تین روز میں بھٹو صاحب کی رہائی کی مہم میں شدت آ گئی جو حکومت کی مخالفت میں تبدیل ہو گئی۔ ادھر لاہور ہائی کورٹ نے ایک رٹ درخواست پر بھٹو صاحب کو فوری طور پر ضمانت پر رہا کر دیا۔ رہائی کے بعد بھٹو صاحب نے ایک بہت بڑے جلوس کی قیادت کی جو ناصر باغ سے شروع ہو کر اسمبلی ہال تک آیا جہاں بھٹو صاحب نے ایوب حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا۔

ضیاء الحق نے جب قتل کے ایک مقدمے میں شہید ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کیا اور ''ماما جی کی عدالت'' کے طریقے سے دہشت گرد جج قصاب مولوی مشتاق کی عدالت مقدمے کی سماعت کر رہی تھی، اس سے آنے والا فیصلہ عیاں تھا۔ بھٹو صاحب جانتے تھے کہ ان کے خلاف مقدمے کا مقصد کیا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ انہیں مار دیا جائے گا، وہ موت پولیس مقابلے میں ہو یا پھانسی کے ذریعے لیکن بھٹو صاحب کے خیر خواہ اور قانونی عمل سے واقف لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ بھٹو صاحب اس لیے جانتے تھے کہ وہ تاریخ کے ایک انتہائی

سنجیدہ طالب علم تھے۔ پارٹی کے اندر دو اور افراد تھے جنہیں ''مقتدر'' حلقوں نے مطلع کر دیا تھا کہ بھٹو صاحب کو زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا اس لیے ان دونوں سے کہا گیا تھا کہ وہ پارٹی کی قیادت پر ابھی سے قبضہ کر لیں۔ اب ہوا یوں کہ بھٹو صاحب نے جیل سے پیغام بھیجا کہ پارٹی کو قائم رکھنے اور اس کو سیاسی عمل میں شامل رکھنے کے لیے پارٹی کے چیئرمین کا ہونا ضروری ہے۔ بھٹو صاحب نے پیغام میں کہا کہ چونکہ شیخ محمد رشید پارٹی کے سینئر وائس چیئرمین ہیں، اس لیے انہیں مرکزی مجلس عاملہ کے فیصلے کے ذریعے قائمقام چیئرمین بنا دیا جائے۔ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ اس میں مولوی کوثر نیازی نے قائمقام چیئرمین کے لیے غلام مصطفیٰ جتوئی کا نام پیش کر دیا۔ کمیٹی کے کسی رکن نے شیخ رشید صاحب کا نام تجویز نہ کیا جس پر بیگم صاحبہ اور شیخ صاحب سخت پریشان ہوئے۔ فیصلہ ہونے کو تھا کہ شیخ صاحب نے پینترا بدلا اور بیگم صاحبہ کا نام قائمقام چیئرپرسن کے عہدے کے لیے تجویز کر دیا جس کی تائید عبدالحفیظ پیرزادہ نے کی۔ شیخ صاحب کی اس حوالے سے سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ چونکہ بیگم صاحبہ کا تعلق بھٹو صاحب سے ہے اس لیے ملک بھر کے کارکن ان کی تعظیم کرتے ہوئے انہیں پارٹی کا قائمقام چیئرپرسن تسلیم کر لیں گے۔ یہ غلام مصطفیٰ جتوئی اور مولوی کوثر نیازی کے لئے بہت بڑا جھٹکا تھا جو بہر حال انہیں برداشت کرنا پڑا۔ لیکن پارٹی قیادت خصوصاً مولوی کوثر نیازی سے محتاط ہو گئی۔ اور مرکزی کمیٹی میں ان کے کردار کو آہستہ آہستہ ختم کر دیا گیا۔ اس کو پارٹی سے نکالنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی بلکہ اس نے شورش کاشمیری کے ہفت روزہ چٹان کو اپنے ایک انٹرویو میں جس طرح بیگم صاحبہ اور بے نظیر بھٹو صاحبہ پر الزام تراشی کی اور جو غلیظ زبان ان دونوں کے خلاف استعمال کی وہ پارٹی سے علیحدگی کے لیے کافی تھی۔ ویسے میں نے اس کا جواب لکھا تھا جو چٹان نے شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اس کو مجیب الرحمان شامی صاحب نے اپنے ہفتہ وار ''زندگی'' میں شائع کر دیا جس پر مولوی نیازی بے حد تلملایا۔ اس نے اس کا جواب ایک فرضی قلمکار کے نام سے بھیجا جو شائع ہوا جس کا میں نے جواب دیا۔ وہ بھی شائع ہوا۔ مولوی بھنا اٹھا۔ میری موجودگی

میں شامی صاحب کو مولوی صاحب کا فون آیا جس میں ان کی کافی کلاس لی لیکن شامی صاحب یہی کہتے رہے کہ آپ جواب بھیجیں، چھاپ دوں گا اگر الطاف قریشی نے اس جواب کا جواب لکھا تو وہ بھی چھاپ دوں گا۔ مولوی بھاگ نکلا۔

پارٹی کی قائمقام چیئر پرسن اور بعد میں چیئر پرسن بننے کے بعد بیگم نصرت بھٹو نے جس طرح پارٹی کو متحرک رکھا اور آمریت کے خلاف ایم آر ڈی (تحریک بحالی جمہوریت) کو منظم کیا اور آمریت کے خلاف جس تحریک کی قیادت کی، وہ برصغیر کی سب سے بڑی سیاسی تحریک کا اعزاز رکھتی ہے۔ حقیقت میں اس تحریک کے دوران جلسے جلوسوں میں زیادہ تر شرکت پیپلز پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں ہی کی رہی۔ 90 فیصد گرفتاریاں پیپلز پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں ہی کی ہوئیں۔ دو ہزار سے زائد کارکنوں کو کوڑوں کی نہ صرف سزائیں سنائی گئیں بلکہ ان پر عملدرآمد بھی کیا گیا۔ لاہور کا شاہی قلعہ اور لاہور کا لال قلعہ اور پاکستان بھر کی تمام جیلیں پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں سے بھری رہیں۔ بیچ میں دوسری جماعتوں کے بھی کچھ کارکن تھے جنہیں پیپلز پارٹی سلام پیش کرتی ہے۔ تقریباً تیس ہزار سیاسی کارکن قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے اور درجنوں جئے بھٹو کا نعرہ لگاتے پھانسیوں پر چڑھ گئے۔ آمر مطلق ضیاء الحق اور اس کی حامی سیاسی جماعتوں جن میں جماعت اسلامی پیش پیش تھی، نے بھرپور طریقے سے ضیاء کے ساتھ مل کر دین اسلام کے تصور کو برباد کیا جس کی سزا ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔

ایم آر ڈی کی آمریت کے خلاف جدوجہد میں بیگم صاحبہ کتنی مرتبہ جیل گئیں اس کا شمار ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ درجنوں بار وہ گھر میں نظر بند رہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ محترمہ بے نظیر بھٹو سے نہیں مل سکتی تھیں باوجود اس کے کہ وہ ایک ہی جگہ نظر بند یا قید ہوتی تھیں۔ ویسے بیگم صاحبہ کی قائدانہ صلاحیتیں تو بہت پہلے سامنے آنا شروع ہو گئی تھیں۔ ایک واقعہ تو میں نے 1968ء کا آپ کو بتایا۔ اب ایک اور واقعہ بھٹو صاحب کی آخری گرفتاری کے بعد کا بھی سن لیجئے۔ بیگم صاحبہ گلبرگ میں کھگہ ہاؤس میں کرایہ دار تھیں۔ اس سے ذرا پہلے کا ایک اور واقعہ سن لیجئے۔ بیگم صاحبہ

کو نواب صادق حسین قریشی نے اپنی رہائش گاہ واقع شادمان میں منت سماجت کر کے ٹھہرایا تھا۔ بیگم صاحبہ اپنے پرس میں ہر وقت کچھ معقول رقم ہمیشہ رکھتی تھیں تا کہ ضرورت پڑنے پر استعمال میں لائی جا سکے۔ ایک روز کسی جلوس کے اہتمام کے لیے انہوں نے رقم دینے کے لیے پرس کھولا تو رقم ندارد۔ وہ ایک لاکھ روپیہ جو انہوں نے صبح ہی بنک سے نکلوا کر پرس میں رکھا تھا، غائب ہو گیا تھا۔ وہ بہت پریشان ہوئیں۔ انہوں نے بڑے طریقے سے اس کا تذکرہ نواب صادق حسین قریشی سے کیا تو وہ کندھے جھاڑ کر دوسری طرف چلے گئے۔ بیگم صاحبہ نے اسی وقت وہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ڈیڑھ دو گھنٹے میں کھگہ ہاؤس کرایہ پر لے کر اس میں منتقل ہو گئیں لیکن کیا مجال جو نواب صادق حسین قریشی نے انہیں روکنے کی کوشش کی ہو۔

اب میں آتا ہوں کھگہ کی طرف۔ کھگہ ہاؤس کے بالکل قریب ہی موجودہ زیر اطلاعات ونشریات پرویز رشید کا پلاسٹک کے پائپ بنانے کا ایک معمولی سا کارخانہ تھا۔ وہ پیپلز پارٹی میں بہت متحرک ہوا کرتے تھے۔ جب بیگم صاحبہ کھگہ ہاؤس منتقل ہوئیں تو ہم لوگ پرویز رشید کو ملنے کے بہانے بیگم صاحبہ کے ہاں چلے جاتے۔ ہم سمجھتے تھے کہ خفیہ والوں کو ہم بے وقوف بنا رہے تھے لیکن حقیقت میں بے وقوف تو ہم بن رہے تھے۔ بہر حال ایک روز بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا کہ وہ شہر کے اندر خواتین کا جلوس نکلوانا چاہتی ہیں۔ کتنی خواتین ہونی چاہئیں اور فی خاتون ہمیں کتنی رقم دینی پڑے گی۔ میرے لیے یہ بالکل نئی بات تھی۔ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں کل ایک دو خواتین کو لاؤں گا یا انہیں بھیج دوں گا وہ آپ سے بات کر لیں گی۔ میں نے بھابھی فرخندہ بخاری سے بات کی تو وہ اگلے روز تمکت آراء (شفقت تنویر مرزا کی بیگم) کو لے کر کھگہ ہاؤس پہنچ گئیں۔ فرخندہ بھابھی نے کہا کہ وہ چار پانچ سو خواتین کا انتظام کر لیں گی اور یکی گیٹ سرکلر روڈ سے جلوس لے کر اکبری، موچی دروازہ، لوہاری اور بھاٹی تک پہنچنے کی کوشش کریں گی۔ بیگم صاحبہ نے اخراجات کا پوچھا تو بھابھی سخت حیران ہوئیں اور کہنے لگیں ''بیگم صاحبہ! یہ پارٹی کی خواتین ہوتی ہیں۔ یہ پیسے ویسے نہیں لیتیں۔ یہ تو بھٹو صاحب کے

لیے جانیں دینے کے لیے تیار ہیں۔ آپ فکر نہ کریں''۔ بیگم صاحبہ سمجھیں کہ شاید فرخندہ بھابی ٹال رہی ہیں اور انہوں نے اس کا اظہار کر بھی دیا جس پر بھابی فرخندہ نے کہا ''آپ پرسوں دیکھ لیجئے گا۔ میں سچی ہوں یا جھوٹی، ان دو دنوں میں کیا فرق پڑے گا''۔ یہ کہہ کر وہ دونوں وہاں سے آ گئیں اور مجھے ساری گفتگو سے مطلع کر دیا۔ میں اگلے روز کھگہ ہاؤس گیا تو بیگم صاحبہ کافی پریشان تھیں۔ ان کا اب بھی یہی خیال تھا کہ بھابی فرخندہ انہیں ٹال گئی ہیں۔ میں نے انہیں تسلی دی۔

جلوس والے دن میں لنڈے کے باہر کپڑوں کے ایک ٹھیلے کے ساتھ سر پر پٹکا باندھ کر کھڑا ہو گیا جیسے میں پرانے کپڑے بیچنے والا ہوں۔ ساڑھے تین بجے جلوس شروع ہوا۔ یکی گیٹ سے دہلی دروازے تک پہنچتے پہنچتے جلوس میں خواتین کی تعداد چار سو سے زائد ہو گئی۔ اکبری گیٹ کے باہر پولیس نے لاٹھی چارج شروع کیا تو یہ تعداد بلا مبالغہ ایک ہزار سے اوپر چلی گئی۔ کیمرے حرکت میں آ گئے۔ ایسی صورتحال سے نبٹنے کے لیے ہم نے لوہاری کے باہر مردوں کے جلوس کا انتظام کر رکھا تھا۔ یہاں لاٹھی چارج کے ساتھ ہی لوہاری گیٹ کے باہر مردوں کا جلوس شروع ہو گیا۔ نعرے بازی، توڑ پھوڑ شروع ہوئی تو پولیس اور انتظامیہ سخت پریشان ہو گئی۔ پولیس کی ساری قوت ادھر منتقل ہو گئی اور ہم تمام خواتین کو بحفاظت نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ بیگم صاحبہ کو پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ میں نے فرخندہ بھابی سے کہہ رکھا تھا کہ وہ دو دن تک بیگم صاحبہ کی طرف بالکل نہ جائیں۔ اگلے روز سنسر کے باوجود اخبارات میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ خبریں لگی ہوئی تھیں۔ میں اگلے روز گیارہ بجے بیگم صاحبہ کے ہاں گیا تو وہ بے حد خوش تھیں۔ انہوں نے مجھ کو بتایا کہ پارٹی کے عہدیدار تو فی کس پیسے لے کر اہتمام کرتے تھے پھر بھی وہ کامیاب نہیں ہوتے تھے۔ اس پر میں نے کہا کہ وہ سب ٹوپی ڈرامہ ہوتا تھا۔ کل جو کچھ ہوا وہ حقیقت تھی۔ پیپلز پارٹی کا کارکن پیسے لے کر کام نہیں کرتا اور بیگم صاحبہ اس کی قائل ہو گئیں۔ اس کے بعد فرخندہ بخاری سے بیگم صاحبہ کی ایسی دوستی ہوئی کہ

لندن میں قیام کے دوران بیگم صاحبہ ہر دوسرے دن بھابی فرخندہ کو بلا بھیجتیں۔فرخندہ بھابی سے پہلے پارٹی کے رہنماؤں نے جلسہ جلوس کے حوالے سے بیگم صاحبہ کو خوب لوٹا۔فرخندہ بھابھی کی مداخلت کے باعث ان کی آمدنی کم ہوگئی تو وہ فرخندہ بھابی کے دشمن بن گئے لیکن بھابی فرخندہ نے ان باتوں کی طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیا۔تکلیف دہ بات یہ ہے کہ یہ لوگ کوئی غریب غرباء نہیں تھے بلکہ کھاتے پیتے لوگ تھے۔غریب کارکن تو گرفتاریاں دے کر جیلوں میں جانے پر فخر محسوس کرتے تھے۔وہ اپنی ننگی پیٹھوں پر کوڑے کھاتے تھے اور ''جئے بھٹو'' کا نعرہ لگاتے تھے۔

پرویز رشید، راجہ انور اور میاں احسان الحق جو اس وقت پیپلز پارٹی لاہور کے صدر تھے، نے بیگم صاحبہ سے کارکنوں کی خودسوزیوں کے پروگرام کا ذکر کیا تو وہ سخت ناراض ہوئیں اور سختی سے منع کیا لیکن یہ لوگ باز نہ آئے۔ان لوگوں نے صفدر میر صاحب اور میرے ساتھ مشترکہ ملاقات کر کے یہ پروگرام پیش کیا تو ہم دونوں نے سختی کے ساتھ اس کی مخالفت کی اور تحریک بحالی جمہوریت کو سیاسی رکھنے پر زور دیا۔لیکن یہ لوگ باز نہ آئے۔میں نے کسی نہ کسی طرح رات کو بیگم صاحبہ کے ساتھ ٹیلی فون پر بات کی جو اس وقت لاڑکانہ میں تھیں۔وہ سخت پریشان ہوئیں اور انہوں نے ہنگامی پریس کانفرنس کر کے ایسی کسی مہم جوئی کا حصہ نہ ہونے کا اعلان کرتے ہوئے کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ ایسے نام نہاد لوگوں سے دور رہیں جو پارٹی کارکنوں کو اشتعال دلا کر مہم جوئی کر کے اپنے مذموم مقاصد پورے کرنا چاہتے ہیں۔بیگم صاحبہ کی یہ پریس کانفرنس اخبارات میں شائع ہونے سے سرکاری سطح پر روک دی گئی جس سے واضح ہوگیا کہ اس مہم جوئی کا آغاز کہاں سے کیا گیا تھا۔شاید یہی وہ وقت تھا جب محترمہ بےنظیر بھٹو نے جو اس وقت پارٹی کی شریک چیئر پرسن بن چکی تھیں، میاں احسان الحق، پرویز رشید اور راجہ انور سے دوری اختیار کرلی تھی۔یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ 1986ء میں جب محترمہ پاکستان واپس آئیں تو لاہور میں قیام کے دوران مجھ سے پرویز رشید نے بی بی سے ملاقات کروانے کے لیے کہا۔مجھے تعجب ہوا اس لیے کہ یہ لوگ تو ان کے حوالے سے بی بی سے ملا کرتے تھے۔بی بی نے لاہور کے

پچیس افراد کو عشائیہ پر مدعو کیا تھا۔ جن میں بیگم ایلس فیض، سلیمہ ہاشمی، شعیب ہاشمی، محمد صفدر میر جیسے لوگ شامل تھے۔ پارٹی کے کسی عہدیدار کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ البتہ مجھ کو بی بی نے خصوصی طور پر کھانے میں شرکت کے لیے کہا تھا۔ وہاں میں نے پرویز رشید کی ملاقات کی خواہش کے بارے میں بتایا تو چند لمحے خاموش رہنے کے بعد مجھ سے کہنے لگیں" الطاف صاحب! میں آپ کو مشورہ دوں گی کہ آپ اس سے دور ہی رہیں۔ دوستی ختم نہ کریں لیکن اس کی حدود مقرر کر لیں"۔ میرے لئے کافی تھا، میں سمجھ گیا کہ کیا معاملہ ہوسکتا ہے۔ اسی ردعمل میں پرویز رشید پارٹی چھوڑ کر نواز لیگ میں شامل ہوگئے۔

ایک اور تاریخی واقعہ پڑھ لیجئے۔ میں ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازمت کرتا تھا۔ ایجنسی کا صدر دفتر کراچی میں تھا اور میں اس کے لاہور دفتر کا انچارج تھا۔ اٹلس ہونڈا کی موٹر سائیکل کے نئے برانڈ کی افتتاحی تقریب کراچی میں ہونا تھی۔ میں اس تقریب کے لئے کراچی گیا۔ تقریب کے شروع ہونے سے پہلے اٹلس ہونڈا کے چیئرمین جناب یوسف ایچ شیرازی نے مجھ سے سیاسی گپ شپ کرتے ہوئے بڑی سادگی کے ساتھ انکشاف کیا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما غلام مصطفیٰ جتوئی صاحب جو اس وقت پارٹی کے سندھ چیپٹر کے صدر تھے اور پارٹی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے تھے، ضیاء الحق کے وزیر اعظم بننے والے تھے۔ میں ایک دم سے چونکا۔ میں نے شیرازی صاحب سے پوچھا" شیرازی صاحب! یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ جتوئی صاحب مارشل لاء کے خلاف تحریک چلانے والوں کی صف اول میں شامل ہیں۔ تحریک میں شدت بھی اندرون سندھ میں ہے جتوئی صاحب یہ کیسے کرسکتے ہیں؟ وہ مسکرائے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے" بھولے بادشاہ! فیصلہ ہو چکا ہے۔ پچھلے ماہ جتوئی صاحب کو جنرل ضیاء نے اسلام آباد بلوا کر" خفیہ ٹھکانے" پر ملاقات کی تھی۔ آج سے ایک ہفتہ پہلے وہ بلاوے پر پھر اسلام آباد گئے اور وہاں معاملات طے ہوگئے۔ چار روز بعد غلام مصطفیٰ جتوئی صاحب وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھائیں گے۔ یہاں ہر شخص کی قیمت لگی ہوئی ہے۔ روک سکتے ہو تو

روک لو۔ میں بھی دیکھوں پیپلز پارٹی میں کتنی طاقت ہے''۔ میں یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یوسف شیرازی صاحب کے بھٹو خاندان سے دوستانہ تعلقات تھے۔ یہ مجھے بعد میں بیگم نصرت بھٹو صاحبہ نے بتایا تھا۔

میں تقریب سے فارغ ہو کر ہوٹل واپس آیا جہاں قیام پذیر تھا۔ وہاں سے میں نے 70 کلفٹن ٹیلی فون کر کے بیگم صاحبہ سے بات کی اور ان سے فوری ملاقات کی درخواست کی۔ انہوں نے اگلے روز آنے کو کہا لیکن میں بضد رہا کہ اگلے ایک گھنٹے کے اندر اندر میں ان کی رہائش گاہ پر پہنچ رہا ہوں۔ ٹیلی فون بند کرنے کے بعد میں نہایا، کپڑے تبدیل کئے اور ٹیکسی لے کر 70 کلفٹن چلا گیا۔ بیگم صاحبہ کا سیکرٹری ایک سندھی نوجوان تھا جو پیشہ کے لحاظ سے وکیل تھا۔ انہوں نے بیگم صاحبہ کو اطلاع کی اور میں کمرے میں طلب کر لیا گیا۔ بیگم صاحبہ مجھ کو دیکھتے ہی ناراض ہونے لگیں۔ ''میرے آرام کا وقت ہو رہا ہے۔ تمہیں کہا تھا کل آؤ۔ تم لوگ کسی کی بات مانتے ہی نہیں ہو۔ بولو کیا بات ہے؟'' جب میں نے انہیں بتایا کہ چار روز بعد غلام مصطفیٰ جتوئی صاحب وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھانے والے ہیں تو وہ چونک اٹھیں اور بولیں۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ابھی کل ہی تو میری جتوئی صاحب سے بات ہوئی ہے۔ انہوں نے ایسی کسی بات کا ذکر نہیں کیا''۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا ''ہاں جی کوئی ڈاکو آپ کو کیسے بتائے گا کہ وہ آپ کے گھر ڈاکہ ڈالنے آ رہا ہے''۔ بیگم صاحبہ نے پوچھا ''تمہیں کس نے بتایا ہے؟'' میں نے کہا ''یوسف شیرازی صاحب نے'' تو وہ کہنے لگیں ''پھر یہ اطلاع بالکل صحیح ہوگی۔ میں کیا کروں؟'' میں نے عرض کیا کہ شیخ رشید صاحب، عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب اور ممتاز علی بھٹو صاحب کو کل یہاں بلوائیں۔ جتوئی صاحب کو بھی بلوائیں۔ پرسوں ان لوگوں سے میٹنگ کر کے بات کریں۔ بات کیسے کرنی ہے، کیا کرنی ہے، آپ سے بہتر کون جانتا ہے''۔ انہیں تجویز بے حد پسند آئی۔ انہوں نے میری موجودگی میں شیخ رشید صاحب کو لاہور میں پیرزادہ صاحب اور ممتاز بھٹو صاحب کو کراچی میں رابطہ کر کے ایک دن چھوڑ کر اگلے روز ہنگامی اجلاس کے لیے کراچی میں

طلب کر لیا۔ پھر جتوئی صاحب کو فون کیا۔ جب بیگم صاحبہ نے انہیں ہنگامی اجلاس کے بارے میں بتایا تو وہ یقیناً ٹھٹھک گئے ہوں گے۔

جتوئی صاحب نے بتایا کہ وہ گاؤں گئے ہوئے تھے اس لیے اجلاس میں شرکت مشکل ہوگی لیکن بیگم صاحبہ نے اپنے لہجہ میں سختی پیدا کرتے ہوئے کہا ''جتوئی صاحب! آپ فوراً آ جائیں۔ ادھر پاکستان کا مستقبل داؤ پر لگا ہے اور آپ گاؤں سے کراچی نہیں آ سکتے۔ تین گھنٹے کا راستہ ہے۔ کل صبح دس گیارہ بجے چلیں گے تو دو تین بجے تک پہنچ جائیں گے''۔ یہ کہہ کر بیگم صاحبہ نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ ایک دن چھوڑ کر اگلے روز صبح گیارہ بجے پانچ افراد پر مشتمل یہ اجلاس ہوا جس کی صدارت بیگم صاحبہ نے کی۔ شام کو مجھے بیگم صاحبہ نے بلوا بھیجا میں گیا تو میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے بتایا کہ وہ صاف مُکر گیا۔ میں نے جب اس کو ضیاء کے ساتھ ملاقاتوں کی تاریخیں اور وقت بتائے تو وہ اس حد تک مان گئے کہ ہاں جنرل ضیاء نے انہیں وزارت عظمیٰ کی پیش کش کی تھی مگر انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ مجھ سے بات کر کے اپنے فیصلہ سے آگاہ کریں گے۔ لیکن میں نے بھی کہہ دیا کہ جتوئی صاحب! آپ کی دو ملاقاتوں کو کافی وقت ہو چکا ہے آپ نے تو اس تمام عرصے میں مجھے یہ بات نہیں بتائی۔ آپ وزیر اعظم بننا چاہتے ہیں تو میں آپ کو روکوں گی نہیں۔ آپ جایئے اور وزیر اعظم بن جایئے لیکن یہ بات ذہن میں رکھیں کہ آپ پھر زندگی بھر سندھ کی سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ کہہ کر میں نے اجلاس برخاست کر دیا۔ ممتاز علی بھٹو اور پیرزادہ جتوئی کے خلاف سخت ایکشن لینے کے خواہش مند تھے لیکن میں نے منع کر دیا۔ شیخ صاحب نے میرا ساتھ دیا۔ باقی لوگ تو کھانے پر موجود رہے لیکن جتوئی صاحب فوراً چلے گئے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اب وزیر اعظم بننے سے انکار کر دیں گے اور پارٹی کے ساتھ اپنا فاصلہ بڑھا دیں گے''۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ایسے ہی ہوا۔ بیگم صاحبہ نے میرے سامنے یوسف شیرازی صاحب کو ٹیلی فون کر کے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بعد میں جب شیرازی صاحب کو ملا تو انہیں تفصیل سے آگاہ کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔

بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے درمیان اختلافات پیدا کرنے اور بیگم صاحبہ کو پارٹی کی چیئر پرسن کے عہدے سے ہٹانے میں غلیظ ترین کردار بیگم اشرف عباسی نے ادا کیا۔ اس حقیقت کا انکشاف خود ڈاکٹر اشرف عباسی نے کیا۔ جس روز لاہور میں ہونے والے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا، اس سے اگلے روز ملک عظیم (اب مرحوم) نے اپنے کیولری گراؤنڈ والے بنگلے میں بیگم اشرف عباسی کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ اس کھانے پر میرے علاوہ اور بھی آٹھ دس لوگ تھے۔ میں حسن رضا (اب مرحوم) کے ساتھ گیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحبہ سے بیگم صاحبہ کی چیئر مین شپ سے علیحدگی سے متعلق سوال کیا تو انہوں نے انتہائی بے ہودہ گالی دیتے ہوئے کہا کہ یہ سب ان کا کیا دھرا تھا۔ میرا تو بھیجہ اڑ گیا۔ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ خیر دوسرے لوگوں نے مجھ کو پکڑ لیا لیکن ملک عظیم محمود کی منت سماجت کے باوجود میں اور حسن رضا کھانا کھائے بغیر وہاں سے اٹھ آئے۔ جس روز بیگم صاحبہ پر لاڑکانہ میں فائرنگ کی گئی، وہ دن میرے جیسے لوگوں کے لیے انتہائی تکلیف والا دن تھا۔ اطلاع ملتے ہی میں نے ایک ٹیلی گرام المرتضیٰ لاڑکانہ کے پتہ پر بیگم صاحبہ کو بھیجی جس میں صرف یہ لکھا ''ٹوٹ جائیں وہ ہاتھ جنہوں نے ماں پر گولیاں چلائیں''۔ لیکن اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ٹیلی گرام ان تک پہنچایا ہی نہیں گیا ہوگا۔

بی بی کی پہلی حکومت بنی تو بیگم صاحبہ ان کی کابینہ میں سینئر وزیر تھیں۔ حکومت بننے کے دو تین ماہ بعد وہ لاہور تشریف لائیں تو مجھ کو، سلیم شاہد (اب مرحوم)، یونس ادیب (اب مرحوم) اور سیف زلفی (اب مرحوم) کو گورنر ہاؤس طلب کیا۔ غالباً دس بجے صبح ملاقات طے تھی۔ ہم چاروں ملاقات کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے تو چند منٹ بعد رخسانہ بنگش (بیگم صاحبہ کی سیکرٹری) بیگم صاحبہ کو لے کر آ گئیں۔ ہم لوگ کھڑے ہو گئے۔ بیگم صاحبہ بیٹھ گئیں اور ہمیں بھی بیٹھنے کو کہا۔ ہم بیٹھ گئے۔ گپ شپ ہوئی۔ چائے پی گئی۔ پھر بیگم صاحبہ نے ایک فائل کھولی تو ہم چاروں کو مخاطب کر کے فرمایا ''آپ لوگ لکھنے پڑھنے والے ہیں، ادیب، شاعر ہیں۔ آپ لوگوں نے بحالی جمہوریت کی تحریک میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔ الطاف تو سیاسی سطح پر بھی ہمارے ساتھ ساتھ

رہے۔ میں اور تو کچھ نہیں کر سکتی۔ بس یہ چھوٹے چھوٹے تحفے آپ لوگوں کے لیے لائی ہوں۔ جی یونس ادیب صاحب۔ بیگم صاحبہ نے ایک لفافہ انہیں پکڑا دیا۔ پھر دوسرا لفافہ سلیم شاہد، تیسرا سیف زلفی اور چوتھا لفافہ مجھے پکڑا دیا۔ یہ تینوں بیگم صاحبہ کے بائیں ہاتھ جبکہ میں ان کے دائیں ہاتھ بیٹھا تھا۔ سب نے شکریہ ادا کیا۔ پھر میں گویا ہوا ''بیگم صاحبہ! آپ ہماری ماں ہیں۔ آپ نے یہ تحفے دے کر ہمیں خوش کر دیا۔ مائیں اپنے بچوں کی دلجوئی ایسے ہی کرتی ہیں۔ اب میری ایک درخواست ہے آپ سے۔ میں نے آپ کا تحفہ قبول کیا اور اب درخواست گزار ہوں کہ اس میں جو کچھ بھی ہے، وہ آپ میری طرف سے پارٹی کے لیے بطور فنڈ قبول فرمالیں''۔ یہ کہہ کر میں نے لفافہ انہیں تھما دیا۔ لفافہ لے کر انہوں نے ذرا تلخی کے ساتھ کہا ''تو آپ یہ وصول نہیں کرنا چاہتے''۔ ''وہ تو میں نے کر لیا بیگم صاحبہ۔ اب یہ آپ کے بیٹے کی طرف سے پارٹی کے لیے نذرانہ ہے۔ اب آپ قبول فرمالیں''۔ بیگم صاحبہ نے لفافہ فائل میں رکھ لیا۔ سیف زلفی نے جرات پکڑی اور انہوں نے بھی وہی کیا جس پر بیگم صاحبہ شدید غصے میں آ گئیں اور 'شٹ اپ' کہہ کر خاموش ہو گئیں۔ میں فوراً رخسانہ بنگش کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا، رخسانہ، بیگم صاحبہ کی دوائی کا وقت ہو چکا ہے۔ پلیز انہیں فوراً دوائی دیں، رخسانہ صورت حال سمجھ گئی اور فوراً اٹھی اور بیگم صاحبہ کو سہارا دے کر اٹھایا اور یہ کہہ کر اندر لے چلی۔ ''بیگم صاحبہ کی دوائی اور آرام کا وقت ہو چکا ہے۔ آپ سب دوستوں کا بے حد شکریہ''۔ اور یہ ملاقات یہاں ختم ہو گئی۔

بیگم صاحبہ بی بی کی پہلی حکومت میں سینئر وزیر تھیں۔ کابینہ بننے کے چند روز بعد وہ لاہور تشریف لائیں۔ میں نے انہیں درخواست کی کہ گزشتہ ایک ماہ کے دوران جن کارکنوں، ان کے والدین میں سے کسی ایک کا یا کسی کے بھائی یا بہن کا انتقال ہو چکا ہو تو اس کے ساتھ تعزیت کے لیے اس کے گھر جانا چاہیے۔ اس سے جہاں متعلقہ پارٹی کارکن کو حوصلہ ملے گا وہیں دوسرے کارکن خوش ہوں گے اور انہیں احساس ہو گا کہ پارٹی کی اعلیٰ ترین قیادت اپنے کارکنوں کے غموں اور خوشیوں میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ فخر زمان پنجاب پارٹی کے صدر تھے۔

انہوں نے خیال پیش کیا کہ ایسے کارکنوں کو پارٹی کے دفتر میں بلا کر تعزیت کر لی جائے۔ بیگم صاحبہ فخر پر سخت ناراض ہوئیں اور کہنے لگیں ''خدانہ کرے آپ کے ہاں کچھ ایسا واقعہ ہوا ہو اور میں آپ کو اپنے گھر یا دفتر میں بلا کر تعزیت کروں تو آپ کو کتنا اچھا لگے گا؟ پارٹی کارکن ہمارا سرمایہ ہیں۔ کارکن ہیں تو ہم ہیں، پارٹی ہے۔ آپ سوچ سمجھ کر بات کیا کریں۔ آپ پنجاب کے صدر ہیں''۔ میں نے لاہور کے آٹھ کارکنوں کو فون کر کے اطلاع کر دی کہ وہ لوگ گھروں پر رہیں بیگم صاحبہ ان کے ہاں تعزیت کے لیے آئیں گی۔ ان میں پارٹی کے دیرینہ اور مارشل لاء حکومت میں حکومتی تشدد کا مسلسل شکار بننے والے دلاور بٹ بھی شامل تھے جن کی غالباً والدہ کا انتقال چند روز قبل ہی ہوا تھا۔ ہمیں بیگم صاحبہ کو لے کر ان کے بھائی کے گھر جانا تھا جو کریم پارک راوی روڈ میں تھا۔ ہم بیگم صاحبہ کو لے کر وہاں پہنچے مگر دلاور بٹ گھر پر نہیں تھے۔ خیر بیگم صاحبہ کو خواتین کے ساتھ اندر بھیج دیا گیا۔ اب دلاور بٹ صاحب کی تلاش شروع ہوئی مگر رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ دس منٹ کے بعد فخر زمان وہاں سے چلنے پر بضد ہو گئے۔ مگر بیگم صاحبہ نے اندر سے پیغام بھجوایا کہ دلاور بٹ صاحب سے ملے بغیر وہ وہاں سے نہیں جائیں گی۔ دلاور بٹ صاحب کوئی آدھ گھنٹے بعد آئے۔ وہ کہیں ٹریفک میں پھنس گئے تھے۔ خیر وہ اندر آ گئے۔ بیگم صاحبہ سے معذرت کی۔ بیگم صاحبہ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ فاتحہ پڑھی اور اٹھنے لگیں تو بٹ صاحب بضد ہو گئے کہ مشروب پیے بغیر وہ نہیں جانے دیں گے۔ بیگم صاحبہ فوراً ماں بن کر غصے ہونے لگیں'' شرم نہیں آتی۔ موت والے گھر میں مہمان نوازی کرتے ہوئے۔ میں بالکل کچھ نہیں لوں گی''۔ اور زمین پر بچھی دری سے اٹھ کر خواتین سے مل کر باہر آ گئیں۔ اس طرح ہم باقی خاندانوں کے ساتھ تعزیت کرنے ان کے ہاں آ گئے۔

پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کی تنظیم اور لاہور کی تنظیم کے درمیان شروع دن سے محاذ آرائی چلی آ رہی ہے۔ اصولی طور پر لاہور شہر کی تنظیم کا درجہ صوبائی تنظیم کے برابر ہے لیکن فخر زمان بہت محسوس کرتے تھے کہ لاہور کی تنظیم ان کے ماتحت نہیں تھی۔ میں نے کئی بار ان سے

کہا بھی کہ اس کو ایسے ہی رہنے دو لیکن اپنے رویے کے ذریعے لاہور تنظیم کے عہدیداروں کے دل جیتو تو تمہاری ہر بات مانی جائے گی لیکن فخر زمان کو حکم چلانے کا مرض شروع سے ہے۔ دوسروں کی عزت اور احترام کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ ایک بار فخر زمان اور لاہور کی تنظیم کے صدر اسلم گل کے درمیان ٹھن گئی۔ مسئلہ اختیارات کا تھا۔ اسلم گل نہیں چاہتے تھے کہ لاہور کے تنظیمی معاملات میں فخر زمان بطور صدر پنجاب مداخلت کرے۔ لیکن میری بات کو وہ ہمیشہ اہمیت دیتے تھے بلکہ اکثر یوں ہوتا کہ وہ تنظیمی امور پر مجھ سے مشورہ کرتے۔ بیگم صاحبہ لاہور تشریف لائیں۔ وہ بیگم نادر خاکوانی کے ہاں قیام پذیر ہوتی تھیں۔ اگلے روز صبح دس بجے پنجاب اور لاہور کی تنظیموں کے عہدیداروں کا اجلاس بیگم صاحبہ نے بلا رکھا تھا۔ اجلاس شروع ہوا تو فخر زمان نے شکایت کی کہ لاہور کی تنظیم ان کی ہدایت پر عمل نہیں کرتی۔ بیگم صاحبہ نے اسلم گل سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ چونکہ لاہور کی تنظیم کی حیثیت صوبائی تنظیم کے برابر ہے اس لئے وہ کسی دوسری صوبائی تنظیم کے عہدیداروں سے ہدایات نہیں لے سکتے۔ بیگم صاحبہ نے پوچھا ''اسلم گل۔ لاہور کس صوبے میں ہے؟ اسلم گل نے کہا پنجاب میں۔ بیگم صاحبہ نے کہا'' تو پھر آپ فخر صاحب کی ہدایات کیوں نہیں مانتے؟ اسلم گل خاموش ہو گئے۔ اچانک میں نے مداخلت کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر میں نے پارٹی کے قواعد وضوابط بیگم صاحبہ کو پیش کر دیئے اور کہا کہ اسلم گل صحیح کہتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی سرکاری دفتر تو ہے نہیں جہاں اختیارات کے جائز ناجائز ہونے کا مسئلہ درپیش ہو۔ سیاسی تنظیمیں مشاورت سے چلتی ہیں۔ اگر دونوں تنظیمیں ایک دوسرے کے ساتھ مختلف امور پر مشاورت کر لیا کریں تو فیصلوں پر عملدرآمد بہتر طور پر ہو سکے گا۔ بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں۔ اور کہنے لگیں '' آئندہ دونوں تنظیمیں ہر معاملے پر ایک دوسرے کے ساتھ مشاورت کریں گی۔ دونوں تنظیموں کے صدر دفاتر لاہور ہی میں ہیں۔ دونوں کے صدر لاہور ہی میں رہتے ہیں تو پھر مسئلہ کیا ہے؟ چلو دونوں گلے ملو۔ دونوں اٹھے، گلے ملے اور معاملہ طے ہو گیا۔

یہ معاملہ ختم ہوا تو میں نے پارٹی کے لیے فنڈ اکٹھے کرنے کی بات چھیڑ دی۔ اس دوران

چودھری اعتزاز احسن، راجہ پرویز اشرف اور دو تین اور وفاقی وزیر بھی اجلاس میں شامل ہو چکے تھے۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ ''ان وزیروں سے لو۔ ان کے پاس بہت پیسے ہیں۔ کیوں اعتزاز احسن! پرویز اشرف۔ اسی تنظیم کے ذریعے تم منتخب ہوئے ہو، وزیر بنے ہو تو پارٹی فنڈ میں تم لوگوں کو ہر ماہ کچھ نہ کچھ دیتے رہنا چاہئے''۔ اتنی بات کی تھی کہ بیگم صاحبہ کو فون آ گیا۔ ایک طرف ہو کر فون سننے لگیں تو اعتزاز احسن، راجہ پرویز اشرف اور باقی وزراء چپکے سے کھسکتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔ بیگم صاحبہ واپس آئیں تو مخاطب ہوئیں 'ہاں اعتزاز احسن''۔ مگر وہ تو جا چکے تھے۔ بیگم صاحبہ کہنے لگیں ''سب وزیر چلے گئے نا۔ یہ لوگ پارٹی کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ کارکنوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتے''۔ اس کے بعد جو فقرہ انہوں نے کہا وہ ایسا تھا کہ جس سے توہین کا پہلو نکلتا تھا اس لیے میں وہ فقرہ نہیں لکھوں گا۔

میں ایک اچھا مقرر ہوں اور تحریر کے فن سے بھی تھوڑا بہت واقف ہوں۔ میں نے پارٹی کی چیئرپرسن اور شریک چیئرپرسن کے لیے بہت سی تقریریں لکھی ہیں۔ تقریر لکھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مقرر کی شخصیت سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔ اس کو سیاسی، سماجی حالات سے واقفیت ہو، وہ لفظوں کے استعمال کو جانتا ہو۔ جہاں جلسہ ہو رہا ہو اس علاقے کی رہتل سے واقف ہو، لوگوں کے مزاج کو جانتا ہو، علاقے کی سماجی وسیاسی تاریخ پر بات کر سکتا ہو۔ قدرت نے مجھ کو ان میں سے بہت سی خوبیاں ودیعت کر رکھی ہیں۔ بی بی شہید کے پہلے دورِ وزارتِ عظمیٰ میں بیگم صاحبہ سینئر وزیر تھیں۔ وہ مختلف شہروں میں جاتیں، وہاں لوگوں سے ملتیں، کانفرنسیں کرتیں، جلسوں سے خطاب کرتیں۔ عمومی طور پر وہ فخر سے تقریریں لکھنے کو کہتیں۔ اب فخر لکھ تو لیتا ہے لیکن ایسی تقریر نہ تو کر سکتا ہے اور نہ ہی لکھ سکتا ہے کہ جو لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کرے، ان کے دلوں کو چھو لے۔ چنانچہ یہ کام مجھ سے لیتا۔ اس نے مجھ کو کہہ رکھا تھا کہ بیگم صاحبہ جانتی ہیں کہ ان کی تقریریں میں لکھتا ہوں لیکن اس کے جھوٹ کی ہنڈیا بہت جلد بیچ چوراہے میں پھوٹ گئی۔

ہوا یوں کہ سخت گرمی کے دنوں میں بیگم صاحبہ بضد ہو گئیں کہ موچی دروازہ کے باغ میں

پارٹی کا جلسہ کرنا ہے جس کی صدارت مرحوم نوابزادہ نصر اللہ خان کریں گے۔ وہ جلسہ کی تاریخ اور وقت بھی نوابزادہ صاحب سے طے کر چکی تھیں۔ فخر زمان گھبرا گیا کہ یہ سب کچھ دو روز میں کیسے ہوگا۔ میں نے اسلم گل صاحب سے بات کی اور سٹیج کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔ رات کو ڈھائی تین گھنٹے مسلسل بیٹھ کر میں نے بیگم صاحبہ کی تقریر لکھی مجھے نہیں معلوم کہ مجھ پر کیا کیفیت طاری تھی۔ مجھ کو ہوش اس وقت آیا جب تقریر مکمل ہوگئی۔ میں نے دوبارہ پڑھا مجھے اچھی لگی۔ میں نے اگلے روز ٹائپ کروائی اور فائل کور میں رکھ کر فخر زمان کو دے دی۔ اگلی رات جلسہ شروع ہونے تک ہم لوگ انتظامات میں مصروف رہے۔ فخر زمان نے بیگم صاحبہ کو تقریر کی ریہرسل کروائی۔ اگلی رات آئی۔ جلسہ بہت بڑا تھا۔ موچی دروازہ کا باغ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا بلکہ لوگ اکبری منڈی تک کھڑے تھے۔ باہر دو رویہ سڑک لوگوں سے اٹی ہوئی تھی۔ بیگم صاحبہ خوش، نوابزادہ صاحب بہت خوش، نوابزادہ نصر اللہ خان کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔ تین چار مقرر ہم نے رکھے تھے۔ ان کی تقریریں دس بجے تک ختم ہوگئیں۔ اب بیگم صاحبہ کی تقریر کا اعلان ہوا۔ بس یوں لگا جیسے لوگوں میں بجلی کا کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ وہ نعرے لگے، وہ نعرے لگے کہ الامان۔ الامان۔ بیگم صاحبہ نے تقریر شروع کی۔ آغاز ہی ایسا تھا کہ لوگ ضبط نہ کر سکے۔ پھر بیگم صاحبہ روتے روتے تقریر کرتی رہیں اور لوگ دھاڑیں مار کر روتے رہے۔ جب تقریر عروج پر پہنچی تو آسمان پر نہ جانے کہاں سے بادل آئے اور پورے علاقے میں بارش برسنے لگے لیکن کیا مجال جو ایک بھی فرد جلسہ سے باہر ہو گیا ہو۔ بیگم صاحبہ رو رہی تھیں، لوگ رو رہے تھے، آسمان رو رہا تھا۔ لوگوں کی سسکیاں اور ہچکیاں صاف سنی جا سکتی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے تقریر ختم کی تو جانو ہر طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔ ہر کوئی سناٹے کی آواز سن سکتا تھا۔ کئی لمحوں بعد اناؤنسر کو احساس ہوا کہ بیگم صاحبہ کی تقریر ختم ہو چکی ہے۔ وہ مائیک پر آیا اور روتے ہوئے صدر جلسہ نوابزادہ نصر اللہ خان کو خطاب کی دعوت دی۔ نوابزادہ صاحب آئے اور یہ کہہ کر واپس ہو گئے ''میں کیا کہوں۔ بیگم صاحبہ نے جو کچھ کہہ دیا، وہی میں نے بھی کہہ دیا''۔ یہ کہہ کر نواب صاحب سٹیج سے نیچے اتر آئے

بیگم صاحبہ گاڑی میں بیٹھیں تو بارش موسلا دھار ہونے لگی۔ ہم لوگ گوالمنڈی گئے اور وہاں کھانا کھایا، چائے پی لیکن ہر طرف بیگم صاحبہ کی تقریر کا چرچا تھا۔

اگلے روز اخباروں نے تو حد کر دی۔ انگریزی کے اخبار دی نیشن کے سید ثقلین امام نے تو کمال ہی کر دیا۔ انہوں نے لکھا ''بیگم صاحبہ کی تقریر کے دوران ساری کائنات رو رہی تھی۔ خود بیگم صاحبہ، جلسہ میں موجود تمام لوگ رو رہے تھے۔ ٹی وی پر ان کی تقریر سننے والے رو رہے تھے۔ زمین رو رہی تھی، آسمان رو رہا تھا''۔ بیگم صاحبہ کو اگلے روز واپس جانا تھا۔ ہم لوگ انہیں الوداع کہنے ہوائی اڈے پر آئے تھے۔ میں اور طارق خورشید فخر زمان کے ساتھ اس کی کار میں آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ واپس بھی اسی کے ساتھ جانا تھا۔ میں وی آئی پی لاؤنج میں بیگم صاحبہ کے پاس کھڑا تھا۔ اللہ بخشے طلعت یعقوب اور بیگم ریحانہ سرور بھی ان کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ریحانہ نے کہا ''بیگم صاحبہ! آپ نے تو رات سب کو رلا دیا۔ ہر کوئی رو رہا تھا۔ یہاں تک کہ آسمان بھی رونے لگا تھا''۔ بیگم صاحبہ نے فوراً کہا کہ ''تم کیا کہتی ہو۔ مجھے تو خود ہوش نہیں رہا تھا۔ روتے روتے میرا برا حال ہو گیا تھا''۔ اتنی دیر میں فخر زمان تیزی کے ساتھ آیا اور مجھ کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا'' خدا کے واسطے کہیں تم یہ نہ کہہ دینا کہ تقریر تم نے لکھی تھی۔ میں نے بیگم صاحبہ کو یہی بتایا تھا کہ میں نے لکھی تھی'' مجھے سخت تاؤ آیا مگر میں غصہ پی گیا اور بڑے تحمل سے کہا ''فخر! میرا نام فخر زمان نہیں الطاف قریشی ہے۔ میں گھٹیا آدمی نہیں ہوں''۔ یہ کہہ کر میں نے بازو چھڑوایا اور وی آئی پی لاؤنج سے باہر چلا آیا۔ ہوائی اڈے سے باہر آ کر میں نے رکشہ لیا اور شادمان مارکیٹ میں اپنے دفتر چلا گیا۔ اس کے دو روز بعد بیگم صاحبہ سیالکوٹ اور اس کے کچھ دنوں بعد ملتان گئیں۔ فخر زمان کی منت سماجت کے باوجود میں نے بیگم صاحبہ کے لیے تقریریں نہیں لکھیں۔ ایک ماہ بعد بیگم نصرت بھٹو لاہور تشریف لائیں۔ پارٹی دفتر میں پنجاب اور لاہور کی تنظیموں کے عہدیداروں کا اجلاس ہوا۔ اس میں دلچسپ صورتحال اس وقت پیدا ہوئی جب بیگم صاحبہ نے فخر زمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''فخر۔ تمہیں کیا ہوا۔ لاہور والی تقریر نے تو

جادو کر دیا تھا سب پر، سب روئے تھے۔ لیکن اس کے بعد سیالکوٹ اور ملتان کی تقریریں تم نے کیسی لکھیں۔ انتہائی پھسپھسی تھیں۔ میں پڑھ رہی تھی اور مجھ کو خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟'' فخر نے کہا، بیگم صاحبہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی''۔ کیا ہوا تھا''؟ میں بول پڑا'' ان کا ہاضمہ خراب ہو چکا ہے۔ معدہ بالکل کام نہیں کرتا۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ یہ چیک اپ کروائیں کہیں کینسر وغیرہ کی علامتیں ظاہر نہ ہو رہی ہوں''۔ یہ کہہ کر میں اجلاس سے اٹھ کر باہر آ کر سگریٹ پینے لگا۔ سنا ہے بعد میں بیگم صاحبہ اصرار کرتی رہیں کہ فخر فوری طور پر مکمل چیک اپ کروائیں۔

میں نے غالباً 2006ء میں دبئی میں بی بی شہید کے گھر بیگم صاحبہ کی جھلک دیکھی۔ انہیں دیکھ کر مجھے بے حد تکلیف ہوئی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ لگ رہی تھیں۔ ایک جیتی جاگتی ماں لیکن مکمل خاموش۔ مائیں کبھی خاموش نہیں ہوتیں۔ نہ معلوم یہ ماں کیوں مسلسل خاموش تھیں اور اسی خاموشی میں زمین کے اندر اتر گئیں۔ دوسروں کو زندگی دینے والی ماں منوں مٹی تلے دفنا دی گئیں لیکن ان کی ممتا تو آج بھی ہمارے اندر زندہ ہے۔ ہمارے سروں پر اس ماں کی محبت کا سایہ ہے جس نے اپنی تمام خوشیاں ہم پر قربان کر دیں، اس وطن پر قربان کر دیں۔

وطن کی مٹی گواہ رہنا، گواہ رہنا

''یہ دفتر ہے یا گودام؟''

ہمارے دفتر، مساوات کی عمارت انتہائی بدحال اور تاریک تھی۔ لکڑی کا خستہ فرش، فرنیچر ٹوٹا ہوا، بوسیدہ لکڑی کی چھت، جو بارش میں ٹپکا کرتی۔ برسات ہوتی تو ہم اخبار کی کاپی بچانے کی کوششوں میں جت جاتے۔ الغرض بہت ہی بدنما عمارت تھی، حالاں کہ جب یہ دفتر قائم ہوا تھا، تو پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار تھی، مگر انہوں نے اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔

اُسی خستہ حال عمارت میں جلیس صاحب پر ہارٹ اٹیک ہوا۔ اُن کی یاد میں کراچی یونین آف جرنلسٹس نے، جس کا میں جنرل سیکرٹری تھا، پریس کلب میں ایک بہت بڑا تعزیتی جلسہ منعقد کیا، جس میں کراچی کی تمام اہم ادبی، سماجی اور سیاسی شخصیات نے شرکت کی۔ یہاں اس جلسے کا ذکر بھی ناگزیر ہے، جس کا انعقاد مساوات ایمپلائیز یونین نے کیا، کیوں کہ یہیں سے ہمارے احتجاج نے ایک بڑی تحریک کی شکل اختیار کی۔ یہ تعزیتی جلسہ ہمارے خستہ حال دفتر ہی میں ہوا۔

شبرّ اعظمی یونین کے صدر تھے، اور میں بھی ''مساوات'' کے ایک ملازم اور کے یو جے کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے تقریب میں شریک تھا۔ تقاریر جاری تھیں کہ اچانک شور اٹھا۔ کھٹ کھٹ کھٹ، لکڑی کے خستہ حال زینے پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایک عجیب سے اضطراب کی خبر دے رہی تھی۔

پتا چلا، بیگم بھٹو اور بے نظیر آ رہی ہیں۔ ہمیں بہت حیرت ہوئی۔ اس سے قبل پیپلز پارٹی کا کوئی اہم لیڈر ''غم گساری'' کے لیے نہیں آیا تھا، پھر پارٹی کی سربراہ کو ہمارا خیال کیسے آ گیا؟

وہ دونوں اوپر پہنچیں، جلسے کی کارروائی کچھ دیر کو تھی۔ بے نظیر اس وقت خاصی کم عمر تھیں۔ ضیاالحق کی انتقامی کارروائیوں کے باعث ماں بیٹی ویسے ہی صدمات کا شکار تھیں، اب جو انھوں نے ''مساوات'' کا خستہ حال دفتر دیکھا، تو ہکا بکا رہ گئیں۔ سب ہی کرسیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ جو نسبتاً بہتر تھیں، پیش کی گئیں۔ خیر، وہ بیٹھ گئیں۔ جلسہ شروع ہوا۔ شبرّ اعظمی نے اپنی تقریر کے بعد مجھے خطاب کی دعوت دی۔ میں سامعین کے درمیان بیٹھا تھا۔ میں نے کہا: ''میں یہیں سے گفتگو کروں گا۔'' سب حیرت سے میری طرف پلٹے۔ جوانی کا جوش تھا، غصہ تھا۔ میں نے ضیاالحق کے خلاف سخت تقریر کی، اور ساتھ ساتھ پیپلز پارٹی کے لیڈروں کو بھی لتاڑا کہ وہ ہماری خبر لینے کو نہیں آئے۔ دفتر کی حالت زار کی جانب بھی توجہ مبذول کروائی۔ پریس کی واجب الادا رقم کا بھی تذکرہ کیا۔ بیگم صاحبہ سے کہا: ''آپ دیکھ لیں، یہ دفتر ہے یا گودام۔ بارش میں اس کی لکڑی کی چھت ٹپکتی ہے۔ فرنیچر ٹوٹا ہوا ہے......''

وہ خاموشی سے سنتی رہیں۔ بے نظیر بھی سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ پتا نہیں، اس وقت وہ اردو سمجھ سکتی تھیں یا نہیں۔ آخر میں بیگم نصرت بھٹو نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ معذرت بھی چاہی، اور بوجھل قدموں سے دونوں ماں بیٹی رخصت ہو گئیں۔

جلسہ تمام ہوا۔ یکسانیت اور بے زاری نے سب کو مار رکھا تھا۔ کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ لوگ ٹہلتے ہوئے دفتر آتے۔ کوئی شطرنج کی بساط بچھا لیتا، کوئی تاش کھیلتا، کوئی ناول پڑھتا رہتا۔ کرنے کو کوئی کام جو نہیں تھا۔ مارشل لا کے ظالمانہ اقدامات کے خلاف کراچی پریس کلب میں جلسوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ بلاشبہ، ہمارے حوصلے بلند تھے، لیکن طویل بے روزگاری اور فراغت نے نڈھال کر رکھا تھا۔

دوسرے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ ''مساوات'' کے چیف فوٹو گرافر، الطاف رانا،

جو گذشتہ بیس پچیس سال سے بحرین میں ہیں، ہانپتے کانپتے دفتر میں داخل ہوئے۔ وہ کراچی کے بہت مشہور فوٹوگرافر تھے۔ بھٹو صاحب کی تحریک کے دوران ان کا سایہ بنے رہے۔ ہمارے دوسرے فوٹوگرافر، زاہد حسین کی طرح وہ بھی بھٹو خاندان کے بے حد قریب تھے۔ الطاف رانا مجھے چیف صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ آ کر کہنے لگے: ''چیف صاحب، آپ کو 70 کلفٹن پر بیگم صاحبہ نے بُلوایا ہے۔''

وہ ایک معمول کی صبح تھی۔ اور میں ایسی کسی خبر کی توقع نہیں کر رہا تھا، جو مذاق سے کم نہیں تھی۔

میں ہنس پڑا: ''مجھے؟ وہ تو میرا نام بھی نہیں جانتیں۔ ویسے بھی میرا نام ان کے لیے مشکل سا ہے۔''

الطاف نے گردن ہلائی: ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بیگم صاحبہ نے کہا تھا، اُس نوجوان کو بھیجو، جو سخت لہجے میں گفت گو کر رہا تھا، اور ہمارے خلاف بھی اس نے بہت سی باتیں کی تھیں۔''

پہلے تو میں اسے مذاق سمجھ رہا تھا، لیکن اس جملے پر سوچ میں پڑ گیا۔ شاید کسی نے انہیں بتایا ہو کہ میں کے یو جے کا جنرل سیکرٹری بھی ہوں۔

صبح کے دس بج رہے تھے۔ شبرّ اعظمی یا یونین کا کوئی اور نمائندہ دفتر میں نہیں تھا۔ میں اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر 70 کلفٹن روانہ ہو گیا۔

وہ معمول کی صبح تھی، آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے تھے۔ موسم خوش گوار تھا، لیکن دل ملول تھا۔ اتنے سارے بے روزگار ساتھیوں کا کیا بنے گا، سیاہ کار ضیا الحق سے چھٹکارا کب ملے گا...... بیگم صاحبہ نے نہ جانے کیوں بلایا ہے؟

70 کلفٹن اور ایک لاکھ 80 ہزار کا چیک

وہاں خاموشی چھائی تھی۔ کھڑکیوں پر بھاری پردے پڑے تھے۔ ملازمین دبیز قالین پر

دبے پاؤں چل رہے تھے۔ ذرا سا کھٹکا ہوتا، تو سب چونک پڑتے۔ ظاہر ہے، سوگ کا ماحول تھا۔ گھر کا بڑا، کروڑوں لوگوں کا محبوب لیڈر وحشی آمر کی قید میں تھا، جو اسے زندہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

مجھے ڈرائنگ روم میں لے جایا گیا۔ بیگم صاحبہ کے علاوہ ''مساوات'' کے چیف ایڈیٹر بدرالدین صاحب، منیجر نور محمد صاحب اور اکاؤنٹنٹ ہاشمی صاحب وہاں موجود تھے۔ شاید پہلے سے ان کی میٹنگ طے تھی۔

بیگم صاحبہ بہت شفقت سے پیش آئیں۔ خیریت پوچھی۔ میرے لیے چھائے کے ساتھ بسکٹ بھی منگوائے اور کھانے پر اصرار کرتی رہیں۔ میرا دل افسردہ تھا، ایک غم زدہ ماں اور بیوی کے سامنے بسکٹ اڑانا کتنا لرزہ خیز عمل ہوتا۔ مجھے خاموش دیکھ کر کہنے لگیں، ''آپ ہمارے خلاف خوب بولے۔''

میں سمجھا ان کا شکوہ طویل ہوگا، لیکن انہوں نے بھانپ لیا اور فوراً موضوع تبدیل کر دیا، ''اب ذرا بتائیں، ہم کیا کریں؟ ضیاالحق تو ہمیں نہیں چھوڑے گا۔''

میں نے کہا: ''آپ یہ اپنی پارٹی کے لیڈروں سے پوچھیں کہ کیا کیا جانا چاہیے۔''

بیگم صاحبہ نے گردن ہلائی: ''میں تو آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ اُن سے پوچھنا ہوگا تو ان سے بھی پوچھ لیا جائے گا۔''

اس اُفتاد کے لیے میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ میں نے چند ساعت توقف کیا: ''بیگم صاحبہ، حکومت یہ بہانہ کر رہی ہے کہ ہم نے پرنٹنگ پریس کے واجبات ادا نہیں کیے، اس لیے وہ اخبار نہیں چھاپ رہا۔ حکومت کا اس کارروائی میں کوئی عمل دخل نہیں۔ آپ واجبات ادا کر دیں، آگے جو کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا۔''

وہ تلخ انداز میں زیرِلب مسکرائیں: ''دیکھیں، میں سیدھی بات کرتی ہوں۔ آپ کہتے ہیں کہ اگر ہم واجبات ادا کر دیں، تو اخبار چھاپنے کی اجازت مل جائے گی۔ آپ کے یہ ساتھی

آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ یہ فقط بہانہ ہے۔وہ یہ رقم ہڑپ کر جائیں گے،اخبار نہیں چھاپیں گے۔اب بتائیے......"

ان کے خدشات غلط نہیں تھے۔ اور میں یہ ضمانت نہیں دے سکتا تھا کہ واجبات کی ادائیگی کے بعد پرچہ چھپنے لگے گا، البتہ میں نے اپنے تئیں اصولی موقف پر اصرار کیا: "ابھی حکومت کے پاس ایک جواز موجود ہے۔اس کی وجہ سے غلط فہمی پھیل رہی ہے۔خود ہماری تنظیم پی ایف یو جے میں بھی ہمارے چند ساتھیوں کا کہنا ہے کہ یہ آزادیِ صحافت پر حملہ نہیں، فقط واجب الادا رقم کا معاملہ ہے۔ یہ غلط فہمی دور ہونی چاہیے۔ اگر رقم ادا کرنے کے باوجود وہ اخبار کی اشاعت شروع نہیں کرتے،تو ہمیں اُن پر اخلاقی برتری حاصل ہو جائے گی۔"

یہ ایک تلخ حقیقت ہے، پی ایف یو جے اور اپینک میں کئی ایسے ثقہ نام تھے، جنھیں یقین تھا کہ موجودہ صورت حال کو جواز بنا کر تحریک شروع کرنا ایڈونچر ازم ہوگا۔"مساوات" پیپلز پارٹی کا پرچہ تھا۔ پی ایف یو جے میں پیپلز پارٹی کے مخالفین بھی موجود تھے، اور کچھ ساتھی تذبذب اور خوف کا بھی شکار تھے۔ مارشل لا نافذ تھا، معمولی احتجاج بھی خلاف قانون تھا۔ سرسری سماعت کی فوجی عدالتیں پھرکی تھیں......احتجاج ناکام ایڈونچر ثابت ہوسکتا تھا۔

وہ کچھ دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر آواز دے کر اپنے سیکرٹری کو طلب کیا۔دھیرے سے اس سے کچھ کہا۔میری طرف پلٹیں: "آپ بسکٹ کھائیں۔"

میں نے کہا: "اب کسی چیز میں مزہ نہیں رہا۔"

وہ شفقت آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولیں: "آپ تو بہادر نوجوان ہو۔ وقت بدل جائے گا۔ہمیں یقین رکھنا چاہیے۔"

اتنے میں سیکرٹری آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چیک تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ چیک پہلے ہی تیار کرلیا گیا تھا۔

بیگم صاحبہ نے اس پر دستخط کیے، اور چیک میرے ہاتھ پر رکھ دیا، ایک لاکھ اسی ہزار

روپے کا چیک۔ ”یہ لوگ منع کر رہے ہیں، لیکن آپ اسے لے جائیں، جو چاہے کریں۔“

میں اس غیر متوقع ردعمل پر حیران رہ گیا۔ سچ پوچھیے تو حواس باختہ ہو گیا۔ میں نے چیک ان کی طرف بڑھایا۔ ”بیگم صاحبہ، میں تو محض ”مساوات“ کا ایک عام سا ملازم ہوں۔ ہماری انتظامیہ کے افسران یہاں موجود ہیں۔ چیک لے کر انہیں جانا چاہیے۔“

وہ نہیں مانیں۔ میں بھی نہیں مانا۔ کچھ دیر بحث چلی، آخر میں کہنے لگیں: ”ٹھیک ہے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ لوگ چیک لے کر جائیں، تو میری خواہش ہے کہ آپ ان کے ساتھ جائیں۔“

یہ ایک ایسی بیوی اور ماں کی آواز تھی، جس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ ان کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے میں لرز کر رہ گیا۔ میں نے دھیرے سے کہا، ”جیسے آپ کی مرضی۔“

سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

میں مساوات کے چیف اکاؤنٹنٹ ہاشمی صاحب کے ساتھ شیخ النہیان ٹرسٹ کے دفتر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اب وہ معمول کا دن نہیں تھا......اس نے اپنا روپ بدل لیا تھا......آسمان پر بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔ اب میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ہم ضیاالحق کو شکست دے کر رہیں گے۔

ہمارا جواب. بدنیتی بے نقاب

تہی دست اور مظلوم لوگوں کے اندیشے اکثر اوقات امیدوں پر غالب آ جاتے ہیں۔ گو میں اس کی توقع نہیں کر رہا تھا، مگر ایسا ہی ہوا۔ بیگم صاحبہ کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔

جب میں نے ٹرسٹ کی عمارت کے باہر موٹر سائیکل کھڑی کی۔ دھوپ بادلوں کے پیچھے چُھپ چکی تھی۔ برسات کا امکان فضا میں ہمکنے لگا۔ میں نے ہاشمی صاحب سے کہا، آپ کے خیال میں کیا ہو گا؟ وہ کچھ نہیں بولے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

معصوم علی صاحب ٹرسٹ کے جنرل منیجر تھے۔ وہ پیپلز پارٹی کے زمانے میں اس

عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ ''مساوات'' کے بھی جنرل منیجر رہ چکے تھے، یعنی ہمارے ساتھ کام کر چکے تھے۔ ٹرسٹ حکومت کی تحویل میں آ گیا، تو سرکاری ملازم ہو گئے۔

ہمیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے: ''آئیں آئیں۔ بیٹھیں!'' کچھ مشینی سا لہجہ تھا۔ یقیناً وہ جان گئے تھے کہ ہماری آمد کسی غیر معمولی واقعہ کے سبب ہے۔

بات شروع ہوئی۔ چائے منگوائی گئی۔ ''مساوات'' میں پائی جانے والی بے چینی پر بات نکلی، تو انھوں نے ملازمین کے سروں پر منڈلاتے بے روزگاری کے خطرے پر تشویش کا اظہار کیا۔ میں نے کہا: ''معصوم صاحب، آپ کی تشویش پر شکریہ، لیکن اس صورت حال کا ذمے دار کون ہے؟ حکومت کے علاوہ ٹرسٹ کی انتظامیہ نے بھی بیان جاری کیا تھا کہ مساوات پر ایک لاکھ 80 ہزار کے واجبات ہیں۔ یہ لیجیے چیک۔ ادائیگی ہو گئی۔ آج سے اخبار چھاپنا شروع کر دیں۔''

چیک دیکھ کر پہلے تو چونکے، اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر دھیرے سے مسکرائے۔ میز پر شیشے کا گول پیپر ویٹ گھماتے ہوئے کہا۔ ''میاں احفاظ الرحمٰن، آپ اس معاملے کو اتنا آسان سمجھ رہے ہیں؟''

ہاشمی صاحب خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے پوچھا: ''اس کا کیا مطلب ہے؟ واجبات کی ادائیگی تو کر دی ہم نے۔''

مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ آگے کو جھکے، ''یہ تو واجبات کی فقط ایک قسط ہے میاں۔ اس نوع کے کئی واجبات ہیں۔ اس طرح ہم 'مساوات' چھاپنا شروع نہیں کر سکتے۔''

اس پر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا: ''یہ بدنیتی ہے۔ یہ بات آپ لوگوں نے پہلے تو کبھی نہیں کہی۔ جنرل مجیب الرحمٰن نے بھی اپنے بیان میں صرف ایک لاکھ 80 ہزار کا ذکر کیا تھا۔''

انھوں نے گہرا سانس لیا: ''دراصل آپ کو اندازہ نہیں۔ حکومت نہیں چاہتی کہ مساوات چھپے۔ یہ رقم ادا کرنا نہ کرنا برابر ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ یہ چیک آپ واپس لے

جائیں۔''

یہ پریشان کن صورت حال تھی۔ مجھے فوری فیصلہ کرنا تھا۔ ہاشمی صاحب تو کچھ بولنے پر آمادہ نظر نہیں آتے تھے۔

میں نے کھردرے لہجے میں کہا: ''حکومت نے واجبات کو جواز بنا کر اشاعت روکی تھی۔ ہم یہ رقم ادا کررہے ہیں، آپ وصول کریں۔''

اُنھوں نے کاندھے اُچکا کر چیک لے لیا۔

جب ہم باہر آئے، پھوار پڑ رہی تھی۔ میں بھیگتا ہوا دفتر پہنچا۔ چیک کی ادائیگی کی خبر نے سب ساتھیوں کو جوش اور جذبے سے بھر دیا۔ کاپی تیار ہونے لگی، مگر شام ڈھلے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

چیک وصول کرنے کے باوجود ٹرسٹ نے اخبار چھاپنے سے انکار کر دیا تھا۔

میں اور شبرّ اعظمی بالکونی میں کھڑے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے۔ بادل زور سے گرجا۔

''موسم بدل رہا ہے۔'' شبرّ نے آسمان کی سمت دیکھتے ہوئے کہا، ''آپ کا کیا خیال ہے، کیا ہوگا؟''

میں نے ہنستے ہوئے کہا، ''یہی کہ موسم تبدیل ہورہا ہے۔ نہیں ہورہا تو ہمیں تبدیل کرنا ہوگا۔ تیار رہو۔''

واقعی موسم بدل چکا تھا۔ واجبات ادا کرنے کا فیصلہ درست ثابت ہوا۔ فوجی حکومت کی بدنیتی عریاں ہوگئی۔ ہمارا کیس مضبوط ہوا۔ پی ایف یو جے اور اپینک کے ساتھیوں کو سمجھانا اب آسان تھا کہ یہ واجبات کا معاملہ نہیں، آزادیِ صحافت پر براہ راست حملہ ہے۔

رائے عامہ ہمارے حق میں ہموار ہونے لگی۔

برنا صاحب نے پی ایف یو جے کے صدر اور اپینک کے چیئرمین کی حیثیت سے واقعے

کا نوٹس لیا۔ پہلے مقامی سطح پر کے یو جے، کراچی اپنیک ، کے یو جے کے یونٹوں اور اخباری ملازمین کی پلانٹ یونینوں کی میٹنگز ہوئیں، مباحثے ہوئے، متفقہ لائحہ عمل طے کیا گیا۔ پھر وفاقی سطح پر یہ معاملہ زیر بحث آیا۔ وفاقی تنظیموں نے پرامن احتجاج کا طریقہ اپنایا۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ''مساوات'' کی اشاعت فی الفور شروع کی جائے۔ حاکم لوگ ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی کا لبادہ اوڑھے بیٹھے تھے، ہمارے مطالبات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وقت گزرتا رہا...... پی ایف یو جے اور اپنک کی وفاقی ایکشن کمیٹی بنا دی گئی، جس کے صدر منہاج برنا صاحب تھے، سیکرٹری جنرل کی ذمے داری مجھے سونپی گئی۔

17 نومبر 1977ء کو کراچی میں پی ایف یو جے اور اپنک کی وفاقی ایکشن کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اگر ''مساوات'' کو شیخ سلطان النہیان ٹرسٹ کے پرنٹنگ پریس میں چھاپنے کی اجازت نہیں دی گئی تو 3 دسمبر کو کراچی پریس کلب میں احتجاجی بھوک ہڑتال کا سلسلہ شروع کیا جائے گا، جو مطالبات پورے ہونے تک جاری رہے گا۔

ملک بھر کے اخباری کارکنوں نے اس ہڑتال کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ مختلف شہروں سے صحافی کراچی آنے لگے۔ ہمارے پاس رضا کاروں کی طویل فہرست تھی۔

اس اعلان سے سرکاری حلقوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ یہ عام بھوک ہڑتال نہیں تھی۔ مارشل لاء کے ضوابط کی موجودگی میں بھوک ہڑتال کا صرف ایک مطلب تھا، Court arrest یا گرفتاری پیش کرنا! حکومتی کارندے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ حکومت نے موقف اختیار کیا کہ یہ صحافتی نہیں، سیاسی تحریک ہے، بھٹو خاندان کی ایماء پر شروع کی جارہی ہے۔ یوں تو پورا دایاں بازو، ضیا کا حامی اور بھٹو مخالف تھا، مگر اس معاملے میں جماعت اسلامی کا کردار انتہائی منفی رہا۔ صحافیوں میں جماعتیوں نے اس تحریک کی بھرپور مخالفت کی۔

سیکرٹری اطلاعات، لیفٹیننٹ جنرل مجیب الرحمان کو ''اسٹریٹیجک وار ایکسپرٹ'' تصور کیا جاتا تھا۔ وزارت اطلاعات سے ملنے والے اشاروں پر صحافیوں کے خلاف پروپیگنڈا شروع

ہوا۔ پرانے الزامات روغن لگا کر چمکائے گئے۔ ہمیں ''شرپسند''، ''ملک دشمن''، ''غدار'' اور ''کمیونسٹ'' کے القابات سے نوازا گیا۔ خود کو حسب روایت معصوم بنا کر پیش کیا گیا۔ جماعت والے اس مہم میں پیش پیش رہے۔

اوچھے ہتھکنڈے ہمارا کیا بگاڑتے، فیصلہ ہو چکا تھا، جبر کی تاریکی کے خلاف صبح پرست اکٹھے ہونے لگے۔ وہ ہر خوف سے آزاد تھے۔ عزم ان کا ہتھیار تھا...... 3 دسمبر قریب آتا جا رہا تھا...... ایک عظیم تحریک شروع ہونے کو تھی۔

تاہم اُس کے آغاز سے قبل...... ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ یہ ولولہ انگیز منظر آج تک پوری تفصیل کے ساتھ میرے ذہن پر نقش ہے۔ اُسی نے 78-77 کی عظیم الشان تحریک کی منزل کا تعین کیا۔ آج بھی اُسے یاد کرتا ہوں، تو میرے خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔

اس واقعے کا مرکزی کردار تھے منہاج برنا صاحب، جن کے لیے لاہور کے اخباری کارکنوں نے نعرہ ایجاد کیا تھا: ''ترے ساتھ جینا، ترے ساتھ مرنا، منہاج برنا، منہاج برنا!!

بیگم نصرت بھٹو......جرأت مند عظیم خاتون

بیگم نصرت بھٹو عزم واستقلال کا پیکر اور غیر جمہوری قوتوں کے خلاف مزاحمت کی علامت تھیں۔ انہوں نے جنرل ضیاء کے بدترین مظالم کا جس جرأت و بہادری سے مقابلہ کیا وہ ایک شاندار مثال ہے۔ مسلسل قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن سر نہیں جھکایا۔ بیگم صاحبہ نے اپنے کارکنوں کو جنرل ضیاء کی وحشیانہ کارروائیوں کے خلاف پیغام دیا تھا کہ ہمارے سر کٹ سکتے ہیں لیکن جھک نہیں سکتے۔

ہم پاکستان کے لیے نسل در نسل لڑیں گے۔ اس اعلان نے کارکنوں میں بہت حوصلہ و جوش پیدا کر دیا اور جنرل ضیاء کے ظلم وتشدد کا آہنی عزم کے ساتھ مقابلہ کیا۔ بیگم نصرت بھٹو دردمند عظیم خاتون تھیں۔ وہ نہایت شفیق، ہمدرد، غمگسار اور بلند ہمت اور جرأت مند تھیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی سربراہ کے طور پر کارکنوں کا بہت خیال کرتی تھیں۔ ان کے ذاتی مسائل میں دلچسپی لیتی تھیں اور حتی المقدور مدد کرتی تھیں، کارکنوں کو پارٹی کا اثاثہ سمجھتی تھیں اور پیپلز پارٹی کے کارکن بھی بیگم صاحبہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔

محترمہ صنم بھٹو نے گزشتہ سال اپنی والدہ کے انتقال پر کہا تھا کہ بیگم صاحبہ نے اپنی فیملی کو جوائن کر لیا ہے۔ صنم بی بی کے اس ایک جملہ میں بیگم نصرت بھٹو کی زندگی کے اذیت ناک لمحات کی کہانی مضمر ہے۔ بیگم نصرت بھٹو کا یوم ولادت 23 مارچ ہے۔ 23 مارچ 2011ء کو ہی وہ یہ دنیا

چھوڑ کر اپنے شوہر ذوالفقار علی بھٹو، دونوں بیٹوں شاہنواز، میر مرتضیٰ اور پیاری بیٹی بینظیر بھٹو کے پاس چلی گئی ہیں۔

بیگم نصرت بھٹو کی زندگی دکھوں اور غموں کی کہانی ہے۔ زندگی کی آخری دہائی مشکل ترین اور اذیت ناک تھی۔ یادداشت ساتھ چھوڑ گئی تھی، نہ کسی کو پہچانتی تھیں اور نہ ہی بات کرسکتی تھیں، انہیں یہ تک پتہ نہیں ہوتا تھا کہ بیٹی بینظیر اور اس کے بچے نواسہ اور نواسیاں ان کے پاس بیٹھے ہیں۔ ان پر کیا گزر رہی ہے، وہ اس کا اظہار ہی نہیں کرسکتی تھیں۔ ایک عظیم اور باوقار ملک کی سابق خاتون اول کو دیکھ کر ان کی پیاری اولاد کی جو کیفیت تھی، اس سے وہ بے خبر تھیں۔ دوبئی میں بیٹی بینظیر کا گھر ان کا مسکن تھا۔ وہ خادماؤں کے سہارے زندگی کے دن بسر کر رہی تھیں۔ بی بی ایک فرض شناس بیٹی کی طرح ان کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ بی بی ڈنر ٹیبل پر بیگم صاحبہ کو اپنے اور بلاول کے ساتھ بٹھاتی تھیں۔ بختاور اور آصفہ میز کے دوسری طرف سامنے بیٹھتی تھیں۔ بیگم صاحبہ کو کھانا خادمہ کھلاتی تھی۔ بی بی کا معمول تھا کہ کھانے کے بعد بیگم صاحبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کافی دیر تک ان سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ اس کا جواب بیگم صاحبہ کی خاموشی ہوتی۔

بیگم صاحبہ کی کتاب زندگی کا یہ دردناک ترین باب تھا۔

بی بی کا اپنی والدہ سے ہمکلامی کا یہ رشتہ تکلیف دہ ہونے کے باوجود قدرے اطمینان کا باعث تھا۔ بی بی نے جس طرح ان کی خدمت کی، بلاشبہ انہوں نے ماں کے قدموں تلے جنت میں جگہ بنالی۔

قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کی قید کے دوران بیگم نصرت بھٹو کو پارٹی کی قائم مقام چیئر پرسن بنا دیا گیا۔ وہ بطور چیئر پرسن مارشل لاء کے خلاف سینہ سپر ہوگئیں اور بے مثال جرأت و بہادری کے ساتھ عوام کے جمہوری حقوق کی آواز بلند کی۔ انہیں اس جمہوری وعوامی جدوجہد سے روکنے کے لیے جیل اور گھر میں قید کر دیا گیا۔ مگر اس بہادر خاتون نے مضبوط اعصاب کے ساتھ تمام مشکلات ومصائب برداشت کیے۔ کارکنوں نے بھی اپنی قائد کی پیروی میں، اس جمہوری

جدوجہد میں بہادری کے نئے باب رقم کیے اور اپنے کردار و عمل سے پاکستان پیپلز پارٹی کا پرچم سربلند رکھا۔ انہیں یہ طاقت بیگم صاحبہ کی ولولہ انگیز بے خوف قیادت سے ملی۔ لاہور کے قذافی سٹیڈیم میں بیگم صاحبہ پر تشدد کیا گیا اور زخمی بیگم بھٹو کی یہ تصویر دنیا کے میڈیا میں شائع ہوئی جس سے جنرل ضیاء کی بربریت آشکار ہوئی اور جنرل ضیاء کی آمریت کا سیاہ چہرہ بے نقاب ہوا۔

بیگم نصرت بھٹو پر دوسرے درجہ کا ذہنی تشدد کیا گیا، ان کی جواں سال بیٹی بے نظیر بھٹو کو قید اور نظر بند کر کے علیحدہ رکھا گیا۔ بے نظیر بھٹو کو سکھر جیل میں شدید گرمی میں رکھا گیا۔ انہوں نے یہ سب کچھ برداشت کیا اور عزم اور ولولہ کے ساتھ جنرل ضیاء کے جبر کو چیلنج کر کے ان کی نیندیں حرام کر دیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے پھانسی کی کوٹھڑی سے میر مرتضیٰ بھٹو کے نام خط میں بیگم صاحبہ اور بے نظیر بھٹو کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

''ان بدترین حالات میں جن سے ہم پہلے کبھی نہیں گزرے، آپ کی والدہ اور ہمشیرہ میرے لیے قوت کا ایک شاندار ستون ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شاندار مجاہدانہ مدد کے بغیر حالات میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن بن جاتے۔ عدالتوں اور انتظامیہ میں میرے لیے کوئی انصاف نہیں صرف اللہ تعالیٰ اور عوام کے ہاتھ میں میری زندگی ہے۔''

پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے عدالتی قتل کے بعد بیگم نصرت بھٹو نے سیاسی اور جمہوری جدوجہد تیز کر دی۔ عوام ان کے ساتھ تھے۔ انجام کار جنرل ضیاء نے اپنی بزدلی کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے 16 اکتوبر 1979ء کو انتخابات منسوخ کر دیئے۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ فوجی ڈکٹیٹر کی اس بزدلانہ کارروائی سے کارکنوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن انہوں نے حوصلہ مندی سے جبر اور ظلم برداشت کیا، کوڑے کھائے اور جئے بھٹو کے نعروں سے سیاسی فضا گونجنے لگی۔

ضیاء آمریت کا یہ ہولناک سیاہ دور تھا۔ بیگم صاحبہ نے اپنے دونوں بیٹوں میر مرتضیٰ بھٹو

اور شاہنواز بھٹو کی جدائی کا غم بھی برداشت کیا۔ انہوں نے جنرل ضیاء کی امیدوں کی کمر توڑ دی۔ اور ان کا جذبۂ حریت اور خودی تابناک رہا۔ بیگم صاحبہ طویل قید کے دوران پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا ہوگئیں۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوئیں۔ آخرکار بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے انہیں علاج کی غرض سے بیرون ملک جانے کی اجازت دے دی گئی۔ بیگم صاحبہ 22 نومبر 1982ء کو جرمنی کے شہر میونخ پہنچیں۔ ان کی صحت بے حد تشویشناک تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھائی دیتی تھیں۔ بیگم نصرت بھٹو نے اپنی شدید علالت کے باوجود یورپی ملکوں سے آئے ہوئے پارٹی ورکروں کے ایک اجتماع میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

''پاکستان کے موجودہ حکمرانوں نے ملک میں روایتی ظالمانہ ہتھکنڈوں سے عوام کی جو تذلیل کی ہے پاکستان کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ افواج پاکستان میں خیبر سے کیماڑی تک ہر جگہ کوڑوں کی بھرمار ہے، ملک کی جیلیں سیاسی کارکنوں سے بھری پڑی ہیں اور ایک ظالم انسان جنرل من مانی کر رہا ہے۔ اس غیر آئینی فوجی حکومت کے خاتمہ ہی میں ملک کی بقا ہے۔ اس لیے پاکستان کے عوام کو چاہیے کہ وہ اندرون ملک اور بیرون ملک مارشل لاء کے خاتمہ، انسانی حقوق اور آئین و جمہوریت کی بحالی کے لیے آگے بڑھیں اور مارشل لاء کی پابندیوں کی پروا کیے بغیر سراپا احتجاج بن جائیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور دیگر جمہوریت پسند پاکستانیوں کا یہ فرض ہے کہ ملک میں مارشل لاء کے بظاہر مضبوط لیکن اندر سے کھوکھلے ستونوں کو آخری ٹھوکر لگا کر زمین بوس کر دیں۔''

بیگم نصرت بھٹو نے 5 جنوری 1979ء کو مساوات ویکلی لندن کو اپنے خصوصی انٹرویو میں بھٹو صاحب کے خلاف جھوٹے مقدمہ قتل کے بارے میں کہا تھا:

''لاہور ہائیکورٹ کی کارروائی سے برطانیہ کی اس بدنام ترین عدالت اسٹار چیمبر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جہاں انصاف کے تقاضوں کو یکسر پس پشت ڈال کر بے گناہوں کو ٹاور آف لندن کے جلاد کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس عدالت میں قانون کا جاہ و جلال نہیں ایک قصاب کی

دکان کا منظر نظر آتا ہے۔

جناب بھٹو کے خلاف یہ قتل کا مقدمہ نہیں بلکہ مقدمے کا قتل ہے۔

ہم انصاف چاہتے ہیں اور عوام انصاف کے خواہاں ہیں۔ ہم ایسے بے گناہ کی بریت چاہتے ہیں جو اتفاق سے پاکستان کے عوام کا منتخب نمائندہ ہے۔ وفاق اپنے رہنما کے لیے انصاف کا طالب ہے، وفاق بریت چاہتا ہے۔ عوام اس سے کمتر کوئی چیز قبول نہیں کریں گے۔ مکاری اور دغابازی سے ہونے والے فیصلہ کو آزاد عوام کی منتخب پارلیمنٹ میں تحقیقات کے لیے پیش کیا جائے گا۔ اگر مارشل لاء نے انصاف کی آبروریزی کی تو پارلیمنٹ اس سازش کی تحقیقات بھی کرے گی جو عوام کے منتخب نمائندے کو عدالتی کارروائی کی آڑ میں قتل کے لیے کی گئی ہے۔"

بیگم نصرت بھٹو کا یہ تاریخی بیان کہ سابق وزیراعظم پاکستان کے عدالتی قتل کی سازش کو عوام کی منتخب پارلیمنٹ میں تحقیقات کے لیے پیش کیا جائے گا، ہنوز تشنہ طلب اور شرمندہ تعبیر ہونے کا منتظر ہے۔

(روزنامہ جنگ

نیشن لندن 23 مارچ 2012)

چند یادیں! بیگم نصرت بھٹو

آج 23 اکتوبر کو بیگم نصرت بھٹو کی دوسری برسی ہے۔ 23 مارچ بیگم نصرت بھٹو کا یومِ ولادت ہے۔ 23 مارچ 2011ء کو جناب آصف علی زرداری صدر پاکستان نے بیگم نصرت بھٹو کو پاکستان کا اعلیٰ ترین ایوارڈ نشانِ پاکستان جمہوریت کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف میں دیا تھا اور انہیں ''مادرِ جمہوریت'' کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔ مادرِ جمہوریت بیگم نصرت بھٹو کی جمہوری جدوجہد اور عظیم قربانیوں کی داستان عوام کے دلوں پر نقش ہے۔ دوسری برسی کے موقع پر انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے چند یادیں پیش خدمت ہیں۔

4 اپریل 1984ء کو ذوالفقار علی بھٹو شہید کی پانچویں برسی میں بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو پہلی مرتبہ ایک ساتھ شریک ہوئیں۔ لندن کی ویمبلے مسجد میں قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ انگلینڈ کے مختلف شہروں سے پارٹی عہدیدار بھی شریک ہوئے اور عظیم لیڈر کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔ برسی کی تقریب کو مقامی انگریزی پریس میں نمایاں طور پر شائع کیا گیا۔ قائدِ عوام کی پانچویں برسی کے سلسلے میں لندن کے علاقے الرزکورٹ کے بڑے ہال میں جلسہ عام منعقد ہوا۔ تقریب کی یہ خصوصیت تھی کہ اس میں پارٹی کے مرکزی رہنماؤں اور عہدیداروں کے علاوہ انگلینڈ اور یورپ کے ممالک میں پی پی پی کے نمائندوں اور کارکنوں نے بڑی تعداد میں شریک کی۔ بعض عرب مملک کے سفارتی نمائندے بھی موجود تھے اور انہوں نے بی بی کی تقریر سنی جس

میں بی بی نے اعلان کیا تھا کہ وہ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی اور انسانی حقوق کے لیے قائدعوام ذوالفقار علی بھٹو کے مشن پر کاربند رہیں گی۔ اس جلسہ عام کے بعد بیگم صاحبہ پیرس چلی گئیں۔ اپنی علالت کے باوجود بیگم صاحبہ پارٹی کارکنوں سے ملاقات کرتی تھیں اور انہیں اپنی بیٹی شریک چیئرپرسن کا مکمل ساتھ دینے کی تلقین کرتی تھیں تاکہ جنرل ضیاء کی آمریت کا خاتمہ کیا جاسکے۔ بیگم نصرت بھٹو کو دانشوروں اور اہل قلم سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ اردو روانی سے بولتی تھیں۔ انگریزی اور اردو اخبارات کا مطالعہ کرتی تھیں۔ بیگم صاحبہ مساوات کو سیاسی قوت کے اظہار کا اہم ذریعہ سمجھتی تھیں۔ بی بی نے لندن سے ماہنامہ ''عمل'' جاری کیا۔ اسے بہتر بنانے اور مضامین کے سلسلے میں بیگم صاحبہ رہنمائی کرتی تھیں۔ میر مرتضٰی بھٹو نے 1978ء میں بیگم صاحبہ کی ہدایت پر لندن سے مساوات ویکلی کا اجراء کیا تو بیگم صاحبہ نے اس کی تحسین کی تھی۔ بیگم نصرت بھٹو دردمند، عظیم انسان تھیں۔ ان کی شخصیت بے داغ تھی۔ پارٹی کی سربراہ کے طور پر کارکنوں کا بہت خیال کرتی تھیں۔ وہ لیڈروں کے بجائے کارکنوں کو زیادہ اہمیت دیتی تھیں، ان کے ذاتی مسائل میں دلچسپی لیتی تھیں اور حتی المقدور مدد کرتی تھیں۔ وہ پارٹی کارکنوں کو اثاثہ سمجھتی تھیں۔ بیگم صاحبہ کا پارٹی کارکنوں کے ساتھ احترام کا پائیدار رشتہ آخر دم تک قائم رہا۔ بیگم صاحبہ کو وہ لوگ پسند نہیں تھے جو پارٹی مفادات کو نقصان پہنچانے کے ذمہ دار تھے۔ بیگم صاحبہ کو یہ شکایت تھی کہ بی بی کے گرد و پیش بعض لوگوں نے ان پر جادو کیا ہوا ہے اور وہ غلط مشورے دیتے ہیں۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے 1969ء میں بیگم نصرت بھٹو سے میرا پہلا تعارف کرایا تھا۔ میں نے بریڈفورڈ اور برمنگھم میں بھٹو صاحب کے عوامی جلسوں کا انتظام کیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے بھٹو صاحب کے ساتھ ان جلسوں میں شرکت کی اور عوام نے ان کا فقید المثال استقبال کیا تھا۔ بیگم بھٹو اس سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ خاتون اول بیگم نصرت بھٹو 1972ء میں لندن آئیں ان کا قیام پاکستانی سفیر میاں ممتاز دولتانہ کے ہاں تھا۔ میری بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں بتایا کہ لندن میں ''ڈان'' کے نمائندے نسیم احمد نے وزیراعظم کے چیف سکیورٹی افسر سے ملاقات کرائی

ہے اور انہوں نے مجھے اس کے ساتھ رابطہ کے لیے کہا ہے۔"

بیگم صاحبہ نے مجھے ہدایت کی کہ "یہ پولیس والا ہے اور اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔" آپ وزیراعظم ہاؤس میں صرف مجھ سے رابطہ رکھیں اور ہر ضروری اطلاع مجھے دیا کریں اور میں وزیراعظم کو اس سے آگاہ کروں گی۔" بیگم صاحبہ کی اس کے بارے میں رائے درست ثابت ہوئی، قصوری کے جھوٹے مقدمہ قتل میں اسی چیف سکیورٹی افسر نے اپنے اسی وزیراعظم کے خلاف سلطانی گواہ بن کر لاہور ہائی کورٹ میں شہادت دی تھی جن کے نام پر اس نے ہر کس و ناکس پر دھونس جما رکھی تھی۔ فوجی آمر جنرل ضیاء نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے عدالتی قتل کے بعد ان کے خاندان کے خلاف انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بےنظیر بھٹو کو مختلف جیلوں میں قید اور گھروں میں نظر بند کرنے کی اذیت ہی نہیں دی بلکہ انہیں ہراساں کرنے کے لیے ان کی جائیداد ضبط کرنے کے گھناؤنے اقدام سے بھی گریز نہیں کیا۔ انتقام کی وحشیانہ کارروائیاں بھی بیگم نصرت بھٹو کے عزم و استقلال کو کمزور نہ کر سکیں بلکہ انہوں نے فولادی قوت سے ان کا مقابلہ کر کے جنرل ضیاء کے مذموم عزائم کو ناکام بنایا۔ وہ ان کے حوصلہ کو پست نہ کر سکا۔ جنرل ضیاء ہر کوشش کے باوجود شہید قائد عوام اور ان کے خاندان کے خلاف کرپشن کا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکا، اس میں ناکامی کے بعد ضیاء نے انکم ٹیکس کی عدم ادائیگی کا افسانہ تراشا اور کثیر رقم کا جھوٹا کیس بنا کر نوٹس دیا کہ اگر ٹیکس ادا نہ کیا گیا تو ان کی رہائشی جائیداد ضبط کر لی جائے گی۔ لندن کے مقتدر اخبار گارڈین نے یہ خبر شائع کی کہ جنرل ضیاء کی فوجی حکومت نے بیگم نصرت بھٹو کو تین لاکھ ستاسی ہزار پونڈ انکم ٹیکس ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور عدم ادائیگی کی صورت میں کراچی میں ان کی رہائش گاہ 70 کلفٹن ضبط کر لی جائے گی۔ ایک دوست عرب ممالک کے سفیر نے گارڈین کی خبر پڑھ کر مجھ سے رابطہ کیا اور یہ پیش کش کی کہ ان کی حکومت یہ رقم ادا کرے گی تاکہ ذوالفقار علی بھٹو کی بیوہ اور ان کی بیٹی کو گھر سے بےدخل نہ کیا جائے۔ اتفاق سے بیگم صاحبہ آزاد تھیں۔ میں نے انہیں کراچی فون کر کے اس پیش کش سے آگاہ کیا۔ بیگم صاحبہ

نے کہا کہ جنرل ضیاء بے شک ہمیں گھر سے نکال دے ہم باہر سڑک پر بیٹھ جائیں گے لیکن اس جھوٹے کیس میں ایک روپیہ بھی نہیں دیں گے۔ آپ ان کا شکریہ ادا کردیں۔ میں نے بیگم صاحبہ کے جواب سے انہیں مطلع کردیا کہ بیگم صاحبہ آپ کی تشویش کے لیے شکرگزار ہیں لیکن پیش کش قبول کرنے سے معذرت کرلی ہے۔

1993ء میں انتخابات کا اعلان ہوا تو میر مرتضیٰ بھٹو نے دمشق سے یہ اعلان کردیا کہ وہ سندھ میں صوبائی اسمبلی کے 17 حلقوں سے انتخاب لڑیں گے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی مگر میر مرتضیٰ بھٹو اپنی ضد پر رہا۔ بیگم صاحبہ نے اسے کہا کہ جتنے حلقوں سے بھی انتخاب لڑو لیکن تمہارا ووٹ اسمبلی میں ایک ہی ہوگا اور پارٹی کو اس سے بہت نقصان ہوگا۔ بیگم نصرت بھٹو، مرتضیٰ کی واپسی کے لیے بے چین تھیں لیکن پیپلز پارٹی کے امیدوار کے مقابلے میں اپنے بیٹے کی حمایت پر بیگم صاحبہ کی مخالفت شروع کردی گئی حالانکہ وہ پارٹی کی چیئرپرسن تھیں۔ اس صورتحال نے پیچیدہ شکل اختیار کرلی۔ ماں بیٹی میں بدگمانی جنم لے چکی تھی۔ بیگم نصرت بھٹو کی ممتا کی آزمائش کا یہ بہت کٹھن وقت تھا۔ ایک طرف بیٹی تھی اور دوسری طرف بیٹا۔ انہیں بیٹی اور بیٹے سے محبت کا عذاب برداشت کرنا پڑا۔ 20 ستمبر 1996ء کو مرتضیٰ بھٹو کا کراچی میں قتل ہوا۔ اس وقت بیگم صاحبہ لندن میں تھیں اور اس المناک واقعے سے بے خبر تھیں۔ مرتضیٰ کی سالگرہ 18 ستمبر کو ہے۔ انہوں نے بیٹے کے لیے تحائف خریدے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جس طرح وہ بیٹے کو سفرِ آخرت میں نہ دیکھ سکی تھیں۔ اسی طرح جب بی بی 27 دسمبر 2007ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں شہید کردی گئیں تب بھی انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی پیاری بیٹی خالق حقیقی سے جا ملی ہیں اور اسی بے خبری کے عالم میں وہ دنیا کو الوداع کہہ کر اپنے پیاروں کے پاس چلی گئیں۔

(روزنامہ جنگ، 23 مارچ 2013ء)

ےےے

مادرِ جمہوریت،نشانِ پاکستان

جناب آصف علی زرداری کے دورِ حکومت کا یہ خوش آئند اقدام ہے کہ بیگم نصرت بھٹو کو پاکستان کا سب سے بڑا سول ایوارڈ نشان پاکستان دیا گیا۔ یہ اعزاز ان کی سیاسی، سماجی، انسانی حقوق اور جمہوریت کیلئے عظیم الشان جدوجہد کے اعتراف میں دیا گیا جس کی وہ بلا شرکت غیرے مستحق تھیں۔ بیگم نصرت بھٹو کی دلیرانہ جدوجہد جنرل ایوب کے دور سے شروع ہو کر جنرل ضیاء کے انتہائی سفاکانہ اور جابرانہ دور تک محیط ہے۔ جنرل ایوب نے جب جناب ذوالفقار علی بھٹو کو اپنی حکومت کے خلاف سرگرمیوں پر جیل میں ڈالا تو بیگم بھٹو اس کے خلاف میدان عمل میں آئیں اور ان کی رہائی کیلئے بھرپور مہم چلائی۔ 1970ء کے انتخابات کے نتیجے میں جب پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو بیگم نصرت بھٹو نے خاتون اول کی حیثیت سے عوامی بہبود کے لیے بہت سے فلاحی کام کیے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے شعبہ خواتین کو منظم کر کے خواتین میں سیاسی شعور بیدار کیا۔ شعبہ خواتین کی سربراہ کے طور پر انہوں نے تنظیم سازی کی اور انتخابات کروا کر جمہوریت کی اصل روح اجاگر کی۔

جنرل ضیاء کے آمرانہ دورِ حکومت میں بیگم نصرت بھٹو نے یادگار کردار ادا کیا۔ بیگم صاحبہ نے پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں میں جرأت و ہمت کی لو بجھنے نہیں دی۔ ان کی قیادت میں پاکستان پیپلز پارٹی جبر و تشدد کے باوجود مستحکم ہو کر آمریت کے خلاف سینہ سپر رہی۔ فوجی

آمریت کے اس اذیت ناک عہد ستم میں بیگم نصرت بھٹو کو مہلک بیماری لاحق ہوئی۔ فوجی آمر ضیاء کی طرف سے علاج میں رکاوٹیں کھڑی کی جارہی تھیں۔ بیماری کی تشخیص کے باوجود علاج کیلئے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جارہی تھی۔ اس صورتحال میں بھی انہوں نے اپنے اعصاب مضبوط رکھے۔ عالمی دباؤ نے بالآخر ضیاء کو مجبور کردیا اور 22 نومبر 1982ء کو وہ جرمنی کے شہر میونخ پہنچ گئیں۔ ملک سے روانگی کے وقت بیگم صاحبہ نے اپنے پیغام میں واضح طور پر کہا کہ ہمیں سچائی اور صداقت کی راہ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ عوام کی طاقت ہمارے ساتھ ہے اور عوام کی طاقت دوسری تمام طاقتوں سے زیادہ ہوتی ہے۔

بیگم نصرت بھٹو سے میری پانچ برس بعد 3 دسمبر 1982ء کو میونخ میں ملاقات ہوئی تو بیگم صاحبہ نے کہا کہ ہم 5 سال بعد مل رہے ہیں۔ ان پانچ سالوں میں ایک قیامت گزری ہے۔ قائدعوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت اور ان برسوں میں ظلم کی جو آندھی چلی تھی وہ بیگم صاحبہ کے چہرے سے عیاں تھی لیکن ان کی جرأت وعظمت کا یہ عالم تھا کہ پانچ سال کے ظلم وستم کو ان کے عزم واستقلال سے مات کھانا پڑی تھی۔ میں نے پانچ سال قبل بیگم صاحبہ کو پاکستان میں ہشاش بشاش، صحت مند، متحرک اور فعال شخصیت کے روپ میں دیکھا تھا۔ اب ان کو بیماری کی حالت میں دیکھ کر میرے قدموں تلے سے جیسے زمین سرک گئی لیکن بیگم صاحبہ اپنے عظیم شوہر کے ناقابل برداشت صدمہ کو سینے میں چھپائے علالت کے باوجود جرأت کا پیکر تھیں۔ بیماری کے باوجود ان کی شخصیت میں وہی وقار، عظمت اور استقلال تھا۔ بیگم صاحبہ کا حوصلہ قابل داد تھا کہ انہوں نے جابرانہ حالات سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے اپنے اعصاب کو کمزور نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے بڑی خوداعتمادی سے کہا کہ ''پچھلے بارہ دن سے میری صحت بہتر ہوئی ہے۔ پاکستان کی نسبت میری حالت بہت اچھی ہے۔ کھانسی اگرچہ کم نہیں ہوئی لیکن خون آنا بند ہوگیا ہے۔''

بیگم نصرت بھٹو نے میونخ میں مختلف یورپی ممالک سے آئے ہوئے پارٹی کارکنوں کے ایک استقبالیہ سے خطاب میں عوام سے اپیل کی کہ وہ ملک میں جمہوریت، انسانی حقوق،

مارشل لاء کے خاتمہ اور آئین کی بحالی کے لیے مزید جدوجہد کے لیے آگے بڑھیں اور مارشل لاء کی پابندیوں کی پروا کیے بغیر سراپا حرکت و عمل بن جائیں۔

سیاست میں خواتین کے کردار کے بارے میں بیگم نصرت بھٹو کا یہ واضح نقطہ نظر تھا کہ خواتین نے پیپلز پارٹی کے پرچم تلے پہلی بار آمریت کے خلاف جدوجہد کی۔ اس جدوجہد میں عورتوں نے لاٹھیاں کھائیں۔ پاکستانی معاشرے میں عورت سب سے مظلوم رہی ہے۔ وہ پیپلز پارٹی کی سوچ کے مطابق پاکستان کی نصف آبادی کے سیاسی کردار کو بڑھانا چاہتی تھیں۔ مجھ سے وزیراعظم ہاؤس میں ایک ملاقات میں بیگم صاحبہ نے اپنے بارے میں بتایا کہ ''جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو سماجی کاموں میں میری کارکردگی بھٹو صاحب کی مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ میں عملاً سماجی کارکن ہوں اور خود کو سماجی کاموں تک محدود رکھتی ہوں۔ میرے پاس ایسے لوگ اکثر آتے ہیں جن کو قطعی علم نہیں کہ اپنے کام کے لیے انہیں کس کے پاس جانا چاہیے۔ انہیں معلوم نہیں کہ ڈی سی آفس جانا ہے، مجسٹریٹ کے پاس جانا ہے یا کسی وزیر سے رجوع کرنا ہے۔ میرے پاس ایسے ہی لوگ آتے ہیں اور اپنے مسائل سے آگاہ کرتے ہیں چنانچہ میں ان کی رہنمائی کر دیتی ہوں کہ ان کا کام کہاں ہو سکتا ہے لیکن میں قانونی حدود میں رہ کر ہی مدد کر سکتی ہوں۔ کسی ناجائز کام کے سلسلے میں ان سے تعاون نہیں کر سکتی ہوں۔ بے شک میری کوئی دوست اور سہیلی ہو میں کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں برتتی۔ دوسرا یہ کہ میں خلاف قانون کوئی بات نہیں کرتی، اپنے سیکرٹریوں کو اس سلسلے میں ہدایات دے رکھی ہیں، افسروں اور ملازموں کے تبادلوں کے سلسلے میں قطعی مداخلت کرنا پسند نہیں کرتی۔''

بیگم صاحبہ کو 1975ء میں میکسیکو میں خواتین کی عالمی کانفرنس میں نائب صدر منتخب کیا گیا۔ یہ پاکستان کیلئے ایک بڑا اعزاز تھا۔ اس کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے بیگم صاحبہ نے یہ واقعہ سنایا کہ وہاں بھارتی وفد کی ایک رکن خاتون نے ہمارے وفد کی ایک لڑکی سے استفسار کیا کہ آپ کون ہیں پاکستانی، لڑکی کا جواب تھا بھارتی رکن نے وضاحت چاہی کہ پاکستان کے کس حصے

سے تعلق ہے؟ پاکستان سے، لڑکی نے جواب دیا۔ بھارتی رکن نے پھر سے سوال دہرایا۔ دراصل وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ لڑکی پٹھان ہے، بلوچ ہے کیا ہے؟ لیکن اس بارے میں بھی ہماری لڑکی نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''میں پاکستانی ہوں'' اس کا جواب سن کر مجھے جو مسرت ہوئی اس کا اظہار بیان سے باہر ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ نئی نسل کی سوچ یہی ہونی چاہیے کہ وہ پاکستانی ہے اور پاکستانی ہونے پر اسے فخر ہے۔''

ان کی زندگی انسانی حقوق کی پاسداری، سیاسی شعور کو اجاگر کرنے اور جمہوریت کا تحفظ کرتے ہوئے گزری۔ بیگم نصرت بھٹو آج دنیا میں نہیں ہیں۔ 23 مارچ ان کا یوم ولادت اور یوم پاکستان بھی ہے۔ اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بیگم نصرت بھٹو واقعی نشانِ پاکستان ہیں۔

(روزنامہ جنگ، اوصاف، 23 مارچ 2014ء)

عزم و ہمت کا پیکر

23 مارچ یوم پاکستان بھی ہے اور مادر جمہوریت بیگم نصرت بھٹو (نشان پاکستان) کا یوم ولادت بھی۔ یہ تاریخی دن دونوں لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن یوم پاکستان اور اپنی قائد کی سالگرہ دونوں احترام وعقیدت کے ساتھ مناتے ہیں۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کے عدالتی قتل کے بعد بیگم نصرت بھٹو ایک طرف آمریت کیخلاف پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت کرتی رہیں اور دوسری طرف شوہر کی شہادت کے بعد خاندان کی ہمت بھی بندھاتی رہیں۔ بیگم صاحبہ ایک عظیم سیاسی رہنما اور عزم و ہمت کا پیکر تھیں۔ وہ اگر جنرل ضیاء کی آمریت کے خلاف سینہ سپر نہ ہوتیں تو پاکستان پیپلز پارٹی کا مستقبل خطرے سے دوچار ہوسکتا تھا۔ ان کی جرأت مندانہ قیادت کی بدولت پارٹی کارکنوں میں نیا جوش و جذبہ موجزن ہوا۔ انہوں نے کئی سال تک آمریت کے ظلم سہے مگر طالع آزما کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔

یہ 3 دسمبر 1982ء کی بات ہے۔ بیگم صاحبہ میونخ کے ایک ہوٹل کے کمرہ نمبر 414 میں مقیم تھیں۔ صوفے پر تشریف فرما بیگم صاحبہ نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''ہم پانچ سال بعد مل رہے ہیں۔ ان برسوں میں ایک قیامت گزری ہے۔'' قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت اور پانچ برسوں تک ظلم کی جو آندھی چلی اس کے آثار بیگم صاحبہ کے چہرے پر پڑھے جاسکتے تھے۔ چند دن قبل بی بی سی ٹیلی ویژن پر بیگم صاحبہ کا انٹرویو نشر ہوا تھا۔ یہ

انٹرویو انہوں نے بستر پر دراز ہو کر دیا تھا۔ اس میں وہ بہت نحیف اور کمزور نظر آئی تھیں۔ اس نقاہت کے باوجود ان کی جرأت دیکھنے کے لائق تھی۔ اپنی علالت کے باوجود انہوں نے کہا تھا کہ "ہم حق پر ہیں اور پاکستان کے عوام کی حمایت مجھے حاصل ہے۔" بیگم صاحبہ کو یقین تھا کہ انجام کار فتح عوام کی ہوگی۔ اپنے علاج کیلئے جرمنی آمد کے بعد ایک تقریب میں انہوں نے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے ایک طرف بحالی جمہوریت کی جدوجہد جاری رکھنے کا کہا تو دوسری طرف جنرل ضیاء کی وجہ سے فوج کے متعلق سر اٹھانے والے منفی تاثر پر بات کی۔ انہوں نے کہا کہ جنرل ضیاء نے ملک کے متفقہ آئین کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ پاکستان کے عوام کے تمام بنیادی، انسانی اور شہری حقوق پامال کرتے ہوئے وہ ملک میں تمام حربے استعمال کر رہا ہے جن سے انسانیت شرمندہ ہے لیکن ایسے ظالمانہ حالات مخلص کارکنوں کے حوصلے، عزم اور ہمت کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ بیگم صاحبہ نے پاکستانی عوام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ "میری کراچی سے روانگی سے مغربی جرمنی پہنچنے تک عوام نے پاکستان پیپلز پارٹی کے شہید چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو اور میرے ساتھ احترام کے جن جذبات کا اظہار کیا ہے انہوں نے ظالم ڈکٹیٹر پر ثابت کر دیا ہے کہ مارشل لاء کے تحت عوام کو وقتی طور پر پابند سلاسل تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے دلوں سے عقیدت و احترام ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مارشل لاء کے مظالم پر بات کرتے ہوئے بیگم نصرت بھٹو نے کہا کہ "اس وقت پاکستان میں خیبر سے کیماڑی تک ہر جگہ کوڑوں کی بھرمار ہے۔ ملک کی جیلیں سیاسی کارکنوں سے بھری پڑی ہیں اور ایک آمر مطلق العنانی کر رہا ہے۔ اس غیر آئینی حکومت کا خاتمہ ہی ملک کی بقاء ہے۔" انہوں نے ساتھ ہی کہا کہ "ہماری بدنصیبی ہے کہ ضیاء نے قومی و سیاسی اداروں اور عدلیہ کو ختم کیا ہے۔ وہ تلا ہوا ہے کہ ہماری افواج کے ادارے کو بھی ختم کرے مگر ہم یہ نہیں چاہتے کیونکہ ہر ملک کو فوج کی ضرورت ہے۔ فوجی ہمارے بھائی اور بیٹے ہیں۔ انہیں ملک کے دفاع کی تربیت دیگر دفتروں میں بیٹھنے کا کہا جا رہا ہے۔ کسی کو پوسٹ آفس میں بٹھایا ہے تو کوئی اور کہیں۔" بھٹو صاحب کی شہادت کے بعد پارٹی کو متحد رکھنا

ایک بڑا چیلنج تھا۔ بیگم صاحبہ اس اہم معاملے سے غافل نہیں تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ آمر ضیاء کے ساتھی پارٹی میں دراڑ ڈالنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اپنی اس تقریر میں انہوں نے کہا کہ ''میں نہیں چاہتی کہ پارٹی میں گروہ بندی ہو۔ آپ لوگ یہاں جرمنی میں رہتے ہیں اور آپ نے دیکھا ہے کہ جمہوریت کیا ہوتی ہے۔ الیکشن کیسے ہوتا ہے۔ ووٹ آپ کا ہے یہ آپ کی امانت ہے۔ ایک مرتبہ غلط لوگوں کو دیدیا تو پھر آپ کچھ نہیں کرسکیں گے۔ گروپ بندی مجھے بالکل پسند نہیں۔ اگر پارٹی کا کام کرنا ہے تو گروپ بندی چھوڑنی ہوگی۔'' بیگم صاحبہ پارٹی ورکروں کی رائے اور ووٹ کا بہت احترام کرتی تھیں۔ ڈنمارک میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے ایک شخص کو مقامی سطح پر پارٹی کا صدر منتخب کیا۔ بعد میں ڈنمارک کے چند کارکنوں نے بیگم صاحبہ کو ایک خط دکھایا جس میں اس نے ضیاء کو مجلس شوریٰ کے متعلق مشورے دیئے تھے۔ بیگم صاحبہ نے اسے پہلی غلطی سمجھتے ہوئے معاف کردیا۔ تھوڑے دنوں بعد جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد کے ساتھ اس کی تصویر بھی سامنے آگئی۔ بیگم نصرت بھٹو کافی ناراض تھیں لیکن اس موقع پر بھی انہوں نے کہا کہ ''آپ لوگوں نے اسے صدر چنا ہے۔ اب آپ لوگ ہی بتائیں میں کیا کروں۔ جب تک میں مزید انکوائری نہ کرلوں کوئی فیصلہ نہیں کروں گی۔''

4 دسمبر کی صبح بیگم نصرت بھٹو نے نیویارک کے ممتاز جریدے ایگزیکٹو انٹیلی جنس ریویو کے مسٹر ڈین سنائیڈر اور جرمنی میں اس جریدے کی نمائندہ میری لیلیے دی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ مارشل لاء حکومت ملک میں خانہ جنگی کرانے کی کوشش کررہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں انتہا پسند گروہ پانچ سال سے اسلحہ جمع کررہے ہیں اور اپنے آدمیوں کو قتل غارت کے لئے تربیت دے رہے ہیں۔ بیگم صاحبہ نے انکشاف کیا کہ اسلحہ جمع کیا جارہا ہے اور ضیاء نے ملک کی اکثر عبادت گاہوں سے امام حضرات کو علیحدہ کرکے اپنے لوگ مقرر کردیئے ہیں۔ آج کے حالات بیگم نصرت بھٹو کی اس دوراندیشی کے گواہ ہیں کہ کس طرح عبادت گاہوں کے گرد دہشت گردوں نے محاصرہ کررکھا ہے۔ بیگم نصرت بھٹو زبردست قوت ارادی کی مالک تھیں اور اسی قوت

سے غیر جمہوری حکمران خائف تھے۔اس پرآشوب دور میں ایسے مراحل بھی آئے جب خطرات بڑھ گئے لیکن ان کی حوصلہ مندی نے قدم قدم پر مقابلہ کیا۔ بیگم صاحبہ شعوری ترقی کی بنیاد جمہوریت کو سمجھتی تھیں اور پاکستان کے عوام کو شعوری طور پر بیدار اور ترقی یافتہ دیکھنے کی آرزومند تھیں۔ بیگم نصرت بھٹو کو یہی خراج عقیدت ہے کہ انہوں نے آمریت کیخلاف مجاہدانہ مزاحمت سے پاکستان میں جمہوری جدوجہد کی نئی تاریخ رقم کی ہے۔

(روزنامہ جنگ،23مارچ2015ء)

عوام کی طاقت ہمارے ساتھ ہے

دسمبر 1982ء کی بات ہے جب پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرمین بیگم نصرت بھٹو مغربی جرمنی پہنچیں۔ انہی دنوں انہیں علاج کے لیے بیرون ملک جانے کی اجازت ملی تھی۔ جنرل ضیاء خوفزدہ تھا کہ بیگم صاحبہ اس کی جابرانہ حکومت کے خلاف نہتے عوام کو پھر سے صف آراء کر دیں گی۔ کراچی سے روانہ ہوتے ہی بیگم صاحبہ نے اپنے پیغام میں کہا کہ ''ہمیں سچائی اور صداقت کی راہ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ عوام کی طاقت ہمارے ساتھ ہے اور عوام کی طاقت دوسری تمام طاقتوں سے زیادہ ہوتی ہے۔'' ان کی کراچی سے روانگی کے ساتھ ہی جوش و جذبہ کا ایک بحر بیکراں ساتھ ہولیا۔ وہ میونخ پہنچیں تو کارکنوں کی ایک بڑی تعداد ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ بیگم صاحبہ سے مل کر لوگ شہید ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت پر تعزیت کرنا چاہتے تھے، ان سے وفاداری کا یقین دلانا چاہتے تھے اور ان کا ساتھ دینے کا عہد کرنا چاہتے تھے۔ میں اس وقت میونخ میں تھا۔ یہاں بیگم صاحبہ کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا۔ ہر شخص بیگم صاحبہ سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ سب سے مل رہی تھیں، دلاسہ دے رہی تھیں اور حوصلے بانٹ رہی تھیں۔ اس استقبالیہ سے ان کا خطاب یادگاری ہے۔ بیگم نصرت بھٹو نے کہا:

''اپنے وطن کے مایہ ناز فرزندوں اور بیٹوں کو سلام عرض کروں گی جنہوں نے میری کراچی سے روانگی کے وقت اور پھر میونخ پہنچنے کے بعد اب تک پاکستان پیپلز پارٹی کے شہید

چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو اور میرے ساتھ احترام کے جن جذبات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے پاکستان کے جابر اور ظالم ڈکٹیٹر ضیاء پر ثابت کر دیا ہے کہ مارشل لاء کے تحت وقتی طور پر انہیں پابند سلاسل تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے دلوں سے عقیدت و احترام کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔

میرے لیے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے لیے پاکستان کے جیالے عوام کے یہ جذبات اور احساسات باعثِ افتخار ہیں اور میرا یقین ہے کہ اندرونِ وطن اور بیرونِ وطن پاکستانیوں کے یہ جذبات خطرات میں گھرے ہوئے پاکستان کے لیے نیک فال ثابت ہوں گے۔

مجھے اچھی طرح علم ہے کہ آپ لوگوں کو میری علالت کی وجہ سے سخت پریشانی ہے لیکن اس سلسلے میں مجھے امید ہے کہ خدا تعالیٰ اپنا رحم کرے گا۔ تاہم حسب حالات مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ پاکستانی ڈاکٹروں کے مطابق میرے پھیپھڑے میں کینسر ثابت ہو گیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا رحم ہے کہ یہ بیماری اور جگہ نہیں پھیلی ہے۔ آپریشن کی ضرورت نہیں ہے اور دواؤں کے ساتھ انشاءاللہ میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔

ہمارے پاکستان کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ جنرل ضیاء کی صورت میں ایک ایسا ڈکٹیٹر حکمرانی کر رہا ہے جس نے ملک کے متفقہ آئین کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ پاکستان کے عوام کے تمام بنیادی، انسانی اور شہری حقوق کو پامال کرتے ہوئے ملک میں ظلم و تشدد کے وہ تمام حربے استعمال کر رہا ہے جن سے انسانیت شرمندہ ہے۔ پاکستان میں مارشل لاء کے نفاذ، سیاسی پارٹیوں اور ذرائع ابلاغ پر پابندیوں اور آئین کی پامالی کی وجہ سے ملک میں بگڑتے ہوئے سیاسی اور اقتصادی اور دفاعی حالات کا نقشہ آپ کے سامنے ہے۔

میں واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ ایسے ظالمانہ حالات مخلص کارکن کے حوصلے، عزم اور ہمت کی راہ میں کبھی بھی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ بلکہ اس قسم کی جابرانہ حرکتیں مخلص عوام کی ہمت کو مزید بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنی منزل کی راہ میں بچھی کانٹوں کی باڑھ پھاند کر مہاجرت اور ترکِ وطن کی مجبوریاں سہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان عزیز کی قربانی دیتے ہوئے بھی اپنی منزل کی جانب

رواں رہتے ہیں۔

پاکستان کے عوام سے میری اپیل ہے کہ وہ ملک میں جمہوریت، انسانی حقوق کی بحالی اور مارشل لاء کے خاتمہ اور آئین کی بحالی کے لیے اب مزید جدوجہد کے لیے آگے بڑھیں اور مارشل لاء کی پابندیوں کی پرواہ کیے بغیر سراپا حرکت وعمل بن جائیں۔

پاکستان کے موجودہ حکمرانوں نے ملک میں روایتی ظالمانہ ہتھکنڈوں سے انسانیت سوزی کی وہ مثالیں قائم کی ہیں جن کی پاکستان کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور دیگر جمہوریت پسند پاکستانیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ملک میں مارشل لاء کے بظاہر مضبوط لیکن اندر سے کھوکھلے ستونوں کو آخری ٹھوکری لگا کر زمین بوس کر دیں۔ اس وقت پاکستان میں خیبر سے کیاڑی تک ہر جگہ کوڑوں کی بھرمار ہے۔ ملک کی جیلیں سیاسی کارکنوں سے بھری پڑی ہیں اور ایک جنرل مطلق العنانی کر رہا ہے۔ اس غیر آئینی فوجی حکومت کا خاتمہ ہی ملک کی بقا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ پاکستان کے عوام اندرون اور بیرونِ ملک حکومت کے خلاف صف آرا ہو کر اپنی جدوجہد کو آگے بڑھائیں۔

ہمارے پارٹی کے لوگوں میں یہ سوال تھے کہ جن جماعتوں اور لوگوں نے پی این اے میں شامل ہو کر ہمارے خلاف کام کیا، جنہوں نے پی این اے بنائی اور مارشل لاء کو دعوت دی، جب ہمارے لیڈروں نے ان رہنماؤں کا مجھ سے ملنے کا ذکر کیا تو مجھے بہت غصہ آیا۔ کیونکہ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے ٹیلی ویژن پر جھوٹ کی، ظلم کی داستانیں سنائیں۔

میں نے چھ ماہ تک اس پر غور کیا اور پھر میں نے ملک، پارٹی اور جمہوریت کی خاطر یہ فیصلہ کیا کہ میں ان کے ساتھ مل کر تحریک چلاؤں کیونکہ اگر آج وہ ضیاء کے خلاف ہیں تو پھر ایک پلیٹ فارم پر لا کر جمع کرنا چاہیے۔ میں نے شیخ رشید سینئر وائس چیئرمین پی پی پی کے احترام اور اپنی سوچ کے بعد اسے بہترین رائے سمجھا کیونکہ ان پارٹیوں کی حوصلہ افزائی نہ کی اور اپنے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر نہ لائے تو پھر شاید وہ ضیاء کی چال میں دوبارہ آجائیں۔ انہیں ضیاء پرمٹ، وزارت

اور مجلسِ شوریٰ کی رشوت کا لالچ دیتا تھا۔ ہم نے ایم آر ڈی کے ساتھ انتخابی اتحاد نہیں کیا ہے، دو نکات پر تعاون کیا ہے۔ اور انتخابی اتحاد کی بات میں نے قبول نہیں کی ہے۔ ہم ملک سے مارشل لاء کا خاتمہ اور 73ء کے آئین کے تحت انتخابات چاہتے ہیں اور ان دو نکات پر اتفاق ہے اور جب انتخابات ہوں گے تو ہم اپنے منشور پر الیکشن لڑیں گے۔ اور ایم آر ڈی ختم کر کے اپنا اپنا منشور پیش کر کے انتخابات میں حصہ لیں گے۔ ان کے سیٹیں مانگنے پر میں نے بتایا کہ جن لوگوں نے کوڑے کھائے اور جیلیں کاٹی ہیں، ان کے لیے سیٹیں ہیں۔ ہم سیٹیں نہیں دے سکتے۔

ایک سال تنظیم کو لگا۔ ہم نے خواجہ خیر الدین کو سیکرٹری جنرل چنا اور ہر ماہ عددی لحاظ سے چیئرمین بنتا ہے۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ 27 نومبر کو لیڈر صاحبان گرفتاریاں پیش کریں گے۔ پہلے کارکن جیل میں جاتے تھے اور اس مرتبہ لیڈر صاحبان پہل کریں گے۔ پروگرام کے مطابق تیس ارکان کتبے لے کر الیکشن کرانے اور مارشل لاء کے خاتمے کے مطالبات کریں گے اور مظاہرہ کریں گے اور اپنی گرفتاری پیش کریں گے۔ لیکن 26 نومبر کی رات کو سب کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔

آپ یورپ میں رہتے ہیں۔ اب تک آپ کا کوئی لیڈر نہیں آیا۔ لیکن آپ نے بہت اچھی طرح پارٹی چلائی ہے۔ بہت سے مظاہرے کیے ہیں۔ بھٹو صاحب کے قتل کی برسی مناتے ہیں اور میرے لیے علاج کی اجازت کے لیے بھی آپ نے بہت کام کیا ہے۔ اگر آپ لوگ یہاں سے آواز بلند نہ کرتے تو شاید ڈاکٹر لوگ بھی خاموش ہو کر بیٹھ جاتے اور ضیاء کی جی حضوری کرتے۔ اس کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ۔

میں نہیں چاہتی کہ پارٹی میں گروپ بندی ہو۔ آپ لوگ یہاں رہتے ہیں اور دیکھا ہے کہ جمہوریت کیا ہوتی ہے۔ الیکشن کیسے ہوتا ہے۔ ہر امیدوار کھڑا ہوتا ہے لیکن آپ سوچ سمجھ کر ووٹ دیں۔ اس لیے کہ اگر کوئی لیڈر کسی کے گھر جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے ہی

ووٹ دینا ہے۔ پھر الیکشن کا مطلب ہی غلط ہوا۔ پاس کھڑے ہوئے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں ان کے گھر جاؤں اور یہ الیکشن میں حصہ لے رہے ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ یہ شخص ٹھیک نہیں۔ یہ ضیاء کے پاس بھی جاتا ہے۔ جماعت اسلامی کے پاس بھی جاتا ہے اور پیپلز پارٹی کا صدر بھی بننا چاہتا ہے تو آپ خود سوچ لیں ان کے گھر جانے کا کوئی اور مطلب ہوسکتا ہے۔ آپ اپنا ووٹ صحیح امیدوار کو دیں۔

اگر آپ کو ووٹ دینا ہے، یہ ووٹ آپ کا ہے، یہ ووٹ آپ کی امانت ہے۔ ایک مرتبہ غلط ووٹ دیں گے تو دو سال تک آپ کچھ نہیں کر سکیں گے وہ آپ کے سر پر بیٹھا ہوگا۔ آپ بہت سوچ سمجھ کر اپنا قیمتی ووٹ دیں۔''

یورپ میں لیڈر کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بیگم صاحبہ نے کہا کہ ووٹ آپ کا اپنا ہے اور کوئی آپ سے زبردستی ووٹ نہیں چھین سکتا۔ آپ اپنی مرضی سے ووٹ جسے چاہے دیں۔ ملک سے باہر آکر میرا یہ ارادہ نہیں تھا کہ میں کوئی سیاسی بات کروں یا سیاست میں مداخلت کروں۔ کیوں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مجھے بہت بُری بیماری ہے۔

اب ڈاکٹر غلام حسین آئے ہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین سیکرٹری جنرل چنے تھے۔ پھر انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ ڈاکٹر غلام حسین سے جیل میں ہونے کی وجہ سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ پھر وہ ملک سے باہر آئے۔

پاکستان میں سب ٹھیک چل رہا ہے اور پارٹی میں جو گروپ بندی تھی وہ اب ختم ہو چکی ہے۔ گروپ بندی مجھے بالکل پسند نہیں ہے اگر پارٹی کا کام کرنا ہے تو گروپ بندی چھوڑنی چاہیے۔

ڈاکٹر غلام حسین مجھ سے ملے اور تین چار مرتبہ ملے۔ انہوں نے بتایا کہ گروپ بندی ختم کرنے کے لیے الیکشن کروانے کا پروگرام بنایا ہے۔ الیکشن میں ایسا کام کریں کہ کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ میں نے پارٹی میں عورتوں کے الیکشن کروائے تھے تو کسی نے نہیں کہا تھا کہ

الیکشن (منصفانہ) فیئر نہیں تھے۔ یہاں بھی کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں ڈنمارک میں الیکشن اس خوش اسلوبی سے ہوا ہے کہ الیکشن ہارنے والے نے جیتنے والے کو ہار پہنائے تھے۔

س: مغربی جرمنی میں لوگوں کا مستقبل محفوظ نہیں ہے۔ اس لیے اگر یہاں الیکشن کرائے جاتے ہیں اور ہمارا تجزیہ یہ ہے کہ 83ء کی پہلی سہ ماہی میں اکثریت واپس جا چکی ہو گی۔ یہاں کی عدالتوں کا رویہ ٹھیک نہیں ہے اس لیے اگر ہم انتخابات کراتے ہیں اور کسی کو صدر چنتے ہیں اور اسے ملک چھوڑنے کا حکم ملتا ہے تو اس کا نتیجہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ یورپ کے دوسرے ملکوں میں پاکستانیوں کا مستقبل محفوظ ہے اور رہائش مستقل ہے اس لیے وہاں الیکشن کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن مغربی جرمنی کے حالات مختلف ہیں اس لیے ہم چاہتے ہیں جو تنظیم اس وقت جس طرح چل رہی ہے وہ بدستور اسی طرح کام کرے۔ گروپ بندی کو ختم کیا جائے اور لیڈر حضرات بیٹھ کر اس مسئلے کو طے کریں۔

بیگم صاحبہ: میں سمجھ گئی ہوں۔ آپ چاہتے ہیں کہ یہاں کچھ ماہ کے لیے الیکشن نہ ہوں تاکہ جو لوگ سیاسی پناہ لینے کے منتظر ہوں ان کا فیصلہ ہو سکے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے کہوں گی کہ وہ فروری مارچ تک الیکشن نہ کرائیں۔

س: پارٹی یونٹوں میں اشتراک ہو اور متحدہ عمل ہو۔ پارٹی کا کوئی ترجمان جریدہ ہوتا کہ پارٹی لائن کو پیش کیا جائے۔

بیگم صاحبہ: آپ اسے منظم کریں۔ جب تک آپ خود کوشش نہیں کریں گے کوئی کچھ نہیں کرے گا۔

میونخ میں بیگم صاحبہ کی تقریر بین الاقوامی میڈیا کی توجہ کا مرکز رہی۔ یہاں جام صادق علی، ڈاکٹر ظفر نیازی، ظفر علی چوہدری، جارج فلیکس، سلامت عطا، راجہ زمان، وحید علوی، جنرل امتیاز علی، سلیم شیخ، وسیم جارج، ارشاد چوہدری، نثار چودھری، راجہ اکرم اور ظہور قاسمی نے بیگم صاحبہ

سے ملاقاتیں کیں۔ بیگم صاحبہ سے عقیدت کارکنوں کے چہروں پر لکھی ہوئی تھی۔ وہ ان کی صحت کے بارے میں فکر مند تھے اسی لیے اجتماعی دعا میں اللہ سے فریاد کر رہے تھے کہ:

''اے اللہ تو جانتا ہے قوم کی اس ماں نے اپنا شوہر ہماری خاطر قربان کر دیا ہے اور تو جانتا ہے اس نے ہماری خاطر اپنے بچوں کی جدائی برداشت کی۔
اے اللہ پاک اس ماں کو صحت کاملہ عطا فرما۔''

(مساوات ویکلی، لندن، 5 جنوری 1983ء)

جرأت و عظمت کو سلام

خاتونِ ملت بیگم نصرت بھٹو سے پانچ سال بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ یہ 3 دسمبر 1982ء کی بات ہے۔ جمعہ کا دن تھا اور ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ بیگم صاحبہ میونخ کے فور سیزن ہوٹل کے کمرہ نمبر 414 میں قیام پذیر تھیں۔

صوفے پر تشریف فرما بیگم صاحبہ میرے سلام پیش کرنے پر کہتی ہیں کہ پانچ سال بعد مل رہے ہیں۔ ان 5 سالوں میں ایک ''قیامت'' گزری ہے۔ قائدعوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت اور پانچ برس میں ظلم کی جو آندھی چلی ہے اسے بیگم صاحبہ کے چہرے پر پڑھا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی جرأت و عظمت کو یہ خراج پیش کرنا پڑتا ہے کہ پانچ برس کے ظلم و ستم کو ان کے عزم و استقلال سے مات کھانا پڑی ہے۔

پانچ برس پہلے میں نے بیگم صاحبہ کو ہشاش بشاش، صحت مند، متحرک اور فعال شخصیت کے روپ میں دیکھا ہے۔ بیگم صاحبہ نے ایوانِ وزیر اعظم کے دروازے عام غریب لوگوں کے لیے کھول دیئے تھے۔ وہ ان کے مسائل حل کرنے میں مدد دیتی تھیں لیکن آج اس خاتونِ اول اور پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بیگم نصرت بھٹو پر پہلی نظر پڑتے ہی جیسے میرے قدموں سے زمین سرک گئی۔ مجھے ان کی ہمشیرہ مادام بہجت حریری کا یہ جملہ خوفزدہ کرنے لگا جو انہوں نے میونخ روانگی کی شام لندن میں ملاقات کے دوران کہا تھا۔

''نجانے میں اپنی پیاری ہمشیرہ کا کس طرح سامنا کرسکوں گی۔''

بیگم صاحبہ کی بیماری سے ہر کوئی پریشان تھا۔ پاکستان میں بھی لاکھوں لوگ اشکبار تھے۔ دنیا بھر میں بھی بیگم صاحبہ کی صحت اور بیماری پریشان کن موضوع بنی ہوئی تھی اور آج علیل بیگم صاحبہ کو دیکھ کر دکھ اور غم نے میرے ہوش اڑا دیئے تھے۔ اس صدمہ سے یہ رنج و غم بھی ذہن سے محو ہو گیا کہ ہم شب و روز کی جدوجہد کے باوجود اپنے محبوب لیڈر، ان کے عظیم شوہر کو نہیں بچا سکے تھے۔ لیکن بیگم صاحبہ اپنے عظیم شوہر کے ناقابل برداشت صدمہ کو سینے میں چھپائے علالت کے باوجود جرأت کا پیکر نظر آ رہی ہیں۔ ان کی شخصیت میں وہی وقار، عظمت اور استقلال ہے۔

ان پریشان کن حالات میں گرم آنسو میری آنکھوں میں برف کی مانند جم گئے ہیں اور میں ثابت قدمی سے ضبط کی آزمائش میں پورا اترنے کے لیے کوشاں ہوں۔ میری تمام تر توجہ ان کی بیماری پر مرکوز ہے اور میں سب کچھ بھول کر صرف ان کی صحت کے بارے میں پوچھتا ہوں۔

بیگم صاحبہ بتاتی ہیں کہ ڈکٹیٹر ضیاء گزشتہ تین ماہ سے بیماری کی تشخیص کے باوجود اجازت دینے میں ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ ایکس رے رپورٹ کے باوجود اس کی کوشش یہی تھی کہ اس مہلک بیماری سے میں زندہ نہ رہوں۔ میں نے اپنے ونڈرفل شوہر کے قتل کا صدمہ برداشت کیا لیکن بیماری سے میں اتنا اکتا گئی تھی کہ میں نے مرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ مجھے ضیاء جیسے شخص سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ بروقت علاج کے لیے مجھے ملک سے باہر جانے کی اجازت دے گا۔

لیکن بیگم صاحبہ کے حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے اس صورت حال سے سمجھوتہ کرنے کے باوجود اپنے اعصاب کو کمزور ہونے نہیں دیا ہے۔ وہ بڑی خود اعتمادی سے بتاتی ہیں کہ گذشتہ بارہ دنوں میں میری صحت بہت بہتر ہے۔ پاکستان کی نسبت میری بہت اچھی حالت ہے۔ کھانسی اگرچہ کم نہیں ہوئی لیکن خون آنا بند ہو گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے پھیپھڑے کے سرطان کی تصدیق کر دی ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ مرض پھیلا نہیں ہے اور آپریشن کے بغیر ہی دوا

اورانجکشن سے علاج ہو جائے گا۔

ان چند لمحوں کی یہ سب سے اچھی خبر تھی۔ اس دوران انہیں کھانسی کی تکلیف ہوتی ہے۔ کھانسی کی شدت دیکھ کر بیگم صاحبہ کی علالت سے پھر تشویش دامن گیر ہو جاتی ہے۔ ان کی چھوٹی ہمشیرہ مادام بہجت بھی دل گرفتہ نظر آتی ہیں۔ وہ خدا کی شکرگزار ہیں کہ عین وقت پر بیگم صاحبہ ملک سے باہر آ گئی ہیں۔ اوراب بہتر اور ضروری علاج اور آرام سے ان کی بہن کی زندگی کو خطرہ نہیں رہا۔

مادام بہجت حریری نے چند ہی دن قبل لندن میں ایک پریس کانفرنس میں بڑے موثر انداز میں بیگم صاحبہ کی صحت پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے عالمی پریس کے ذریعے دنیا کو آگاہ کیا تھا۔ انہوں نے جس انداز میں بہن کے حقیقی جذبات کی ترجمانی کی تھی اس نے کانفرنس میں موجود پریس کے ارکان کے دل ہلا دیئے تھے۔

چند دن قبل بی بی سی ٹیلی ویژن پر بیگم صاحبہ کا انٹرویو نشر ہوا تھا۔ یہ انٹرویو انہوں نے بستر پر دراز ہو کر دیا تھا۔ اس میں وہ بہت نحیف اور کمزور تھیں۔ اس نقاہت کے باوجود بیگم صاحبہ کی جرأت ہر زبان پر تھی۔ بیگم صاحبہ نے اپنی علالت کے باوجود بڑے یقین واعتماد کے ساتھ کہا تھا کہ ہم حق پر ہیں اور پاکستان کے عوام کی حمایت مجھے حاصل ہے۔ بیگم صاحبہ اس یقین اور اعتماد کے سہارے زندہ ہیں کہ انجام کار فتح ان کی ہو گی اور اسی یقین کے ساتھ وہ اپنی بیماری کو بھی شکست دیں گی۔

پاکستان سے باہر آئے ہوئے انہیں دو ہفتے بھی نہیں ہوئے اور ان چند ایام نے ہی ان کی صحت پر خوشگوار اثر مرتب کیا ہے۔ یہ امر قدرتاً ان کے لیے خوشی کا باعث ہے۔ پانچ برس کی مسلسل صعوبتوں اور اذیتوں کے بعد آزاد فضا میں سانس لینے سے ان کی ذہنی توانائی قابلِ رشک ہے۔ بیگم صاحبہ یہ آزادی میسر آنے سے خوش اور مطمئن ہیں اور یہ بات ان کے ذہنی سکون کے لیے بہت بڑی قوت ہے کہ دنیا بھر میں پاکستان کے علاوہ انسانیت وانصاف سے ہمدردی

اور دلچسپی رکھنے والے اداروں نے انہیں بیرونِ ملک جانے کی اجازت دلانے پر فوجی ڈکٹیٹر ضیاء پر اخلاقی دباؤ ڈالا ہے۔ ورنہ اس کی خواہش و کوشش یہی تھی کہ اس موذی مرض سے خدانخواستہ وہ جاں بحق ہو جائیں۔

بیگم صاحبہ بتاتی ہیں کہ پاکستانی ڈاکٹروں نے اپنے پیشہ کے وقار کا سر اونچا رکھا ہے اور فوجی حکومت کے دباؤ میں آنے سے انکار کر کے ان کے مرض کے علاج کے لیے بیرونِ ملک جانے کے لیے متفقہ فیصلہ دیا۔ بیگم صاحبہ نے بتایا کہ جس دن ضیاء نے کوالالمپور میں یہ بیان دیا تھا کہ بیگم بھٹو کی میڈیکل رپورٹ سے ان کی بیماری کی تصدیق نہیں ہوتی اس دن پاکستانی اخبارات میں میڈیکل بورڈ کی یہ رپورٹ شائع ہوئی تھی کہ ان کے پھیپھڑے میں کینسر ہے اور انہیں علاج کے لیے بیرون ملک جانے کی اجازت دی جائے۔

میڈیکل بورڈ کے سربراہ میجر جنرل اقبال چودھری کی بعد میں جبری ریٹائرمنٹ اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ جنرل ضیاء نے بیگم صاحبہ کو علاج کے لیے بیرون ملک نہ جانے کی ہدایات دی تھیں اور اس کی خلاف ورزی کی بنا پر اقبال چودھری کو انتقام کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

بیگم صاحبہ نے بتایا کہ جرمنی روانگی سے قبل انہوں نے وزیراعظم بھارت مسز اندرا گاندھی کو شکریہ کا خط لکھا ہے کیونکہ مسز گاندھی کی واحد حکومت ہے جس نے پبلک طور پر بیگم صاحبہ کے خطرناک مرض کے پیش نظر انسانی بنیادوں پر نہ صرف پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر سے اپیل کی بلکہ امریکہ کے صدر ریگن کے علاوہ دوسرے سربراہانِ مملکت کے نام بھی خطوط لکھے۔

بیگم صاحبہ نے یہ بھی انکشاف کیا کہ کئی دوسرے ممالک کی حکومتوں نے بھی ان کی زندگی بچانے کے لیے پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر کو لکھا تھا اور پس پردہ ڈپلومیسی سے میرے انسانی مسئلہ کو اٹھایا تھا۔

بیگم نصرت بھٹو نے بتایا کہ ضیاء انہیں اور مس بےنظیر بھٹو کو سیاسی منظر سے ہٹانے کے لیے ختم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب نہیں ہوا۔

مس بے نظیر بھٹو کا ذکر کرتے ہوئے بیگم صاحبہ نے کہا کہ وہ بڑی ذہین، بہادر اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والی لڑکی ہے اور پاکستان پیپلز پارٹی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ بیگم صاحبہ نے بتایا کہ بھٹو شہید نے اپنی بیٹی کو بطورِ خاص سیاسی تربیت دی ہے۔ جب وہ پنڈی جیل میں تھے تو ہفتہ میں صرف ایک بار ایک گھنٹہ ملاقات کی اجازت ہوتی تھی۔ اور اس ایک گھنٹے میں شہید بھٹو سیاسی لیکچر دیتے تھے۔ آخری ایام میں یہ سیاسی تربیت مس بے نظیر بھٹو کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ ان میں اپنے والد جیسے سیاسی اوصاف، جرأت اور بہادری ہے۔

بیگم صاحبہ نے بے نظیر بھٹو کی بہادری کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ جن دنوں وہ سکھر جیل کی سی کلاس میں تھیں تو درجہ حرارت 115 تھا۔ کسی ملاقاتی کو بے نظیر بھٹو کے لیے ٹھنڈا پانی لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ نل کا گرم پانی پینے کے قابل نہ تھا۔ لیکن بے نظیر اپنے دوپٹہ کو گرم پانی میں بھگوتی تھیں اور پھر اسے نچوڑ کر پانی پیتی تھیں۔ اپنے اس عزم سے بے نظیر بھٹو نے فوجی حکمرانوں اور جیل کے محافظوں پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان کی ہمت کو توڑا نہیں جا سکتا۔ بے نظیر ہر آزمائش پر پوری اتری ہیں اور وہ پارٹی کو موثر اور فعال قیادت مہیا کریں گی۔ بیگم صاحبہ نے کہا کہ میری عدم موجودگی میں بے نظیر بھٹو پارٹی کی قائم مقام سربراہ ہیں اور پارٹی کی قوت میں اضافہ کا موجب ثابت ہوں گی۔ بیگم صاحبہ کی اپنی عظمت یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں ہمیشہ انکساری سے کام لیتی ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ بیگم صاحبہ کی قائدانہ صلاحیت اور پارٹی کو منظّم کرنے کا خداداد جوہر ان کی غیر معمولی قوت ہے۔ گذشتہ پانچ برس کے مارشل لاء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی قوت میں اضافہ بیگم صاحبہ کی ولولہ انگیز قیادت کا رہین منت ہے۔ اسی لیے ضیاء اور اس کے ساتھیوں کو پاکستان میں انتخابات کرانے کی جرأت نہیں ہو رہی ہے۔ بیگم صاحبہ نے پی پی پی کے شعبہ خواتین کو جمہوری بنیادی پر منظّم کرنے کا جو کارنامہ سرانجام دیا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج پاکستان کی عورتوں میں سیاسی شعور فروغ پذیر ہے اور یہ عورتیں ہی تھیں جنہوں نے بیگم صاحبہ

کو بیرون ملک جانے کی اجازت دلانے کے لیے مارشل لاء قواعد کی کھلے عام خلاف ورزی کر کے کراچی میں مظاہرہ کیا اور پھر جس دن بیگم صاحبہ میونخ کے لیے روانہ ہوئیں مردوں کے شانہ بشانہ رات کے پچھلے پہر انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے 70 کلفٹن سے لے کر کراچی ایئرپورٹ تک موجود تھیں۔

بیگم صاحبہ کے اس سیاسی کردار کی بدولت ان کی قائدانہ صلاحیتوں سے انکار ممکن نہیں ہے اس لیے میں نے عام پاکستانی کی سوچ اور رائے کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرض ادا کرنے کی کوشش کی کہ ''آپ ہی ملک کو متحد اور ایک رکھ سکتی ہیں۔ اس لیے آپ کی زندگی بہت ضروری ہے۔''

بیگم صاحبہ نے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں یہ کہہ کر ان خطرات کی تصدیق کر دی کہ جنرل ضیاء دانستہ طور پر اپنی پالیسی سے پاکستان کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہے اور ہمیں پاکستان کو بچانے کے لیے اس کا مقابلہ کرنا ہے۔

اس وقت ساڑھے بارہ بجے کا عمل ہے۔ آج مس بے نظیر بھٹو کی رہائی کے لیے کلب آف لائف نے یورپ کے مختلف شہروں میں مظاہروں کا اہتمام کیا تھا۔ میونخ کے مظاہرہ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے بھی حصہ لیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر غلام حسین نے ہالینڈ میں مظاہرہ کی قیادت کی۔ وہ گذشتہ رات میونخ سے ایمسٹرڈم چلے گئے تھے۔ میونخ میں مظاہرہ کرنے والے پارٹی کے کارکن بیگم صاحبہ سے ملنے کے لیے ہوٹل آتے ہیں ان میں پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما کپتان حکمداد بھی ہیں۔ بیگم صاحبہ سے یہ ان کی دوسری ملاقات ہے۔ کپتان حکمداد کی پارٹی کے لیے 69ء سے اب تک خدمات کے بارے میں بیگم صاحبہ کو بتایا گیا تو وہ بے حد خوشی ہوئیں۔ اور پارٹی مسائل پر ان سے بات چیت کی۔ پھر بعد میں مرزا یعقوب صاحب کو بھی بیگم صاحبہ نے بلوا بھیجا۔ بیگم صاحبہ ان سے بڑی شفقت کے ساتھ پیش آئیں۔ بیگم صاحبہ نے ازراہ مذاق پوچھا کہ آپ لوگ کیمرہ لے کر نہیں آئے؟ ہر کارکن بیگم

صاحبہ کے ساتھ تصویر کھنچوانے کا قدرتی شوق رکھتا ہے۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ کارکن کے لیے سب سے بڑی بات ان کے قائد کی طرف سے شاباش ہے تو بیگم صاحبہ نے خوش ہو کر انہیں اپنے آٹوگراف دیئے۔

ان کے بعد ڈنمارک، ایمسٹرڈم اور میونخ برانچوں کے پارٹی کے وفود ملے اور بیگم صاحبہ کو گلدستے پیش کیے۔ اس ڈیڑھ گھنٹے میں کیمرے چلتے رہے اور تصویریں اترتی رہیں۔ پارٹی کے یہ کارکن اپنے اپنے مسائل پیش کرتے رہے اور بیگم صاحبہ لیڈر کی حیثیت سے سنتی رہیں۔ یہ مسائل ایک ہی نوعیت کے تھے۔ اور بیگم صاحبہ نے ان کو سمجھایا کہ پارٹی میں اتحاد اور اتفاق از حد ضروری ہے۔ میں یہاں سیاست کرنے نہیں آئی بلکہ علاج کے لیے آئی ہوں۔ یہ آپ لوگوں کا فرض ہے کہ آپ اپنے ووٹ کا صحیح استعمال کریں اور کسی ایسے شخص کو پارٹی کا عہدیدار نہ چنیں جو موقع پرست ہو یا جس کے کردار کے بارے میں بعد میں شکایت پیدا ہو۔

بیگم صاحبہ نے انہیں بتایا کہ میں ڈکٹیٹر یا آمر نہیں ہوں کہ کسی کو پارٹی سے نکال دوں۔ انہوں نے ان وفود کو بتایا کہ ڈاکٹر غلام حسین صحیح آدمی ہیں اور پارٹی کے سیکرٹری جنرل ہیں۔ مسٹر مصطفیٰ کھر پارٹی کی مجلس انتظامیہ کے ایک رکن ہیں۔

ڈنمارک کے یوسف خلجی کا ایک خط جو موصوف نے مجلس شوریٰ کے سلسلے میں ضیاء کے نام لکھا تھا بیگم صاحبہ اس سے ناخوش تھیں۔ مسٹر یوسف خلجی کے اس خط کے علاوہ جماعت اسلامی کے غلام اعظم کے ساتھ ان کی تصویر بیگم صاحبہ کے لیے مزید شکایت کا موجب بنی۔ یوسف خلجی کو پی پی پی کے ایک پرانے اور ذمہ دار عہدیدار کی حیثیت سے مجلس شوریٰ کے سلسلے میں خط لکھنا نہیں چاہیے تھا۔ مسٹر خلجی کو جناب میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو کا بھرپور اعتماد حاصل رہا ہے۔ جن دنوں وہ لندن میں تھے تو میر مرتضیٰ بھٹو صاحب کے ہر حکم اور ہدایت پر عمل کر کے خلجی صاحب نے ان کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ وہ ان کی تعریف کرتے تھے لیکن اپنی اس حماقت کی وجہ سے ان کے حریف گروپ کو بیگم صاحبہ سے شکایت کا موقع ہاتھ آ گیا تھا لیکن انہوں نے وفد سے اور پھر اگلے

دن عام اجلاس میں بھی یہی کہا کہ وہ پوری تحقیقات کے بعد مسٹر یوسف خلجی کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گی۔

ڈنمارک کے وفد کے ایک رکن کی آنکھوں میں عقیدت چھلکنے لگی تو بیگم صاحبہ نے اسے رومال پیش کیا۔ بیگم صاحبہ لیڈر کی حیثیت سے پارٹی کارکنوں کے مسائل سن رہی تھیں۔ انہیں اپنی صحت سے زیادہ یہ کارکن عزیز تھے۔ حالانکہ وفد کم وبیش وہی باتیں دہرا رہے تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر پارٹی کے یہ کارکن جو دور دراز مقامات سے آئے تھے۔ گلدستوں کی خوب صورتی کی طرح بیگم صاحبہ کی عیادت سے خوشی حاصل کرتے تو یہ کتنا اچھا ہوتا۔ بیگم صاحبہ کی خوشی دو چند ہو جاتی۔ اور ان کی صحت پر بھی اچھا اثر پڑتا کیونکہ مادام بہجت حریری اپنی ہمشیرہ بیگم نصرت بھٹو کی ہر لمحہ دیکھ بھال کر رہی ہیں۔ اب بیگم صاحبہ اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ جنوبی فرانس میں چند ہفتے آرام کریں گی۔ ان اڑھائی گھنٹوں میں ان پر چار مرتبہ شدید کھانسی کا دورہ پڑا تھا۔ اور انہیں دو بجے ملاقاتوں کا سلسلہ بند کر کے آرام کرنا پڑا۔

4 دسمبر ہفتہ کی صبح 11 بجے پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بیگم نصرت بھٹو کا نیویارک کے ممتاز جریدے ایگزیکٹو انٹیلی جنس ریویو کے مسٹر ڈین سنائیڈر اور جرمنی میں نمائندہ میری لیلے دی کے ساتھ 11 بجے کا وقت مقرر تھا۔ ہم تینوں ہوٹل میں بیٹھے ہی تھے کہ بیگم صاحبہ اور مادام حریری سیر کے بعد واپس آئیں میں نے بیگم صاحبہ کے ساتھ میری اور مسٹر سنائیڈر کا تعارف کرایا اور انہوں نے 5 منٹ بعد کمرہ میں آنے کے لیے کہا۔ اسی اثناء میں جام صادق علی صاحب بیگم صاحبہ کے ڈاکٹر حئی سعید سے ملاقات ہوگئی۔ ہم سب ایک ساتھ کمرے میں گئے تو بیگم صاحبہ انتظار کر رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے مسٹر سنائیڈر اور میری لیلے دی کا شکریہ ادا کیا۔ ان کی آرگنائزیشن نے بیگم صاحبہ کی رہائی اور بیرون ملک آنے کے لیے کافی تعاون کیا تھا۔

بیگم صاحبہ نے انہیں انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ مارشل لاء حکومت ملاؤں کے ذریعہ ملک میں خانہ جنگی کرانے کی کوشش کر رہی ہے۔ بیگم صاحبہ نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ اگر جلد

انتخابات کرا کے ملک سے مارشل لاء ختم نہ کیا گیا تو پاکستان میں ایران جیسے حالات پیدا ہو جائیں گے۔ کیونکہ پاکستان میں انتہا پرست جماعت اسلامی گذشتہ پانچ سال سے اسلحہ اور ہتھیار جمع کر رہی ہے اور وہ قتل و غارت کے لیے اپنے آدمیوں کو ٹریننگ دے رہی ہے۔ بیگم صاحبہ نے انکشاف کیا کہ مسجدوں میں اسلحہ جمع کیا جا رہا ہے اور ضیاء نے ملک کی اکثر مساجد سے امام مسجدوں کو علیحدہ کر کے جماعت اسلامی کے ارکان کو ان مساجد میں مقرر کر دیا ہے۔ اور ایسے امام مسجد جو مارشل لاء کے مخالف تھے ان سب کو جماعت اسلامی کے مشورہ سے علیحدہ کیا جا چکا ہے۔ اور یہ سب کچھ ضیاء کے علم میں ہے۔ بیگم صاحبہ نے ایک سوال کے جواب میں اس کی تصدیق کی کہ اسلام آباد میں امریکی سفارت خانہ پر بھی جماعت اسلامی کے کارکنوں نے حملہ کیا تھا۔ اور یہ حملہ خود فوجی حکومت نے کرایا تھا۔ بیگم صاحبہ نے مارشل لاء کی بربریت اور عوام میں خوف و ہراس پھیلانے کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مارشل لاء کے شروع میں ستمبر 77ء میں ملتان کی کالونی ٹیکسٹائل ملز میں 250 مزدوروں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ حکومت نے صرف 70 مزدوروں کے ہلاک ہونے کی خبر دی تھی۔ لیکن پانچ سال کے خوف و ہراس اور کوڑوں کی بھرمار کے بعد اب لوگوں کے دلوں سے مارشل لاء کی ہیبت کا خوف جاتا رہا ہے اور لوگوں نے اب سڑکوں پر آنا شروع کر دیا ہے۔

میونخ پیپلز پارٹی کا جیسے ہیڈ کوارٹر بن گیا ہو۔ بیگم صاحبہ نے اپنی علالت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مقامی پارٹی کی شاخ کی ایک استقبالیہ دعوت میں شرکت منظور کر لی۔ تاکہ تمام لوگوں سے ملاقات ہو جائے اور وہ بیگم صاحبہ کی باتیں سن لیں۔ اسی لیے انہوں نے جلسے کے ہال میں یہ عام اجازت دی کہ ہر کوئی ان سے سوال پوچھ سکتا ہے۔ لیکن جرمنی کے مختلف شہروں سے آنے والے وفود کو موقع نہ مل سکا۔ اتوار کو بیگم صاحبہ کا طبی معائنہ تھا۔ اس سے انہیں نقاہت بھی ہوئی۔ لیکن اتوار کی شام کو وفود سے پھر ملاقاتیں کیں اور برلن کے ایک کارکن سے جنہیں ہفتہ کی شام ملاقات نہ ہونے کا افسوس تھا۔ اتوار کو ملاقات سے ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اتوار دیر تک

ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور سوموار کی صبح بھی بیگم صاحبہ نے روانگی سے قبل ملاقاتیں کیں۔

بیگم صاحبہ کا یہ انتھک انداز حوصلہ افزا بھی تھا وہ اسی طرح جوشِ عمل سے مصروف تھیں جس طرح ایک وقت انہوں نے جون کی گرمی میں غریب لوگوں میں صبح سے شام تک گندم تقسیم کر کے ہزاروں ایسی عورتوں کو گلے لگایا تھا جن کے غلیظ کپڑے اور پسینہ میں شرابور جسم دیکھ کر بیگمات ناک پر رومال رکھ لیتی ہیں۔ بیگم صاحبہ کو آج بھی اپنی صحت کی پرواہ نہیں تھی۔ انہیں کسی کا خوف نہیں تھا۔ وہ بڑی دلیری سے پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ جب تک اس پاکستان دشمن کی آمریت کا خاتمہ نہ کرلوں میں مروں گی نہیں۔

بیگم صاحبہ کا یہ حوصلہ وعزم پارٹی کے کارکنوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر حیٔ سعید نے بیگم صاحبہ کی جرأت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں پہلا مریض دیکھا ہے جو اس قدر حوصلہ مند ہے۔ ڈاکٹر سعید نے بتایا کہ جس دن پہلی مرتبہ وہ آپریشن کے لیے ان کے ہسپتال آئیں تو بیگم صاحبہ کے چہرے پر آپریشن سے پہلے جس طرح مسکراہٹ تھی اسی طرح ہوش میں آنے کے بعد ان کی قوت ارادی جھلک رہی تھی۔ اور اسی طرح مسکراہٹ ان کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔

ڈاکٹر حیٔ سعید نے کراچی سے روانگی کا منظر بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کا جم غفیر بیگم صاحبہ کو خدا حافظ کہنے کے لیے ایئرپورٹ پر اُمڈ آیا تھا۔ یہ منظر بڑا حیران کن تھا۔ مارشل لاء کی قوت کی زنجیر ٹوٹتی ہوئی دیکھی جاسکتی تھی۔ میں نے ڈاکٹر حیٔ سعید سے کہا کہ دیکھئے آج اللہ تعالیٰ نے آپ کو پاکستان اور دنیا بھر میں کتنی بڑی عزت سے سرفراز کیا ہے۔ یہ اس کا انعام ہے کہ آپ نے بیگم صاحبہ کی زندگی بچانے کا ایک مقدس فرض ادا کیا ہے اور آج کروڑوں عوام کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

جس طرح بیگم صاحبہ کو رخصت کرنے کے لیے مارشل لاء کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہزاروں لوگ آئے۔ کاش اسی طرح وہ قائدِ عوام کی زندگی بچانے کے لیے باہر آتے تو ضیاء جیسا

بزدل اور کمینہ شخص جناب ذوالفقار علی بھٹو کا قتل کرنے کی جسارت نہ کرتا۔ لیکن اس میں شاید عوام کا قصور نہ ہو۔ انہوں نے تو کوڑے کھائے ہیں، جیلیں کاٹی ہیں، تشدد کی اذیت برداشت کی ہے، ان کے جسموں پر کوڑوں کے نشانات ثبت ہیں۔ ان اہل وفا کی وفاداری کھلی کتاب کی طرح ہے۔ جس کے ہر ورق پر وفاداری اور جدوجہد کی کہانی تحریر ہے۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جن کے جسم اگرچہ کوڑوں سے داغدار نہیں ہیں لیکن ان کے دلوں اور روح پر ان زخموں کے نشانات ضرور ثبت ہیں۔ مجھے یقین ہے ان فرزانوں نے جنہوں نے وفا کو عبادت بنا دیا ہے، یہ دعا ضرور کی ہے کہ بیگم صاحبہ کی بیماری انہیں لگ جائے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن اور قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو شہید کی رفیقہ حیات بیگم نصرت بھٹو کو لاکھوں پاکستانیوں نے جس طرح علاج کے لیے دعاؤں کے ساتھ الوداع کہا ہے اسی طرح یورپ اور دنیا میں مقیم پارٹی کے ہزاروں کارکنوں نے ان کی عیادت کے لیے بے مثال عقیدت واحترام کا مظاہرہ کیا ہے اور ان کی صحت یابی کے لیے پرخلوص دعائیں مانگ کر اس عہد کی تجدید کی ہے کہ وہ ہر حالت میں شہید بابا کے مشن کا پرچم سربلند رکھیں گے۔ اور عوام کی اسی قوت سے مارشل لاء کا ایوان متزلزل ہونے والا ہے۔

(مساوات ویکلی، لندن، 5 جنوری 1983ء)

مزاحمت کی علامت

بیگم نصرت بھٹو یہ دنیا چھوڑ کر اپنے شوہر ذوالفقار علی بھٹو، دو بیٹوں شاہنواز بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو اور پیاری بیٹی بے نظیر بھٹو کے پاس چلی گئی ہیں۔

بیگم صاحبہ 23 مارچ کو پیدا ہوئیں اور 23 اکتوبر کو ان کا انتقال ہوا۔ ان کی زندگی کی آخری دھائی مشکل ترین اور اذیت ناک تھی۔ یادداشت ساتھ چھوڑ گئی تھی نہ کسی کو پہچانتی تھیں اور نہ ہی بات کر سکتی تھیں، صرف دیکھتی رہتی تھیں، انہیں یہ تک پتہ نہیں تھا کہ بیٹی اور اس کے بچے ان کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ ان پر کیا گزر رہی ہے وہ تو اس کا بھی اظہار نہیں کر سکتی تھیں۔ ایک عظیم، باوقار اور عظیم الشان سابق خاتون اول کو دیکھ کر ان کے پیاروں کی جو دلی کیفیت تھی، وہ اس سے بے خبر تھیں۔ وہ خادماؤں کے سہارے زندگی کے دن بسر کر رہی تھیں۔ دوبئی میں بیٹی کا گھر ان کا مسکن تھا۔ بی بی ایک فرض شناس بیٹی کی طرح ان کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ خود بی بی کی بے چارگی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر اسے پیار سے سہلاتی تھیں اور بیگم صاحبہ سے ہمکلامی کا یہی رشتہ تکلیف دہ ہونے کے باوجود قدرے اطمینان کا باعث تھا۔

بی بی ڈنر ٹیبل پر بیگم صاحبہ کو اپنے اور بلاول کے ساتھ بٹھاتی تھیں۔ آصفہ اور بختاور میز پر دوسری طرف سامنے بیٹھتی تھیں۔ بیگم صاحبہ کو کھانا خادمہ کھلاتی تھیں۔ بی بی کا معمول تھا کہ کھانے کے بعد کافی دیر تک بیگم صاحبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ان سے باتیں کیا کرتیں۔ اس

کا جواب بیگم صاحبہ کی خاموشی ہوتی، اس وقت میں ان کے شاندار ماضی اور موجودہ حالت پر افسردہ ہو جاتا۔ بیگم صاحبہ کی کتاب زندگی کا یہ دردناک باب تھا۔

بی بی نے جس طرح والدہ کی خدمت کی، اس سے انہوں نے اپنی سیاسی زندگی میں بیگم صاحبہ کے دل دکھانے کی تلافی کر دی۔ ماں بیٹی کے رشتہ کے تقدس نے ماں کے قدموں تلے جنت میں جگہ بنالی۔ ان کی بیٹی صنم بھٹو نے اپنی والدہ کے انتقال پر یہ کہہ کر سمندر کو کوزے میں بند کر دیا کہ بیگم صاحبہ نے اپنی فیملی کو جوائن کر لیا ہے۔ اس ایک جملہ میں بیگم صاحبہ کی خرابی صحت کے اذیت ناک لمحات کی کہانی مضمر ہے۔

بیگم نصرت بھٹو عزم و استقلال کا پیکر اور غیر جمہوری قوتوں کے خلاف مزاحمت کی علامت تھیں۔ جنرل ضیاء کے بدترین مظالم کا انہوں نے جس جرأت و بہادری سے مقابلہ کیا وہ ایک شاندار مثال ہے۔ انہوں نے مسلسل قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، لیکن سر نہیں جھکایا۔ بیگم صاحبہ نے اپنے کارکنوں کو جنرل ضیاء کی وحشیانہ کارروائیوں کے خلاف یہ پیغام دیا تھا کہ ہمارے سر کٹ سکتے ہیں لیکن جھک نہیں سکتے۔ ہم پاکستان کے لیے نسل در نسل لڑیں گے۔ اس اعلان نے کارکنوں میں بہت حوصلہ اور جوش پیدا کر دیا اور انہوں نے جنرل ضیاء کے ظلم و تشدد کا آہنی عزم کے ساتھ مقابلہ کیا۔

مارشل لاء کے فوری بعد اگست کے آخری ہفتہ کے دوران 70 کلفٹن میں ان سے ملاقات کی اور یہ اطلاع دی کہ بھٹو صاحب کو قصوری کے جھوٹے مقدمے میں جلد ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ بیگم صاحبہ نے سن کر یہ تاریخی ردعمل دیا کہ ہمیں کوئی خوف اور ڈر نہیں وہ ہمیں شہید بنا دے گا۔

میری اطلاع درست ثابت ہوئی اور چند دن بعد 3 ستمبر 1977ء کو سابق وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کو شرمناک اور غیر مہذبانہ انداز میں گرفتار کر کے لاہور جیل میں قید کر دیا گیا۔ 13 ستمبر 1977ء کو لاہور ہائیکورٹ کے جسٹس صمدانی نے بھٹو صاحب کو رہا کر دیا، عدالت سے وہ صادق حسین قریشی کی کوٹھی آئے۔ وہاں ان سے میری آدھ گھنٹے کی علیحدگی میں ملاقات

ہوئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ جنرل ضیاء کے فلاں دوست نے مجھے کہا ہے کہ قصوری کے قتل کے جھوٹے الزام میں آپ کو پھانسی دینے کا منصوبہ ہے۔ بھٹو صاحب جنرل ضیاء کے اس قریبی دوست سے واقف تھے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے موت قبول ہے لیکن میں ملک چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ بھٹو صاحب نے بھی بیگم بھٹو کے عزم کی تجدید کی، مساوات کے ایڈیٹر سید بدرالدین نے بھی بھٹو صاحب سے علیحدہ ملاقات میں یہی کہا کہ وہ ملک سے باہر چلے جائیں۔ بھٹو صاحب نے ان کو بھی یہی جواب دیا کہ میں جانتا ہوں وہ مجھے مارنا چاہتا ہے مگر میں پاکستان میں جیئوں گا اور یہی مروں گا۔

بیگم نصرت بھٹو 13 ستمبر کی شام جنرل ضیاء کی طرف سے بلائے گئے سیاستدانوں کے اجلاس میں شرکت کے بعد لاہور آئیں۔ بیگم صاحبہ نے اس ملاقات کے بارے میں خیال ظاہر کرتے ہوئے بھٹو صاحب کو بتایا کہ جنرل ضیاء آپ کو نااہل قرار دے کر انتخابات میں حصہ لینے نہیں دے گا۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ وہ الیکشن نہیں کرائے گا وہ ہماری پارٹی اور عوام میں میری مقبولیت سے خوفزدہ ہے، اس کے ارادے کچھ اور ہیں۔

اسی شام دونوں میاں بیوی عید کے لیے لاڑکانہ چلے گئے، چار دن بعد بھٹو صاحب کو دوبارہ گرفتار کر کے ان کی آزادی چھین لی گئی اور 4 اپریل 1979ء کو بھٹو صاحب کی زندگی بھی ختم کر دی گئی۔ ایک جھوٹے مقدمہ میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء کے پلان کے مطابق عدالتی قتل کر کے شہید کر دیا گیا۔

بھٹو صاحب کی قید کے دوران بیگم نصرت بھٹو کو پارٹی کا قائمقام چیئرمین بنا دیا گیا۔ بھٹو صاحب کی شہادت کے بعد بیگم نصرت بھٹو بطور چیئرمین پی پی پی مارشل لاء کے خلاف سینہ سپر ہو گئیں۔ انہوں نے جرأت و بہادری کے ساتھ عوام کے جمہوری حقوق کی آواز بلند کی، انہیں جدوجہد سے روکنے کے لیے جیل اور گھر میں قید کر دیا گیا مگر اس بہادر خاتون نے مضبوط اعصاب کے ساتھ تمام مشکلات و مصائب برداشت کیے، اپنی قائد کی پیروی میں پارٹی کارکنوں

نے جمہوری جدوجہد میں بہادری کے نئے باب رقم کیے اور اپنے کردار و عمل سے سیاسی عبادت کا درجہ دے کر پاکستان پیپلز پارٹی کا پرچم سر بلند رکھا۔ انہیں یہ تقویت بیگم صاحبہ کی ولولہ انگیز قیادت سے ملی۔ قذافی سٹیڈیم میں بیگم صاحبہ پر تشدد کیا گیا اور زخمی بیگم صاحبہ کی یہ تصویر تمام دنیا میں شائع ہوئی جس سے جنرل ضیاء کی بربریت آشکار ہوئی اور جنرل ضیاء کے مارشل لاء کا سیاہ چہرہ بے نقاب ہوا۔

بیگم نصرت بھٹو پر دوسرے درجے کا ذہنی تشدد بھی کیا گیا۔ ان کی جواں سال بیٹی بے نظیر کو قید اور نظر بند کر کے بیگم صاحبہ سے علیحدہ رکھا گیا۔ سکھر جیل میں بے نظیر بھٹو پر جو بہیمانہ تشدد کیا گیا اور جس گرمی میں انہیں رکھا گیا وہ ان کا حوصلہ نہ توڑ سکا، انہوں نے یہ سب کچھ برداشت کیا اور نئے عزم کے ساتھ جنرل ضیاء کے جبر کو چیلنج کر کے اس کی نیندیں حرام کر دیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے پھانسی کی کوٹھڑی سے میر مرتضیٰ بھٹو کے نام خط میں بیگم صاحبہ اور بے نظیر کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

''ان بدترین حالات میں جن سے ہم پہلے کبھی نہیں گزرے۔ آپ کی والدہ اور ہمشیرہ میرے لیے قوت کا ایک شاندار ستون ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شاندار مجاہدانہ مدد کے بغیر حالات میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن بن جاتے۔ عدالتوں اور انتظامیہ میں میرے لیے کوئی انصاف نہیں۔ صرف اللہ تعالیٰ اور عوام کے ہاتھ میں میری زندگی ہے۔''

بیگم نصرت بھٹو کا خصوصی انٹرویو 5 جنوری 1979ء کو مساوات ویکلی لندن کے سالگرہ نمبر میں شائع ہوا۔ بیگم صاحبہ نے مقدمہ قتل کے بارے میں کہا کہ!

''لاہور ہائیکورٹ کی کارروائی سے برطانیہ کی اس بدنام زمانہ عدالت سٹار چیمبر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جہاں انصاف کے تقاضوں کو یکسر پس پشت ڈال کر بے گناہوں کو ٹاور آف لندن کے جلاد کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس عدالت میں قانون کا جاہ و جلال نہیں ایک قصاب کی دکان کا منظر نظر آتا تھا۔ بیگم صاحبہ نے کہا کہ ''یہ قتل کا مقدمہ نہیں بلکہ مقدمے کا قتل ہے۔''

''ہم انصاف چاہتے ہیں اور عوام انصاف کے خواہاں ہیں۔ ہم ایک ایسے بے گناہ کی بریت چاہتے ہیں جو اتفاق سے پاکستان کے عوام کا منتخب نمائندہ بھی ہے۔ وفاق اپنے راہنما کے انصاف کا طالب ہے۔ وفاق بریت چاہتا ہے۔ عوام اس سے کمتر کوئی چیز قبول نہیں کریں گے۔ مکاری اور دغابازی سے ہونے والے فیصلہ کو آزاد عوام کی منتخب پارلیمنٹ میں تحقیقات کے لیے پیش کیا جائے گا۔ اگر مارشل لاء نے انصاف کی آبروریزی کی تو پارلیمنٹ اس سازش کی تحقیقات بھی کرے گی جو عوام کے منتخب نمائندے کو عدالتی کارروائی کی آڑ میں قتل کے لیے کی گئی ہے۔'' سالگرہ نمبر کے اداریہ میں مقدمہ قتل کی مذمت کرتے ہوئے بھٹو صاحب کی ان الفاظ میں حمایت کی گئی ''قوم آپ کو قاتل نہیں سمجھتی۔ خدائے عظیم آپ کے ساتھ ہے۔ پاکستان آپ کے ساتھ ہے اور ملک کے کروڑوں غریب عوام کی دعائیں آپ کے شامل حال ہیں کیونکہ آپ کی زندگی ان کی زندگی ہے۔''

قائدعوام کے عدالتی قتل کے بعد بیگم نصرت بھٹو نے سیاسی اور جمہوری جدوجہد تیز کر دی۔ پاکستانی عوام ان کے ساتھ تھے۔ انجام کار جنرل ضیاء نے اپنی بزدلی کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے 16 اکتوبر 1979ء کو انتخابات منسوخ کر دیئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے ترجمان اخبار مساوات کو بند کر دیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔

فوجی ڈکٹیٹر کی اس بزدلانہ کارروائی سے کارکنوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا لیکن انہوں نے حوصلہ مندی سے جبر اور ظلم برداشت کیا۔ انہوں نے کوڑے کھانے کی مثالیں قائم کیں۔ اور جئے بھٹو کے نعروں سے سیاسی فضا گونجنے لگی۔ صحافی بھی ڈکٹیٹر کے عتاب کا نشانہ بنے انہوں نے کوڑے کھائے اور جیل کاٹی۔

یہ بدترین تاریک دور تھا۔ بیگم صاحبہ نے اپنے دونوں بیٹوں مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو کی جدائی کا غم برداشت کیا۔ انہوں نے جنرل ضیاء کی امیدوں کی کمر توڑ دی۔ ان کا جذبہ حریت اور خودی تابناک رہا۔ بیگم صاحبہ طویل قید کے دوران پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا ہوئیں۔

جنرل ضیاء کی یہ کوشش تھی کہ وہ اس موذی مرض سے جانبر نہ ہوسکیں لیکن عوامی اور بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے انہیں بغرض علاج بیرونِ ملک جانے کی اجازت دیدی۔ بیگم صاحبہ 22 نومبر 1982ء کو جرمنی کے شہر میونخ پہنچیں۔ ان کی صحت بے حد تشویشناک تھی۔ ان کی ہمشیرہ مسز بہجت حریری تیمارداری کے لیے ان کے ساتھ تھیں۔ بیگم صاحبہ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتی تھیں۔ بیگم نصرت بھٹو علیل تھیں لیکن یورپی ملکوں سے آئے ہوئے پارٹی ورکروں کے ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا!

''پاکستان کے موجودہ حکمرانوں نے ملک میں روایتی ظالمانہ ہتھکنڈوں سے عوام کی جو تذلیل کی ہے پاکستان کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ آج پاکستان میں خیبر سے کیماڑی تک ہر جگہ کوڑوں کی بھرمار ہے۔ ملک کی جیلیں سیاسی کارکنوں سے بھری پڑی ہیں اور ایک مطلق العنان جنرل من مانی کر رہا ہے۔ اس غیر آئینی فوجی حکومت کے خاتمہ ہی میں ملک کی بقا ہے، اس لیے پاکستان کے عوام کو چاہیے کہ وہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک حکومت کے خلاف صف آراء ہو کر اپنی جدوجہد کو آگے بڑھائیں۔

ملک میں جمہوریت اور مارشل لا کے خاتمے، انسانی حقوق اور آئین کی بحالی کے لیے آگے بڑھیں اور مارشل لاء کی پابندیوں کی پرواہ کیے بغیر سراپا احتجاج بن جائیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور دیگر جمہوریت پسند پاکستانیوں کا یہ فرض ہے کہ ملک میں مارشل لاء کے بظاہر مضبوط لیکن اندر سے کھوکھلے ستونوں کو آخری ٹھوکر لگا کر زمین بوس کر دیں۔''

بےنظیر پارٹی کو فعال اور موثر قیادت مہیا کرے گی

بیگم نصرت بھٹو نے بےنظیر بھٹو کے بارے میں فخر سے کہا کہ ''وہ بڑی ذہین، بہادر اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والی لڑکی ہے اور پاکستان پیپلز پارٹی کو کامیابی سے ہمکنار کرانے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ بھٹو شہید نے اپنی بیٹی کو بطور خاص سیاسی تربیت دی ہے۔ جب شہید بھٹو

جیل میں تھے تو ہفتے میں صرف ایک بار ایک گھنٹہ کی ملاقات کی اجازت تھی۔ وہ اس ایک گھنٹے میں سیاسی لیکچر دیتے تھے، شہید بھٹو کے آخری ایام میں یہ سیاسی تربیت ہماری بیٹی کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوئی۔ بے نظیر ہر آزمائش میں پوری اتری ہے وہ پارٹی کو فعال اور موٴثر قیادت فراہم کرے گی۔''

بیگم بھٹو پاکستان میں قید اپنی بیٹی کے لیے بے حد فکر مند تھیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ بی بی کی رہائی کے لیے تحریک چلائیں۔ ہم نے یہ تحریک چلائی اور کامیاب مہم کے نتیجہ میں 10 جنوری 1984ء کو جنرل ضیاء نے شرمناک ہتھکنڈوں کے بعد بینظیر بھٹو کو علاج کے لیے ملک سے جانے کی اجازت دی۔ بی بی اپنی والدہ کے پاس سوئٹزرلینڈ آ گئیں۔ ماں بیٹی کی یہ ملاقات طویل جدائی کے بعد ہوئی۔

بیگم بھٹو کو بی بی کے کان کے بارے میں بڑی تشویش تھی۔ بھٹو خاندان کے ذاتی معالج ڈاکٹر نصیر اے شیخ نے لندن کے ہسپتال یوسی ایچ میں ضروری انتظامات کیے۔ بی بی کے آپریشن کے وقت بیگم صاحبہ پیرس سے لندن آئیں اور صحت یابی کے بعد واپس پیرس چلی گئیں، جہاں وہ خود زیرِ علاج تھیں۔

میری بیٹی کا خیال رکھنا

بے نظیر بھٹو نے فروری 1984ء میں کان کے آپریشن اور صحت یابی کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی کو متحرک اور منظّم کرنے کے لیے کام شروع کر دیا۔ چیئر پرسن اور شریک چیئر پرسن کی طویل نظر بندی اور قید کے باعث پارٹی کے تنظیمی امور توجہ طلب تھے۔ بیگم نصرت بھٹو نے اپنی علالت کی وجہ سے بی بی کو یہ ذمہ داری سونپ دی کہ وہ پارٹی کو اندرون ملک اور بیرون ملک مثالی جماعت بنائیں۔ بی بی نے لندن میں مقیم جلاوطن لیڈروں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ انگلینڈ اور یورپ میں پارٹی تنظیم سازی کا عمل شروع ہوا۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز لندن کے کاروباری علاقے باربیکن میں واقع رہائشی فلیٹ تھا۔ غلام مصطفےٰ جتوئی اکثر لندن آتے تھے۔ یہاں ان کا اپنا فلیٹ تھا۔ وہ بی بی سے ملاقات کے لیے آئے۔ بیگم صاحبہ کی مزاج پرسی کے لیے بی بی نے ان کی پیرس میں بیگم صاحبہ سے بات کرائی۔ بیگم صاحبہ نے جتوئی صاحب سے کہا کہ میری بیٹی جلاوطن ہیں اور آپ نے ان کا خیال رکھنا ہے۔ جتوئی نے بیگم صاحبہ کو یقین دلایا کہ بے نظیر انہیں بیٹی کی طرح عزیز ہیں اور آپ فکر نہ کیجئے گا۔

غلام مصطفےٰ جتوئی پی پی پی سندھ کے صوبائی صدر تھے۔ انہوں نے بے نظیر بھٹو سے مشاورت کے بغیر پارٹی کی تنظیم نو میں اہم عہدے اپنے منظور نظر افراد کو دیئے۔ بی بی کو یہ ناگوار گزرا اور صوبائی صدر کے فیصلہ کو مسترد کر دیا اور خود نئے عہدیدار مقرر کیے۔ اس وجہ سے ان میں

اختلافات پیدا ہوئے۔ بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی سے قبل غلام مصطفیٰ جتوئی اور غلام مصطفیٰ کھر نے اپنی علیحدہ پارٹی تشکیل دے دی۔

یہ پولیس والا قابلِ اعتبار نہیں

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے 1969ء میں بیگم نصرت بھٹو سے میرا پہلا تعارف کرایا تھا۔ میں نے بریڈفورڈ اور برمنگھم میں بھٹو صاحب کے عوامی جلسوں کا انتظام کیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے بھٹو صاحب کے ساتھ ان جلسوں میں شرکت کی اور عوام نے ان کا فقید المثال استقبال کیا تھا۔ بیگم بھٹو اس سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ خاتون اول بیگم نصرت بھٹو 1972ء میں لندن آئیں ان کا قیام پاکستانی سفیر میاں ممتاز دولتانہ کے ہاں تھا۔ میری بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں بتایا کہ لندن میں ''ڈان'' کے نمائندے نسیم احمد نے وزیراعظم کے چیف سکیورٹی افسر سے ملاقات کرائی ہے اور انہوں نے مجھے اس کے ساتھ رابطہ کے لیے کہا ہے۔''

بیگم صاحبہ نے مجھے ہدایت کی کہ ''یہ پولیس والا ہے اور اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔'' آپ وزیراعظم ہاؤس میں صرف مجھ سے رابطہ رکھیں اور ہر ضروری اطلاع مجھے دیا کریں اور میں وزیراعظم کو اس سے آگاہ کروں گی۔

بیگم صاحبہ کی اس کے بارے میں رائے درست ثابت ہوئی ،قصوری کے جھوٹے مقدمہ قتل میں اسی چیف سکیورٹی افسر نے اپنے اسی وزیراعظم کے خلاف سلطانی گواہ بن کر لاہور ہائیکورٹ میں شہادت دی تھی جن کے نام پر اس نے ہر کس و ناکس پر دھونس جما رکھی تھی۔

روزنامہ گارڈین لندن کی خبر

فوجی آمر جنرل ضیاء نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے عدالتی قتل کے بعد ان کے خاندان کے خلاف انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو مختلف جیلوں میں قید اور گھروں میں نظر بند کرنے کی اذیت ہی نہیں دی بلکہ انہیں ہراساں کرنے کے

لیے ان کی جائیداد ضبط کرنے کے گھناؤنے اقدام سے بھی گریز نہیں کیا۔ انتقام کی وحشیانہ کارروائیاں بھی بیگم نصرت بھٹو کے عزم واستقلال کو کمزور نہ کرسکیں۔ بلکہ انہوں نے فولادی قوت سے ان کا مقابلہ کر کے جنرل ضیا کے مذموم عزائم کو ناکام بنایا۔ وہ ان کے حوصلہ کو پست نہ کرسکا۔ جنرل ضیا ہر کوشش کے باوجود شہید قائد عوام اور ان کے خاندان کے خلاف کرپشن کا کوئی ثبوت پیش نہ کرسکا، اس میں ناکامی کے بعد ضیاء نے انکم ٹیکس کی عدم ادائیگی کا افسانہ تراشا اور کثیر رقم کا جھوٹا کیس بنا کر نوٹس دیا کہ اگر ٹیکس ادا نہ کیا گیا تو ان کی رہائشی جائیداد ضبط کرلی جائے گی۔

لندن کے مقتدر اخبار گارڈین نے یہ خبر شائع کی کہ جنرل ضیاء کی فوجی حکومت نے بیگم نصرت بھٹو کو تین لاکھ ستاسی ہزار پونڈ انکم ٹیکس ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور عدم ادائیگی کی صورت میں کراچی میں ان کی رہائش گاہ 70 کلفٹن ضبط کرلی جائے گی۔

ایک دوست عرب ملک کے سفیر نے گارڈین کی خبر پڑھ کر مجھ سے رابطہ کیا اور یہ پیش کش کی کہ ان کی حکومت یہ رقم ادا کرے گی تا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی بیوہ اور ان کی بیٹی کو گھر سے بے دخل نہ کیا جائے۔ اتفاق سے بیگم صاحبہ آزاد تھیں۔ میں نے انہیں کراچی فون کر کے اس پیش کش سے آگاہ کیا۔ بیگم صاحبہ نے کہا کہ جنرل ضیاء بے شک ہمیں گھر سے نکال دے ہم باہر سڑک پر بیٹھ جائیں گے لیکن اس جھوٹے کیس میں ایک روپیہ بھی نہیں دیں گے۔ آپ ان کا شکریہ ادا کردیں۔ میں نے بیگم صاحبہ کے جواب سے انہیں مطلع کر دیا کہ بیگم صاحبہ آپ کی تشویش کے لیے شکر گزار ہیں لیکن پیش کش قبول کرنے سے معذرت کرلی ہے۔

بعدازاں اسی ملک کے سفارتی عملہ نے بیگم صاحبہ سے ملاقات میں اس پیش کش کا اعادہ کیا اور انہوں نے شکریہ کے ساتھ پھر معذرت کرلی۔ بیگم نصرت بھٹو کو کس طرح پریشان کیا گیا، انکم ٹیکس کا جھوٹا مقدمہ اس کی ایک مثال ہے اور بیگم صاحبہ کے عزم و ہمت کی مثال ہے کہ کوئی دباؤ یا ظلم انہیں جمہوری جدوجہد کی راہ پر چلنے سے نہ روک سکا۔ اس عظیم خاتون نے ہر طرح کے حالات اور جبر کا مقابلہ کیا اور صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں۔

آصفہ کی ولادت

بیگم نصرت بھٹو اپنی بیٹی بے نظیر بھٹو کے ساتھ جنوری 1993ء میں لندن آئیں۔ بی بی امید سے تھیں۔ بیگم صاحبہ کی ہدایت پر ڈاکٹر نصیر اے شیخ نے وسطی لندن میں واقع معروف ہسپتال پورٹ لینڈ میں بچہ کی متوقع پیدائش کے لیے ضروری انتظام کر دیا تھا۔ 3 فروری 1993ء کو آصفہ پیدا ہوئیں اور بیگم صاحبہ نے دیر بعد خوشی دیکھی۔ بلکہ 1990ء میں حکومت کی غیر آئینی معزولی کے بعد ان کے لیے خوشی کا یہ پہلا موقع تھا جو لندن میں میسر آیا۔ بیگم صاحبہ ہسپتال میں موجود رہتی تھیں۔

آصفہ کی پیدائش کے تیسرے دن مجھے بی بی کا پیغام ملا کہ ہسپتال آ کر ان کی نومولود بیٹی کو دیکھ سکتا ہوں۔ بیگم صاحبہ بھی وہاں موجود تھیں اور میں ان کی خوشی میں شریک ہوا۔ بی بی ہسپتال سے واپس آئیں تو کچھ دنوں بعد ہیلو میگزین نے بی بی کا انٹرویو کیا۔ بی بی اور آصفہ کی تصاویر لیں اور یہ خوبصورت تصویریں ہیلو میگزین اور پیرس میچ میں شائع ہوئیں۔ ان میں بیگم صاحبہ نے اپنی نواسی کو گود میں اٹھایا ہوا ہے۔ بیگم صاحبہ کے لیے یہ بہت خوشی کا موقع تھا، انہوں نے محبت نچھاور کرتے ہوئے نواسی کو بہت پیار کیا تھا۔

آصفہ کی پیدائش کے چند ہفتوں بعد بی بی کا پتے کا کامیاب آپریشن ہوا۔ بیگم صاحبہ نے قدم قدم ان کی دیکھ بھال کی اور ہمہ وقت ان کے ساتھ رہیں۔ اب ملک کے سیاسی حالات بدل رہے تھے۔ صدر غلام اسحاق خان اور وزیر اعظم نواز شریف میں اختلافات پیدا ہونے کی اطلاعات آنا شروع ہو گئیں اور بعض راہنما بی بی سے ملاقات کے لیے بھی آئے تا کہ سیاسی صورت حال میں بہترین آپشن پر غور کر سکیں۔ آصف علی زرداری بھی نظر بندی سے رہا ہو کر لندن آ گئے۔ چند ماہ قیام کے بعد بیگم صاحبہ ان کے ہمراہ واپس پاکستان چلی گئی جہاں نئی صورت حال ان کی منتظر تھی۔

ٹرپل ایجنٹ

1993ء میں انتخابات کا اعلان ہوا تو میر مرتضیٰ بھٹو نے دمشق سے یہ اعلان کر دیا کہ وہ سندھ میں صوبائی اسمبلی کے 17 حلقوں سے انتخاب لڑیں گے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے اس اعلان سے بیگم صاحبہ بڑی پریشان تھیں۔ انہوں نے اپنے پیارے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ یہ غلطی نہ کریں کیونکہ اس سے پارٹی کو نقصان ہوگا۔ مگر میر مرتضیٰ بھٹو اپنے اعلان پر قائم رہا اور اس نے اپنی والدہ کی بات نہ مانی۔ میں میر مرتضیٰ بھٹو سے ملنے دمشق گیا۔ میری موجودگی میں بیگم صاحبہ کا فون آیا اور انہوں نے اپنے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی مگر میر مرتضیٰ بھٹو اپنی ضد پر رہا۔ بیگم صاحبہ نے اسے کہا کہ جتنے حلقوں سے بھی انتخاب لڑو لیکن تمہارا ووٹ اسمبلی میں ایک ہی ہوگا اور پارٹی کو اس سے بہت نقصان ہوگا۔

بیگم صاحبہ نے فون پر مجھے بھی کہا کہ میں میر کو سمجھاؤں۔ وہ رو رہی تھیں کہ بیٹا ان کی بات نہیں مان رہا ہے۔ فون ختم ہونے کے بعد میں نے میر مرتضیٰ سے کہا کہ بیگم صاحبہ ٹھیک کہتی ہیں اور آپ ان کی ہدایت پر عمل کریں۔ مرتضیٰ مجھ سے بھی یہ سن کر خفا ہوا اور اس سلسلہ میں کوئی معقول بات سننے کو تیار نہ تھا۔

میں نے اس کشیدہ ماحول میں اسے بتایا کہ پاکستان میں حالات بدل چکے ہیں اور الیکشن میں کامیابی کے لیے آپ کی پاکستان میں موجودگی ضروری ہے۔ بی بی نے بھی مجھے یہی کہا تھا کہ میر سے کہو کہ وہ قومی اور صوبائی دو حلقوں سے انتخابات میں حصہ لے۔ اسی روز میں نے حامد میر کے لیے میر مرتضیٰ بھٹو کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس انٹرویو میں میرے سوال کے جواب میں میر مرتضیٰ بھٹو نے کہا کہ وہ بے نظیر بھٹو کو پارٹی قائد اور اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ جواب ایک بڑا سکوپ تھا اور بی بی کے لیے بے حد خوشی کا باعث۔

واپسی سے ایک رات قبل شیرٹن ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں نصف شب کے قریب ہم نے ڈنر کیا۔ شام کا ایک اعلیٰ افسر بھی ڈنر میں شامل تھا۔ اس نے مرتضیٰ کو خبردار کیا تھا کہ پاکستان

گئے تو قتل کر دیئے جاؤ گے۔ بعد میں میر مرتضیٰ نے انتخابات کے موقع پر پاکستان واپسی کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا۔

بیگم نصرت بھٹو نے لاڑکانہ کے آبائی حلقہ سے میر مرتضیٰ بھٹو کے لیے اکیلے انتخابی مہم چلائی اور ڈاکٹر اشرف عباسی کے بیٹے منور عباسی کو ہرا کر مرتضیٰ بھٹو سندھ اسمبلی کا رکن منتخب ہو گیا۔ قومی اسمبلی کی نشست اور دوسرے حلقوں میں اسے شکست ہوئی۔

بیگم نصرت بھٹو مرتضیٰ کی واپسی کے لیے بے چین تھیں لیکن پیپلز پارٹی کے امیدوار کے مقابلے میں اپنے بیٹے کی حمایت پر بیگم صاحبہ کی مخالفت شروع کر دی گئی حالانکہ وہ پارٹی کی چیئر پرسن تھیں۔ اس صورتِ حال نے پیچیدہ شکل اختیار کر لی۔ ماں بیٹی میں بدگمانی جنم لے چکی تھی۔ بیگم نصرت بھٹو کی ممتا کی آزمائش کا یہ بہت کٹھن وقت تھا۔ ایک طرف بیٹی تھی اور دوسری طرف بیٹا۔ انہیں بیٹی اور بیٹے سے محبت کا عذاب برداشت کرنا پڑا۔ دونوں صورتوں میں ممتا کی ہار تھی۔ بیگم نصرت بھٹو نے جنرل ضیاء کے مارشل لاء اور وحشیانہ آمریت کا شاندار قوتِ ارادی سے مقابلہ کیا تھا لیکن ماں کی ممتا کا یہ امتحان ان کی زندگی کا مشکل ترین اور دل شکن مرحلہ تھا۔

میر مرتضیٰ بھٹو پاکستان واپس آیا تو اذیت کا طوفان ناقابل برداشت ہو گیا۔ ماں اور بیٹی میں محبت کا ابدی رشتہ متاثر ہوا اور خاندان کی شکست و ریخت نے بیگم صاحبہ کا دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ 1993ء کی انتخابی مہم کے خاتمہ پر بی بی لاہور ایئر پورٹ میں جہاز کا انتظار کر رہی تھیں۔ جلسوں میں تقریروں سے ان کی آواز بیٹھ گئی تھی ہمارے دوست شاہد نواز بھی ساتھ تھے۔ بی بی نے شاہد نواز کو کاغذ پر لکھ کر کہا کہ ''بشیر ٹریل ایجنٹ ہے۔ یہ میرا، بیگم صاحبہ اور میر مرتضیٰ بھٹو ہم تینوں کا ایجنٹ ہے۔'' اس وقت اس مذاق پر ہم سب مسکرائے تھے لیکن بی بی کے کہے ہوئے ان الفاظ نے مجھے واقعی ٹریل ایجنٹ بنا دیا اور ماں، بیٹی اور بھائی بہن کی تکون میں صلح جوئی اور مفاہمت کا کردار ادا کرنے لگا۔

بیگم نصرت بھٹو نے مرتضیٰ کا آخری دیدار نہیں کیا

یہ بہت دردناک اور اداس لمحات تھے۔ بھٹو خاندان کے آبائی قبرستان گڑھی خدا بخش میں میر مرتضیٰ بھٹو کا جنازہ اور تدفین ہو چکی تھی۔

صنم بھٹو المرتضیٰ لاڑکانہ میں اپنے بھائی کے غم میں صدمہ سے نڈھال آنسو بہا رہی تھیں۔ ان کے کزن طارق اسلام، یاسمین نیازی، بیگم ڈاکٹر ظفر نیازی، آمنہ پراچہ ان کے شوہر سلیم ذوالفقار علی خان، سمیعہ وحید، سلمیٰ وحید، واجد شمس الحسن اور میں صنم بھٹو کے ساتھ اظہارِ غم میں شریک تھے۔

اسی دوران بیگم نصرت بھٹو اس سوگوار ماحول میں کمرے میں داخل ہوتی ہیں۔ ان کا پہلا سوال تھا ''میر مرتضیٰ کہاں ہے؟ میں اسے ڈھونڈھ رہی ہوں۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہا۔ میں لندن سے اس کی سالگرہ کے تحائف لے کر آئی ہوں اور اسے مبارکباد دینا چاہتی ہوں۔''

کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ ہم سب خاموش تھے، کسی میں حوصلہ نہ تھا کہ بیگم صاحبہ کو ان کے بیٹے کے سانحہ کی خبر دے سکے۔ بیگم صاحبہ کچھ دیر بعد بیٹے کی تلاش میں دوسری طرف چلی گئیں۔

20 ستمبر 1996ء کو مرتضیٰ بھٹو کا کراچی میں قتل ہوا۔ اس وقت بیگم صاحبہ لندن میں تھیں اور اس المناک واقعہ سے بے خبر تھیں۔ مرتضیٰ کی سالگرہ 18 ستمبر کو ہے۔ انہوں نے بیٹے کے لیے تحائف خریدے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

بیگم صاحبہ پاکستانی ہائی کمشنر واجد شمس الحسن کے ساتھ اگلے روز پاکستان پہنچیں انہیں یہ علم نہیں تھا کہ ان کا بیٹا قتل ہو کر ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو چکا ہے۔ بیگم صاحبہ لاڑکانہ آئیں تو اس خیال سے کہ وہ صدمہ برداشت نہیں کر سکیں گی۔ یہ مناسب خیال کیا گیا کہ فوری طور پر انہیں یہ نہ بتایا جائے۔ چنانچہ انہیں نیند کا ٹیکہ لگا کر سلا دیا گیا۔ دوپہر کے بعد بیدار ہوئیں۔ وہ بیٹے کو گھر میں ڈھونڈ رہی تھیں اور اس کی تلاش میں اس کمرہ میں آ گئیں جہاں ہم ان کی بیٹی صنم کے ساتھ

تعزیت کر رہے تھے۔ بیگم صاحبہ کو دیکھ کر ہم سب کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے کہ ماں کو یہ تک پتہ نہیں کہ اس کا بیٹا دوسری دنیا میں چلا گیا ہے اور وہ اپنے بیٹے کے آخری دیدار سے محروم رہی ہیں۔ جس طرح وہ بیٹے کو سفرِ آخرت میں نہ دیکھ سکی تھیں۔ اسی طرح جب بی بی 27 دسمبر 2007ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں شہید کر دی گئیں تب بھی انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی پیاری بیٹی خالق حقیقی سے جا ملی ہیں۔ اور اسی بے خبری کے عالم میں ہی وہ دنیا کو الوداع کہہ کر اپنے پیاروں کے پاس چلی گئیں۔

خاتونِ اوّل بیگم نصرت بھٹو سے خصوصی انٹرویو

بشیر ریاض

بیگم نصرت بھٹو اپنی شخصیت، کردار اور بصیرت کے اعتبار سے ان خواتین میں سے ہیں جو اندرون ملک ہی نہیں بلکہ بیرون ممالک میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

بیگم نصرت بھٹو آزادی خواتین اور ان کے حقوق کے تحفظ کی سرگرم حامی ہیں۔ 1970ء کے انتخابات سے قبل، انتخابات کے دوران اور بھٹو صاحب کے برسر اقتدار آنے کے بعد جس صلاحیت سے انہوں نے پاکستانی خواتین کی قیادت کی، اس کے نتائج واضح شکل میں موجود ہیں۔ ان کی اس صلاحیت کا اعتراف صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ بیرون ملک بھی کیا گیا۔ خواتین کے عالمی سال کے سلسلے میں میکسیکو کے مقام پر جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں بیگم بھٹو کو نائب صدر منتخب کر کے عالمی بنیاد پر وہ اعزاز عطا کیا گیا جو کسی دوسری مشرقی خاتون کو نہ مل سکا۔

پاکستان کی خاتون اول بننے کے بعد آپ میں کیا تبدیلی واقع ہوئی؟

آپ کا اشارہ جس تبدیلی کی جانب ہے میرے نزدیک وہ بہت اہم تبدیلیاں ہیں کیونکہ اس صورتحال میں میرے لیے دو راستے تھے کہ یا تو میں گھریلو مسائل اور خاندانی معاملات

کی حد تک اپنی توجہ مرکوز رکھوں یا پھر ان ضرورتمندوں کے کام آؤں جو میرے پاس اس مقصد کے لیے آتے ہیں کہ میں ان کی مشکلات کو حل کرنے میں مدد دوں۔ مجھے ان دونوں راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا اور مجھے خوشی ہے کہ اپنی خاندانی زندگی کی قربانی دیکر اس سے زیادہ اہم مسئلے کے لیے خود کو وقف کر دیا اور یہ مسئلہ تھا ملک کی خدمت کا۔ اس مقصد عظیم کے لیے میں نے گھریلو زندگی کو تج کر جو قربانیاں دی ہیں اس سے بہر حال مطمئن ہوں۔

جناب بھٹو اور آپ کی مصروفیات کے سبب آپ کی گھریلو زندگی کا متاثر ہونا قدرتی امر ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے بچوں کا ردعمل کیا ہے؟

آپ کے اس سوال کے جواب میں یہ حقیقت جاننا ضروری ہے کہ ہم ایک جست میں ہی اس مرتبے پر نہیں پہنچے بلکہ اس کے لیے ہمیں بتدریج مختلف مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ بھٹو صاحب پہلے وزیر قدرتی وسائل وتجارت بنے، پھر وزیر خارجہ، اس کے بعد ملک کے صدر اور اب وزیر اعظم ہیں۔ چنانچہ مدارج کی تبدیلیوں کے ساتھ ہماری مشغولیات اور مصروفیات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ابتدا میں تو بچوں نے ہماری مصروفیات کا گہرا اثر لیا، لیکن اب تو وہ بڑی حد تک اس کے عادی ہو گئے ہیں جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے سماجی کام میں پہلے بھی دلچسپی سے کیا کرتی تھی لیکن اب ذمہ داریوں میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس صورت میں یہ قدرتی امر ہے کہ مصروفیات میں بھی اضافہ ہو۔ جب بچے کمسن تھے تو یہ بات ان کی فہم سے باہر تھی کہ میں ان کے ساتھ رہنے کے بجائے زیادہ وقت گھر سے باہر سماجی کاموں کے لیے وقف کیے ہوئے ہوں۔ لیکن جوں جوں وہ بڑے ہوتے گئے اب یہ بات ان کی سمجھ میں بخوبی آ گئی ہے کہ وزیر اعظم کی بیگم ہونے کے ناطے میری ذمہ داری بھی بہت زیادہ ہے اور یہ کہ مجھے اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے یہ قربانی دینا پڑ رہی ہے۔ میں ذاتی طور پر یہ کام انجام دے رہی ہوں۔ میں اسے اپنا فریضہ سمجھتی ہوں اور میرا خیال ہے کہ میرے بچے اب اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو

چکے ہیں۔ اس کے باوجود صورتحال یہ ہے کہ دو بڑے بچے جو ہمارے سیاست میں آنے کے وقت بھی قدرے باشعور تھے ہماری مصروفیات کے باعث اتنے زیادہ متاثر نہ ہوئے لیکن دوسرے دو چھوٹے بچوں نے تو اس کا یوں بھی زیادہ اثر لیا ہے کہ وہ سیاست کو قطعی ناپسند کرتے ہیں۔ انہیں اس کی پرواہ نہیں کہ دنیا میں یا خود ان کے ملک میں کیا ہو رہا ہے انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن دونوں بڑے بچوں کا مسئلہ ان سے مختلف ہے۔ وہ سیاست میں بھرپور دلچسپی رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ فرق آپ پر واضح ہو گیا ہوگا اور آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مندرجہ بالا حقائق کے بیان سے میرا کیا مطلب ہے۔ دراصل 1964ء اور 1965ء میں چھوٹے دونوں بچے بہت کمسن تھے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ ان کی ممی ان کے پاس کیوں نہیں رہتیں۔ دوسرے بچوں کے والدین کی مانند خود ان کے والدین اس درس گاہ میں کبھی کیوں نہیں جاتے جہاں وہ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ جب دوسرے بچوں کی زبانی وہ یہ سنتے کہ ان کے والدین ان کے ہمراہ کھیلتے بھی ہیں، پکنک، سینما کے لیے بھی ہمراہ جاتے ہیں تو ہمارے بچوں کا اس سے متاثر ہونا قدرتی امر تھا۔ اس کے برعکس جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے کہ دونوں بڑے بچے اس وقت بھی قدرے باشعور تھے اس لیے انہوں نے ہماری مصروفیات کو نسبتاً کم اہمیت دی اور جوں جوں ان کی عمر میں اضافہ ہوتا گیا وہ سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ لیکن چھوٹے بچوں کا ردعمل یہی ہے کہ والدین نے انہیں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ سیاست کو ناپسند کرتے ہیں۔

پاکستان کی خاتون اول ہونے کی حیثیت سے آپ اپنے فرائض جس دلچسپی اور محنت سے انجام دے رہی ہیں اس کی بدولت آپ نے مسلم ممالک کی خواتین میں ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔ یہ بات لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی سربراہان مملکت کی کانفرنس کے حوالے سے کہہ رہا ہوں؟

سچ پوچھیے تو اس کانفرنس میں، میں نے تو کچھ نہیں کیا تھا۔

لیکن یہاں میزبان کی حیثیت سے آپ نے جو فرائض انجام دیئے اس کے سبب مسلم ورلڈ میں آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے؟

دراصل اس کانفرنس کا تعلق صرف مردوں سے ہی تھا۔ بہت کم سربراہان مملکت تھے جن کی بیگمات ان کے ہمراہ آئی تھیں۔ ان بیگمات کی میزبانی کے فرائض بہرحال میرے ذمے تھے۔

لاہور کی اسلامی کانفرنس یا مسلم دنیا سے ہمارا اسلامی بھائی چارے کا جو تعلق ہے اس کے حوالے سے پاکستانی خواتین انفرادی یا اجتماعی طور پر اسلامی ملکوں کو ایک دوسرے سے زیادہ قریب لانے میں کیا کردار ادا کرسکتی ہیں؟

دیکھئے! سچی بات تو یہ ہے کہ ساری دنیا خصوصیت کے ساتھ تمام اسلامی ممالک کے مقابلے میں پاکستان ایسا ملک ہے جہاں مذہب کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ان ممالک میں جہاں اسلام کا آغاز ہوا اور جو ہم سے قبل مسلمان تھے مذہب کا تصور ان کے ہاں ہم سے قدرے مختلف ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اسلام کو کم اہم سمجھتے ہیں لیکن سیاسی بنیاد پر وہ قومی نقطہ نظر سے مسائل کو دیکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے اپنے ملک میں اسلام کے نام پر جو کچھ ہوتا رہا ہے اس کی تفصیل میں جانے کا بہرحال یہ موقع نہیں ایران جو ایک مسلمان ملک ہے میرا خاندان یہاں آباد ہے۔ اس کے علاوہ میرے کئی رشتہ دار عراق کے علاوہ دوسرے عرب ممالک میں بھی بستے ہیں۔ میرے دادا جان نے اپنے ایک بیٹے کو کاروبار میں ڈالا اور دوسرے کو مذہبی تعلیم دلائی۔ ماضی میں خاندان کا رویہ کچھ اس طرح کا ہوتا تھا۔ طرز زندگی مختلف اختیار کرنے کے باوجود لوگ ایک ہی خاندان کے فرد گردانے جاتے تھے۔ میرے جو بزرگ عراق میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہیں پر مقیم رہے وہ بھی خاندان کے اہم فرد تسلیم کیے جاتے رہے۔ شادی سے قبل تو جوانی

میں، میں نے مختلف ممالک کا سفر کیا اور شادی کے بعد تو بہت، سے مسلم ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا لیکن اسلام کا تذکرہ پاکستان سے زیادہ کہیں بھی نہ پایا۔ بیشک وہ لوگ اسلام کو اپنا دین سمجھتے ہیں لیکن جب وہ اپنے ملک کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ان کا نقطہ نظر خالص قومی بنیاد پر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ میرا نقطہ نظر سمجھ گئے ہوں گے کہ قومی نظریہ رکھنے کے باوجود وہ بھی مسلمان ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں اور دوسرے شرعی احکام بجالاتے ہیں لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ خدا بیشک ہم سے ہمارے دین کے بارے میں پوچھے گا لیکن ہر شخص کو یہ کس نے اختیار دیا ہے کہ وہ لوگوں سے ان کے مذہب کے بارے میں استفسار کرتا پھرے۔ چنانچہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں جو رویہ عام ہے یہ کسی دوسرے اسلامی ملک میں نظر نہیں آتا۔

اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ پاکستان چونکہ ہندو غلبے کی وجہ سے جسے ہم دوقومی نظریہ کہتے ہیں کے سبب وجود میں آیا کہ پاکستان یا ہندوستان کے مسلمان عدم تحفظ کا شکار تھے؟

بے شک آپ کا خیال درست ہے۔ پاکستان کی آزادی کے لیے اسلام کو ہم نے ایک نعرے کے طور پر استعمال کیا۔ ہندوستان میں مسلمان ایک اقلیتی قوم کی حیثیت سے آباد تھے اقتصادیات پر ہندو اکثریت کا غلبہ تھا۔ عام مسلمان کو نہ ملازمت حاصل تھی نہ کاروباری ذرائع! ہندو معاشی طور پر اتنے مستحکم تھے کہ وہ کسی مسلمان کو بھی کاروبار میں کامیاب نہ ہونے دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے ایک علیحدہ مملکت حاصل کرنے کا نعرہ دیا اور اس کے لیے جدوجہد کی۔ ایک ایسی مملکت کے لیے جہاں ہر مسلمان اپنے مذہب، تعلیمی، سماجی اور اقتصادی معاملات میں آزاد ہو۔ میں نے اکثر اس نہج پر سوچا ہے کہ جن مسلم ممالک پر انگریز کا تسلط رہا ہے وہاں جانے سے قبل یہ انگریزوں کا فرض تھا کہ یہ ممالک مسلمانوں کے حوالے کرتے۔ نہ جانے دوسرے لوگوں نے اس نقطہ نظر سے کیوں نہ سوچا۔ میرا مطلب مسلم بادشاہوں سے نہیں بلکہ مسلم عوام سے

ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان تو ہندوؤں کے معاشی غلبے اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے سبب وجود میں آگیا ہے۔

آپ کے خیال کو محض اس فقرے میں سمویا جاسکتا ہے کہ حصول پاکستان کے بعد اپنے مذہب اور قومیت کے بارے میں ہماری خوداعتمادی میں اضافہ ہونا چاہیے تھا؟

یہ تو قدرتی بات ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور کوئی ہمارا عقیدہ ہم سے نہیں چھین سکتا۔

آپ حکمران جماعت یعنی پیپلز پارٹی کی ایک اہم رکن ہیں۔ اس طرح سیاست سے آپ کا براہ راست تعلق ہے، آپ کے خیال میں قومی سیاست کو صاف ستھرا اور صحتمند بنانے میں یہاں کی خواتین کیا رول ادا کرسکتی ہیں؟

مجھے علم تھا کہ یہ سوال آپ ضرور پوچھیں گے۔ میرا خیال ہے کہ آج ملک میں صاف ستھری سیاست بروئے کار آچکی ہے۔ یعنی یہاں پہلی بار ایک ایسی حکومت برسراقتدار آئی ہے جسے عوام نے خود اپنے ووٹوں سے منتخب کیا ہے۔ قیادت اور سیاست میں عوام کا بھرپور حصہ ہے جہاں تک خواتین کا تعلق ہے انہوں نے پیپلز پارٹی کے پرچم تلے پہلی بار آمریت کے خلاف حصہ لیا۔

اس تحریک کی قیادت یقیناً خود آپ نے کی تھی؟

آپ کا خیال درست ہے اور اس جدوجہد میں عورتوں نے لاٹھیاں بھی کھائیں۔ سچ پوچھئے تو موجودہ حکومت سے قبل ہمارے معاشرے میں عورت سب سے زیادہ مظلوم رہی ہے۔ حالانکہ ہم کل آبادی کا نصف حصہ تھے۔ چنانچہ یہ پیپلز پارٹی کی سوچ تھی کہ آبادی کے اتنے بڑے حصے کو متحرک کیے بغیر معاشرے میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ کسی دانشور کا قول ہے کہ کسی سوسائٹی کو جانچنے کا معیار یہ ہے کہ یہاں عورت کی حیثیت کیا ہے؟ چنانچہ ہم نے عورت کو

اس کی حیثیت اور اہمیت کا احساس دلایا کہ وہ بھی دوسروں کی طرح انسان ہیں۔ وہ بھی سوچ رکھتی ہیں اور کام بھی کر سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پارٹی کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عورت کو ووٹ کا بنیادی حق دلا کر اسے آگے بڑھنے میں مدد دی ورنہ اس سے قبل اسے کون پوچھتا تھا۔

آپ نے قریب قریب دو سال قبل لندن میں بتایا تھا کہ دیہاتوں میں پیپلز ورکس پروگرام کے تحت دستکاری سکول قائم کیے گئے ہیں جن میں خواتین کام کرتی ہیں۔ آپ نے بتایا تھا کہ اس منصوبے کا مقصد ایک تو خواتین کے بیکار وقت کا صحیح مصرف ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کی بنائی ہوئی اشیا کو برآمد کرنے سے قومی آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس تجویز کے بارے میں یقیناً اب بھی آپ کچھ کہنا پسند کریں گی؟

جی ہاں! یہ منصوبہ دو سال ہوئے شروع کیا جا چکا ہے۔ ان دنوں ایسے تین ہزار ادارے سرگرم عمل ہیں۔ پیپلز ورکس پروگرام وزارت محنت و سماجی بہبود کے ماتحت چلائے جا رہے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ انڈسٹریل ہوم دیہاتوں میں قائم کر کے خواتین کو پہلے یہاں گھریلو صنعتوں کے بارے میں تربیت دی جائے ظاہر ہے کہ یہ خواتین تربیت یافتہ نہیں ہوتیں، لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ بیوروکریسی اس نیک مقصد کی راہ میں بھی حائل ہوئی اور اس نے ہماری قطعی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ سچ پوچھیے تو ہماری بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں۔

تو اس سلسلے میں آپ بیوروکریسی کے اس رویے کی جانب وزیراعظم کو توجہ دلائیں تا کہ ایک مفید منصوبے کو عملی جامہ پہنا کر اس سے اچھے نتائج حاصل کیے جا سکیں؟

مجھے جب بھی موقع ملتا ہے بیوروکریسی کی پیدا کردہ رکاوٹیں اور سرخ فیتہ جو ہماری کارکردگی میں رکاوٹ کا سبب بنتا ہے اس سے وزیراعظم کو مطلع کر دیتی ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں اس سلسلے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتی کہ اس قسم کے مسائل سے وزیراعظم کو آگاہ کر دوں۔

عام طور پر مشہور ہے بلکہ چند روز ہوئے ایک غیر ملکی جوڑے نے ایک ملاقات میں کہا تھا۔اس کے علاوہ مغربی پریس میں تو بارہا اس بات کو دہرایا گیا ہے کہ وزیر اعظم پاکستان مسٹر بھٹو نے جب سے اقتدار سنبھالا ہے روزانہ اٹھارہ گھنٹے مسلسل کام کرتے ہیں۔سب نے اس پر حیرت کا اظہار بھی کیا ہے کہ مسلسل اتنی محنت کے بعد وہ اپنی صحت کیسے برقرار رکھ سکتے ہیں۔نیز آپ بھٹو صاحب کا کس طرح ہاتھ بٹاتی ہیں؟

بات یہ ہے کہ صرف میں ہی نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو ملک کی تعمیر و بقاء کے لیے کچھ کام کرتا ہے وہ وزیر اعظم کی مدد کرتا ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو سماجی کاموں میں میری کارکردگی بھٹو صاحب کی ممد ثابت ہو سکتی ہے۔ میں تو عملاً ایک سماجی کارکن ہوں، چنانچہ اپنے آپ کو سماجی بہبود کے کاموں تک محدود رکھتی ہوں۔میرے پاس اکثر ایسے لوگ آتے ہیں جن کو قطعی علم نہیں کہ اپنے کام کے لیے انہیں کس کے پاس جانا چاہیے۔ان کو پتہ نہیں کہ ڈی سی آفس جانا ہے کس مجسٹریٹ کے پاس جانا ہے یا کس وزیر کے پاس! تو دراصل اس قسم کے لوگ میرے پاس آتے ہیں۔اپنے مسائل سے مجھے آگاہ کرتے ہیں۔ چنانچہ میں ان کی رہنمائی کر دیتی ہوں کہ ان کا کام کہاں ہو سکتا ہے لیکن یہ بات واضح کر دوں کہ میں قانونی حدود میں رہتے ہوئے ہی ان کی مدد کر سکتی ہوں۔کسی بھی غلط اور ناجائز کام کے سلسلے میں کسی کی مدد نہیں کرتی۔ اس سلسلے میں میری کوئی دوست ہو یا سہیلی میں کسی کے ساتھ بھی امتیازی سلوک نہیں برتتی۔صحیح قسم کے ضرورت مند لوگوں کو متعلقہ افسروں کے پاس بھیج دیتی ہوں کہ وہ عملاً ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں خلاف قانون کوئی بات نہیں کرتی۔اپنے سیکرٹریوں کو بھی میں نے اس سلسلے میں ہدایت دی ہوئی ہے۔خصوصیت کے ساتھ افسروں اور ملازموں کے تبادلوں کا جہاں تک مسئلہ ہے میں اس سلسلے میں قطعی مداخلت کرنا پسند نہیں کرتی۔ میں ایسے لوگوں کو واضح طور پر کہہ دیتی ہوں کہ تبادلے کے سلسلے میں قطعی مدد نہیں کروں گی۔بعض لوگ تو یہاں تک بھی کہہ دیتے

ہیں کہ دوسرے ایم این اے اور ایم پی اے تو یہ کام کرتے ہیں اور آپ تو وزیراعظم کی بیگم ہیں۔ آپ کے ایک لفظ یا ایک دستخط سے کون سا کام ہے جو نہیں ہو سکتا، تو میں انہیں جواب میں یہ کہہ دیتی ہوں کہ ایم این اے اور ایم پی اے کا اثر ورسوخ بیشک زیادہ ہوگا۔ لیکن کم از کم مجھ سے اس قسم کے کام کی توقع نہیں ہونی چاہیے۔ میں نہ تو لوگوں کے تبادلوں میں دلچسپی رکھتی ہوں نہ ہی تھرڈ اور سیکنڈ ڈویژن کے طلباء کو کالجوں میں داخل کرانے کے لیے کسی قسم کی سفارش کرتی ہوں۔ میں ان سب باتوں کو ناجائز اور غیر قانونی تصور کرتی ہوں اور مجھے اپنے اس رویے پر یقیناً فخر ہے، مجھے اس کی قطعی پرواہ نہیں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ بیگم بھٹو کے پاس تو کوئی اختیار نہیں اس لیے وہ کسی کی سفارش نہیں کرتیں۔ ادھر ایم این اے اور ایم پی اے حضرات نے ایسے مسائل کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا ہے، حالانکہ دراصل یہ وقار کی بات نہیں بلکہ محض لوگوں پر یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ دیکھو ہمارا کتنا اثر ورسوخ ہے اور ہم کتنے بااختیار ہیں لیکن میں ذاتی طور پر ان رویوں کو ناپسند کرتی ہوں۔ میں تو صاف کہہ دیتی ہوں کہ میں محض ایک سماجی کارکن ہوں اور کوئی غلط کام نہیں کر سکتی اور نہ ہی مجھ سے اس قسم کی توقع کی جانی چاہیے۔

تو اس سلسلے میں ایک اور اہم سوال یہ ہے کہ وزیراعظم بھٹو پاکستان کی تعمیر و ترقی اور خوشحالی کے لیے جو کچھ سوچتے ہیں اس کے علاوہ ملک کو ناقابلِ تسخیر بنانے میں ان کو جو مسائل درپیش ہیں کیا آپ اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈال سکیں گی؟

یہ جو مسائل درپیش ہونے کی آپ نے بات کی ہے یہ تو ہر سربراہ مملکت کا دردِ سر ہے۔ حقیقتاً ان مسائل کی موجودگی کوئی غیر معمولی بات نہیں تاہم آپ نے ملک کی ترقی اور اس کو ناقابل تسخیر بنانے اور خوشحال بنانے کی جو بات کی ہے، ایک طرح سے یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد سے لوگوں کے ذہن میں بالعموم یہی سوال گھوم رہا ہے کہ پاکستان قائم رہے گا یا نہیں؟ لیکن مجھے پورا بھروسہ ہے کہ پاکستان قائم رہے گا اور ضرور رہے گا،

لیکن اس حقیقت کو تسلیم کیا جانا ضروری ہے کہ ملک صرف جغرافیائی حدود کا ہی نام نہیں بلکہ اس کی بقاء اور وجود کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو دراصل اس ملک کے باشندے ہوتے ہیں اور اگر ہم اپنے عوام کو معاشی طور پر خوشحال بنا دیں اور یہاں کا طبقاتی استحصال ختم کر دیں تو یقیناً اس سے ملک مضبوط ہوگا، جہاں تک ہماری فوج کا سوال ہے اس حقیقت پر میرا ایمان ہے کہ ہماری مسلح افواج دنیا کی بہترین افواج میں سے ہے۔ اس کا ثبوت ماضی کی جنگوں سے ملتا ہے۔ جن میں ہمیں اپنے سے پانچ گنا بڑی افواج کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ہمارے اور ہماری افواج کے لیے یہ بات بڑی اہم اور باعث فخر ہے۔ اس کے باوجود ہمیں اپنے دشمن کے بالمقابل زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ باہر کے دشمنوں کا تو ہمیں واضح طور پر علم ہوتا ہے لیکن اندر کے دشمن تو آستین کے سانپ ہوتے ہیں کہ موقع ملتے ہی ڈس لیتے ہیں لہٰذا ایک اچھی اور سمجھدار حکومت کو باہر اور اندر دونوں دشمنوں سے پوری طرح چوکنا اور خبردار رہنا پڑتا ہے اور میرے نزدیک حکومت کے ساتھ ساتھ یہ ذمہ داری عوام کی ہے۔

آپ نے اپنی نجی اور قومی زندگی کے مابین قابل رشک توازن قائم کیا ہے، آپ کے نزدیک دوسری پاکستانی خواتین اس طرح کا توازن کیسے قائم کر سکتی ہیں؟

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستانی خواتین میں ملک کے لیے کام کرنے کا ازحد شوق و جذبہ موجود ہے لیکن ان میں سے اکثر کو یہ علم نہیں کہ اس شوق اور جذبے کی تکمیل کس طور پر کریں۔ اس کا حل یہ ہے کہ وہ اپنے وزیراعظم بھٹو کی پیروی کریں۔ میں یہ بات اس لیے نہیں کہہ رہی ہوں کہ وزیراعظم بھٹو میرے شوہر ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت قابل وزیراعظم ہیں۔ کبھی کبھی میں یہ بھی سوچا کرتی ہوں کہ آئندہ انتخابات کے بعد جو انتخابات ہوں گے ہو سکتا ہے کہ ہم اس میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمیں اپوزیشن میں بیٹھنا پڑے گا۔ اس لیے کہ جمہوری نظام میں ہر سیاسی جماعت کو بہر حال اس صورتحال سے

واسطہ پڑتا ہے۔ چنانچہ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مرد ہو یا عورت! اپنے ووٹوں سے جنھوں نے بڑی اکثریت کے ساتھ اپنے قائد کو چنا ہے تو ان پر مکمل فرض عائد ہوتا ہے کہ حکومت کی پالیسیون میں اس قائد سے مکمل تعاون کریں اور اس کی باتوں پر کان دھرنا چاہیے اور ان پر عمل کرنا چاہیے۔ بالفرض اگر انہیں اپنے قائد کی کسی تجویز سے اتفاق نہ بھی ہو تو اس کی راہ میں روڑے اٹکانے اور اسے غیر ضروری مشکلات میں مبتلا کرنے کا بہر حال کوئی جواز نہیں ہے، باالفاظ دیگر انہیں منفی ردعمل ہونے کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

میکسیکو میں منعقد ہونے والی خواتین کی عالمی کانفرنس میں آپ کو نائب صدر منتخب کیا گیا ہے جو کہ واقعی ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اعزاز بین الاقوامی سطح پر پاکستانی خواتین کی کارکردگی کا ایک طرح سے آغاز ہے۔ کیا آپ اس سے اتفاق کریں گی کہ اس طرح پاکستانی خواتین اب بین الاقوامی امور میں زیادہ اہم کردار ادا کرسکیں گی؟

بے شک! آپ درست کہتے ہیں، لیکن سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں پاکستانی خواتین کی نئی نسل کو ہی نہیں بلکہ پرانی نسل کو بھی تعلیم سے بہرہ ور کرنا پڑے گا۔ میرے نزدیک پاکستان میں محض خواتین کا ہی مسئلہ نہیں بلکہ مردوں کی سطح پر بھی تعلیم بالغاں کی اشد ضرورت ہے۔ اس لیے کہ جب تک مرد و عورت دونوں تعلیم یافتہ نہ ہوں زندگی میں توازن ناممکن ہے۔ یہ جو خواتین کا عالمی سال منایا جارہا ہے اس کے بارے میں بھی بہت سے لوگ معترض ہیں کہ آخر اس کا فائدہ ہی کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کانفرنس نے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ خواتین کے کچھ حقوق بھی ہوتے ہیں اور مردوں کے مساوی ہوتے ہیں چنانچہ دوسرے ملکوں کی خواتین کی طرح پاکستان میں رہنے والی عورتوں کو اس حقیقت سے بھی آگاہ ہونے میں مدد ملی ہے کہ ان کے بھی یقیناً کچھ حقوق ہیں۔ اب ان کو یہ پتہ چلا ہے کہ وہ بھی انسان ہیں۔ وہ بھی دل و دماغ رکھتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب تمام پاکستانی خواتین میں بیداری آگئی ہے۔ فروری اور مارچ کے

دوران اکثر خواتین یہی کہا کرتی تھیں کہ ہم تو بالکل خوش ہیں۔ ہماری گھریلو زندگی ٹھیک ٹھاک ہے۔ بچے پیدا کرتی ہیں اور ان کی پرورش بھی کرتی ہیں۔ کھانا پکاتے ہیں، کھاتے ہیں، بس یہی تو ہمارا کام ہے، یہی تو ذمہ داری ہے، لیکن بعد میں انہیں عورتوں میں سے بعض نے تسلیم کیا کہ آپ ٹھیک کہتی تھیں۔ ہم تو ان پڑھ ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں تو ان کا نام بھی نہیں رکھ سکتے۔ اگر لڑکی کا کوئی خوبصورت نام رکھ لیں تو مرد کہتے ہیں تم کون ہو نام رکھنے والی! سو اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی عورتوں کو بولنے کا حق حاصل نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ قطعی نامناسب تھا۔ یہی مرد جب چھوٹی عمروں میں ہوتے ہیں تو سب کچھ ماں سے ہی سیکھتے ہیں لیکن جب یہ بڑے ہو جاتے ہیں تو عورت کو جاہل اور ناکارہ گردانتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ یہ بات کہی ہے کہ ہم عورتیں مردوں کے خلاف نہیں ہیں یعنی جب عورت کے حقوق کی بات ہوتی ہے تو یہ مردوں کے خلاف نہیں ہوتی بلکہ ہم تو مردوں سے محبت کرتے ہیں۔ جب مرد ہمارا باپ ہوتا ہے تو ہم اس کی عزت کرتے ہیں۔ دراصل دادا، باپ، بیٹے، شوہر یہی مرد ہی تو ہیں ہم ان کے خلاف کیسے بات کر سکتے ہیں۔ ہم تو صرف اتنا کہتے ہیں کہ ہماری بھی تو سنو! اگر عورت خانہ داری اور بچوں کو پالنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام بھی کرنا چاہتی ہے تو آپ اسے کیوں روکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی بھی تو سنو، ان کو بھی تو جائز حق دو۔

میرا آخری سوال بھی کچھ کم اہم نہیں۔ آپ پاکستان کی خاتون اول بھی ہیں۔ شفیق ماں بھی اور سیاسی طور پر بھی آپ کی حیثیت مسلم ہے، آپ کی شخصیت میں یہ تینوں خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں۔ اس صورت میں آپ آج کی نئی پود، نئی نسل جو جوانی کے مرحلوں میں قدم رکھ رہی ہے ملک کی تعمیر نو کے لیے اس کو کیا پیغام دینا پسند کریں گی؟

میں تو نئی نسل اور نئی پود کے ذہن میں پوری قوت کے ساتھ یہ بات ڈالنا چاہتی ہوں کہ ہم پاکستانی ہیں اور پاکستان ہی ہمارے لیے سب کچھ ہے اور یہ کہ پاکستان ہی دراصل ہماری

زندگی ہے۔ ہم اول و آخر پاکستانی ہیں۔ نئی نسل کے ذہن میں جو یہ باتیں بٹھائی گئی ہیں کہ وہ مہاجر ہیں، سندھی، بلوچ، یا پٹھان ہیں۔ یہ بالکل غلط باتیں ہیں ہم سب سے پہلے پاکستانی ہیں اور بعد میں کچھ اور۔ پاکستان ایک نیا ملک ہے اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنا نئی نسل کا فرض ہے اس کے علاوہ اگر کوئی کچھ بات کرتا ہے تو مجھے اس کا بہت افسوس ہوتا ہے ہمیں صرف پاکستان، پاکستان اور پاکستان کی بات کرنی چاہیے۔

جو لڑکی پوچھے اندرون ملک پوچھے یا بیرون ملک پوچھے یا کوئی غیر ملکی پوچھے آپ کہاں کے ہیں، کہاں کے رہنے والے ہیں۔ وہ صرف یہی لفظ کہیں کہ پاکستان کا رہنے والا ہوں۔

ہفت روزہ ''نصرت'' کراچی 1975ء

ذوالفقار علی بھٹو
کی گردن پر پھانسی کا کوئی نشان نہیں تھا

حامد میر

سر شاہنواز بھٹو اور مرزا احمد اصفہانی آپس میں دوست تھے۔ دونوں کے گھر کلفٹن کراچی میں قریب قریب واقع تھے۔ سر شاہنواز بھٹو کی بیٹی منور الاسلام اور مرزا احمد اصفہانی کی بیٹی نصرت اصفہانی بھی آپس میں سہیلیاں بن چکی تھیں۔ اس دوران منور الاسلام کی شادی طے پا گئی تو ان کے بھائی ذوالفقار علی بھٹو بہن کی شادی میں شرکت کے لیے آکسفورڈ سے کراچی آئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی شادی بچپن میں نواب احمد خان بھٹو کی صاحبزادی شیریں امیر بیگم سے ہو چکی تھی۔ شیریں امیر بیگم عمر میں ذوالفقار علی بھٹو سے بہت بڑی تھیں۔ شیریں امیر بیگم کے بطن سے کوئی اولاد نہیں تھی لہٰذا انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو سے اپنی بہن منور الاسلام کی سہیلی نصرت اصفہانی سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ نصرت اصفہانی جانتی تھیں کہ ذوالفقار علی بھٹو پہلے سے شادی شدہ ہیں لیکن یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ شیریں امیر بیگم کو بھٹو کی دوسری شادی پر کوئی اعتراض نہیں، نصرت اصفہانی نے ہاں کر دی۔

1952ء میں نصرت اصفہانی کی ذوالفقار علی بھٹو سے شادی ہو گئی۔ نصرت اصفہانی

شادی کے بعد نصرت بھٹو بن گئیں۔ ذوالفقار علی بھٹو اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے واپس برطانیہ گئے تو نصرت بھٹو کو بھی ساتھ لے گئے۔ 1954ء میں نصرت بھٹو اپنے خاوند کے ہمراہ واپس پاکستان آ گئیں۔ پاکستان آنے کے بعد ان کے خاوند ایوب خان کی کابینہ میں شامل ہوئے۔ بعدازاں حزب اختلاف میں چلے گئے اور پھر پاکستان کے وزیراعظم بن گئے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیراعظم تھے تو بیگم نصرت بھٹو کو ''خاتون اول'' کہا جاتا تھا۔ پھر جب مارشل لاء نافذ ہوا اور ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا تو بیگم نصرت بھٹو بھی گرفتار ہو گئیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کی موت کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اصرار پر بیگم نصرت بھٹو پارٹی کی چیئر پرسن بن گئیں۔ 1988ء میں جب پیپلز پارٹی دوبارہ برسراقتدار آئی تو بیگم نصرت بھٹو سینئر وزیر کی حیثیت سے حکومت میں شامل تھیں۔ 1990ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمے کے بعد دوبارہ انتخابات ہوئے تو بیگم نصرت بھٹو دوسری دفعہ لاڑکانہ سے رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئیں۔ بیگم نصرت بھٹو بدستور پی پی پی کی چیئر پرسن ہیں۔ گزشتہ دنوں وہ لاہور آئیں تو بیگم نادر خان خاکوانی کی رہائش گاہ پر ''جنگ'' نے ان کے ساتھ ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا۔ اس نشست میں ہونے والی گفتگو کے دوران جب ذوالفقار علی بھٹو کا بار بار ذکر آیا تو بیگم نصرت بھٹو کی آنکھوں سے آنسو نکلے۔ اس کے باوجود انہوں نے بڑے عزم اور حوصلے کے ساتھ ہمارے تمام سوالات کے جواب دیئے۔ ان کے ساتھ ہونے والی گفتگو کی تفصیل درج ذیل ہے۔

جنگ......بیگم صاحبہ آپ پی پی پی کی چیئر پرسن ہیں۔ پی پی پی نے ایوب خان، یحییٰ خان اور ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف مزاحمت کی ہے۔ لیکن پی پی پی کے مخالفین کا موقف ہے کہ خود ذوالفقار علی بھٹو ایوب خان کے مارشل لاء کی پیداوار تھے کیونکہ وہ سب سے پہلے ایوب خان کی کابینہ میں شامل ہوئے تھے کیا آپ یہ بتائیں گی کہ ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان کی کابینہ میں کیوں شمولیت اختیار کیا۔

بیگم نصرت بھٹو...... بڑا اچھا سوال ہے۔ اسکا جواب بھی کچھ تفصیل کے ساتھ دینا

پڑے گا۔ آپ کو پتہ ہوگا کہ سکندر مرزا اور سر شاہنواز بھٹو کی آپس میں دوستی تھی۔ ایک دفعہ سکندر مرزا بھٹو خاندان کی دعوت پر اندرون سندھ میں شکار کھیلنے آئے۔ یہ 1955ء کی بات ہے یہاں پر سکندر مرزا اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان ملکی وغیر ملکی معاملات پر تفصیل سے گفتگو ہوئی۔ جب سکندر مرزا کو پتہ چلا کہ ذوالفقار علی بھٹو یونیورسٹی آف ساؤتھمٹن میں بین الاقوامی قانون کے استاد رہے ہیں تو وہ بڑے متاثر ہوئے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے سکندر مرزا سے کہا کہ مسئلہ کشمیر پر پاکستان کا موقف کمزور ہے۔ انہوں نے سکندر مرزا کو بہت سے مشورے دیئے۔ چنانچہ سکندر مرزا نے فیصلہ کیا کہ مسئلہ کشمیر پر بحث کے لیے ذوالفقار علی بھٹو کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے اجلاس میں بھیجا جانا چاہیے۔ چنانچہ سکندر مرزا نے اپنے وزیراعظم چودھری محمد علی کو ہدایت کی کہ ذوالفقار علی بھٹو کو سلامتی کونسل میں بھیجا جائے۔ چودھری محمد علی نے بھٹو صاحب کو بلایا اور ان سے باتیں کیں۔ چودھری محمد علی نے محسوس کیا کہ اس نوجوان کو اگر سلامتی کونسل میں بھیج دیا تو یہ واقعی کچھ کر دکھائے گا اور ہماری اہمیت کم ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے بھٹو صاحب کو سلامتی کونسل میں نہیں بھیجا۔ اس دوران چودھری محمد علی کی جگہ حسین شہید سہروردی وزیراعظم بن گئے۔ حسین شہید سہروردی نے بھٹو صاحب کو عوامی لیگ میں شامل کرنے کی کوشش کی۔

جب بھٹو صاحب نے انکار کر دیا تو سہروردی نے بھی انہیں اقوام متحدہ میں نہ بھیجا۔ بھٹو صاحب ان دنوں بین الاقوامی سیاست پر مختلف جرائد میں مضامین لکھا کرتے تھے اور حکومت میں شامل افراد ان سے مشورے لینے آتے تھے۔ 1957ء میں کراچی میونسپل کارپوریشن کو ختم کر دیا گیا۔ سکندر مرزا نے بھٹو صاحب کو پیشکش کی کہ وہ کارپوریشن کے سربراہ بن کر اس کی تشکیل نو کریں۔ لیکن بھٹو صاحب نے انکار کر دیا اور کہا کہ کارپوریشن ایک جمہوری ادارہ ہے۔ اس کا سربراہ بھی جمہوری عمل کے ذریعہ بننا چاہیے۔ میں غیر جمہوری طریقے سے کارپوریشن کا سربراہ نہیں بن سکتا۔ سکندر مرزا کو بھٹو کا انکار بھی پسند آیا۔ چنانچہ سکندر مرزا نے حسین شہید سہروردی سے مشورہ کیا اور انہیں رضامند کرنے کے بعد بھٹو صاحب کو اقوام متحدہ میں بھیج دیا۔

25 اکتوبر 1957ء کو ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام متحدہ میں عالمی امن کی اہمیت وضرورت پر ایک طویل تقریر کی۔ غیر ملکی ذرائع ابلاغ نے پہلی دفعہ اقوام متحدہ میں کسی پاکستانی مندوب کی تقریر کو اہمیت دی۔ 17 مارچ 1958ء کو بھٹو صاحب نے اقوام متحدہ کی خصوصی کمیٹی برائے سمندری قوانین سے خطاب کیا اور کمیٹی نے بھٹو صاحب کی پیش کردہ تجاویز پر فوری عمل درآمد کی سفارش کر دی۔ لہٰذا ایوب خان کے مارشل لاء سے قبل ہی ذوالفقار علی بھٹو اپنی قابلیت کا لوہا منوا چکے تھے۔ بھٹو صاحب حکومت کی ضرورت بن چکے تھے۔ اکتوبر 1958ء میں ایوب خان اقتدار میں آئے تو انہوں نے بھٹو صاحب کو کابینہ میں شمولیت کی پیشکش کی۔ بھٹو صاحب نے انہیں بتایا کہ میں غیر جمہوری طریقے سے کوئی بھی عہدہ حاصل کرنے میں یقین نہیں رکھتا۔ ایوب خان نے انہیں کہا کہ ملک کو آپ کی صلاحیتوں کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ بھٹو صاحب نے شرط پیش کی کہ اگر آپ مستقبل قریب میں انتخابات کا وعدہ کریں تو میں آپ کی حکومت میں شامل ہو جاتا ہوں۔ ایوب خان نے بھٹو سے وعدہ کیا کہ وہ مناسب وقت پر انتخابات کروائیں گے۔ چنانچہ اس وعدے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو وزیر تجارت کی حیثیت سے کابینہ میں شامل ہوئے۔ بعد ازاں انہیں قدرتی وسائل و ایٹمی توانائی کا وزیر بنایا گیا۔ ان دنوں وزارتوں کے دوران ذوالفقار علی بھٹو اقوام متحدہ میں بھی پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ انہوں نے خود کو پاکستان کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا اور یہ بھٹو صاحب کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کا اثر تھا کہ ایوب خان کو بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت انتخابات کروانے پڑے۔ اگر بھٹو صاحب غیر جمہوری اندازِ فکر رکھتے تو سکندر مرزا کی پیشکش قبول کر کے کراچی میونسپل کارپوریشن کے سربراہ بن جاتے۔

جنگ......1963ء میں محمد علی بوگرہ کی وفات کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو وزیر خارجہ بنایا گیا لیکن 1966ء میں انہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیدیا۔ ایوب خان کے ساتھ ان کے اختلافات کی کیا وجہ تھی؟

بیگم نصرت بھٹو...... ذوالفقار علی بھٹو نے معاہدہ تاشقند پر دستخط کرنے کی مخالفت کی تھی۔ ان کا موقف تھا کہ مسئلہ کشمیر حل کیے بغیر بھارت کے ساتھ دوستی نہیں کرنی چاہیے۔ ذوالفقار علی بھٹو مسئلہ کشمیر کو پاکستان کی سلامتی کے ساتھ مشروط سمجھتے تھے لہٰذا انہوں نے اس مسئلے پر اختلاف کے باعث وزارت خارجہ سے استعفیٰ دیدیا۔ آج کل کے وزیر تو صدر یا وزیر اعظم سے ہزار اختلافات کے باوجود استعفیٰ نہیں دیتے۔

جنگ...... بعض حلقے ذوالفقار علی بھٹو پر پاکستان توڑنے کا الزام لگاتے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''ادھر تم ادھر ہم'' کا نعرہ بھٹو صاحب نے پاکستان توڑنے کے لیے لگایا تھا۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا موقف ہے۔

بیگم نصرت بھٹو...... دراصل جو قوتیں پاکستان کے دولخت ہونے کی ذمہ دار ہیں انہیں قوتوں نے پاکستان توڑنے کا الزام ہم پر لگایا ہے۔ یہ الزام لگانے والے تاریخ کو دھوکہ نہیں دے سکتے اور نہ ہی اصل حقائق کو جھٹلا سکتے ہیں۔ 1966ء میں جب شیخ مجیب الرحمٰن نے چھ نکات پیش کیے تو ذوالفقار علی بھٹو نے فوراً بیان دیا کہ اس مسئلے کو بات چیت کے ذریعہ حل کر لیا جائے ورنہ پاکستان کی سلامتی کو خطرات لاحق ہو جائیں گے۔ لیکن ایوب خان نے چھ نکات کو بالکل اہمیت نہ دی۔ ایوب خان کی کابینہ میں سابق چیف جسٹس محمد منیر بھی شامل تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''فرام جناح ٹو ضیاء'' میں لکھا ہے کہ وہ ایوب خان کی اجازت سے بنگالی لیڈروں کے ساتھ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان علیحدگی یا کنفیڈریشن قائم کرنے کے لیے مذاکرات کرتے رہے۔ جسٹس منیر کی کتاب پر اسی لیے ضیاء دور میں پابندی لگادی گئی تھی۔

متحدہ پاکستان کے خلاف ہونے والی سازشوں کو ذوالفقار علی بھٹو نے 1967ء میں بے نقاب کر دیا تھا۔ انہوں نے ''متھ آف انڈی پینڈنس'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں بتایا کہ ہندوستان نے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کرنے کی سازش تیار کر لی ہے اور اس مقصد کے تحت مشرقی پاکستان میں گڑبڑ پھیلائی جائے گی۔ بھٹو صاحب نے یہ بھی واضح طور

پر لکھا تھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد مغربی پاکستان میں علیحدگی کی تحریکیں جنم لیں گی۔ 1967ء ہی میں اگر تلہ سازش کیس بھی سامنے آیا جس میں شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کیا گیا۔1969ء میں مجیب کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ انہی دنوں حکومت نے نوابزادہ نصر اللہ اور دیگر سیاسی رہنماؤں کے ساتھ ایک گول میز کانفرنس کا اہتمام کیا۔ بھٹو صاحب کا موقف تھا کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ اس صورت میں بیٹھیں گے اگر وہ چھ نکات میں لچک پیدا کریں کیونکہ چھ نکات پاکستان کے ساتھ علیحدگی کے مترادف ہیں

لیکن شیخ مجیب نے کوئی لچک نہ پیدا کی لہٰذا بھٹو صاحب اور مولانا بھاشانی نے کانفرنس کا بائیکاٹ کیا۔ شیخ مجیب کانفرنس میں شریک ہوئے حکومت بھی کانفرنس میں شریک ہوئی۔ یعنی جملہ حکومت نے چھ نکات تسلیم کر لیے تھے۔ حکومت نے پہلے خود ہی شیخ مجیب کو اگر تلہ سازش میں گرفتار کیا اور غداری کا الزام لگایا اور پھر اس پر قائم مقدمے کی سماعت کیے بغیر ہی اسے رہا کر دیا۔ ظاہر ہے شیخ مجیب الرحمٰن ہیرو بن گیا اور مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے 1970ء کے انتخابات میں مشرقی پاکستان سے اکثریت حاصل کی اور جب قومی اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ کا اعلان کیا گیا تو عوامی لیگ نے چھ نکات کی بنیاد پر آئین کا مسودہ بھی تیار کر لیا۔ عوامی لیگ کے تیار کردہ آئین کے تحت مشرقی پاکستان کا نام بنگلہ دیش تھا جس کو ایک خودمختار ریاست کی حیثیت حاصل تھی جس کی کرنسی بھی علیحدہ تھی۔ ظاہر ہے بھٹو صاحب جانتے تھے کہ عوامی لیگ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر قومی اسمبلی میں ایک ایسا آئین منظور کروا لے گی جس کے بعد پاکستان دولخت ہو جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا مطالبہ کیا اور مجیب الرحمٰن کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کیا تاکہ پاکستان کو ٹوٹنے سے بچایا جائے۔ اگر بھٹو صاحب اسمبلی میں چلے جاتے تو مخالفین کہتے کہ اسمبلی میں کیوں گئے۔ جہاں تک ''ادھر تم ادھر ہم'' کے نعرے کا تعلق ہے تو یہ لاہور کے روزنامہ ''آزاد'' کی سرخی تھی۔ جو بھٹو صاحب کی تقریر کے سیاق وسباق سے مختلف تھی۔ میں نے اخبار دیکھا تھا۔

اسی سرخی کے نیچے ایک اور سرخی میں یہ بھی شامل تھا کہ پاکستان متحد رہے گا۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ روزنامہ ''آزاد'' کو شیخ مجیب اور ولی خان کے پیسے سے چلایا جاتا تھا۔ بھٹو صاحب نے اس سُرخی کی اگلے روز تردید کر دی تھی۔ 22 مارچ 1971ء کو بھٹو صاحب نے ایوان صدر ڈھاکہ میں شیخ مجیب کے ساتھ مذاکرات کیے اور اسے سمجھایا کہ وہ پاکستان نہ توڑے لیکن وہ نہیں مانا۔ اس دوران مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن ہو گیا اور نومبر 1971ء میں بھارت نے حملہ کر دیا۔ کئی سال سے جو فضا بن گئی تھی اس کے بعد مشرقی پاکستان کے لوگ پاکستانی فوج کے ساتھ نہیں تھے لہٰذا جنگ میں شکست ہوئی اور بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آیا۔ بھٹو صاحب نے تو اسمبلی کا اجلاس ملتوی کروا کر پاکستان کو قومی اسمبلی میں ٹوٹنے سے بچایا اور مذاکرات کے لیے وقت حاصل کیا تھا۔ بھٹو صاحب پر پاکستان توڑنے کا الزام لگانا قوم سے بددیانتی ہے۔ بھٹو پر پاکستان توڑنے کا الزام لگانے والے بتائیں کہ ایٹمی پروگرام نے کس کی جان لی۔

جنگ...... بھٹو صاحب نے حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ کیوں نہ شائع کی؟

بیگم نصرت بھٹو...... اس سوال کا جواب ذوالفقار علی بھٹو کی جیل میں تحریر کردہ کتاب ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' میں موجود ہے۔ کتاب میں انہوں نے لکھا کہ حمودالرحمٰن کمیشن کی رپورٹ پر میری رائے زنی مسلح افواج کی شہرت کو نقصان پہنچا سکتی ہے لیکن میں پھر بھی رائے زنی سے اجتناب کرتا ہوں۔ بھٹو صاحب نے لکھا ہے کہ انہیں سینئر فوجی افسران نے مشورہ دیا تھا کہ کمیشن کی رپورٹ شائع نہ کی جائے کیونکہ فوج کا وقار مجروح ہو گا۔ لہٰذا بھٹو صاحب نے عوام کے اصرار کے باوجود رپورٹ شائع نہ کی تاکہ فوج کا وقار مجروح نہ ہو۔

جنگ...... بھٹو صاحب سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کیوں بنے!

بیگم نصرت بھٹو...... جب انہوں نے حکومت سنبھالی تو ملک میں مارشل لاء تھا ظاہر ہے مارشل لاء ہٹانے کے لیے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تو بننا تھا۔ لہٰذا مارشل لاء ختم کرنے کے لیے انہوں نے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا مارشل لاء ہٹایا اور انتہائی قلیل مدت میں قوم کو 1973ء کا

آئین بھی دیدیا۔

جنگ......ایک موقف یہ بھی ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی نیشنلائزیشن سے ملکی معیشت کو زبردست نقصان پہنچا۔اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گی؟

بیگم نصرت بھٹو...... نیشنلائزیشن اس لیے کی گئی کیونکہ پاکستانی معیشت پر چند خاندانوں کی اجارہ داری تھی۔نیشلائزیشن کے کچھ عرصہ کے بعد یہ فیصلہ کرلیا گیا تھا کہ چھوٹی صنعتیں نجی شعبے میں رہنے دی جائیں اورصرف بڑی صنعتوں پرحکومت کا کنٹرول ہونا چاہیے ہم نے نیشنلائزیشن کے ذریعہ مزدوروں کوان کے حقوق دیئے مہنگائی میں کمی کی تعلیمی اداروں کواس لیے نیشنلائز کیا کیونکہ تعلیم سستی ہوجائے نیشنلائزیشن کی پالیسی کا بیڑا غرق تو جنرل ضیاء الحق کے گیارہ سال کے دوران ہوا۔ضیاء الحق نے آئین معطل کر دیا انہوں نے سرکاری صنعتوں میں ایسے من پسند افراد کوسربراہ بنایا جونااہل تھے لہٰذا سرکاری صنعتیں خسارے کا شکار ہوگئیں سرکاری صنعتوں کا خسارہ حکومت کے خزانے سے پورا کیا جاتا رہا یہ ساری تباہی ضیا دور میں ہوئی۔1988ء میں ہم دوبارہ حکومت میں آئے تو ہم نے پرائیویٹائزیشن کی پالیسی متعارف کروائی جس کے تحت مزدوروں کوبھی صنعتوں میں حصہ دار بنایا تھالیکن ہماری حکومت ختم کرنے کے بعدنواز شریف کواقتدار میں لایا گیا۔ان کی پرائیویٹائزیشن آپ کے سامنے ہے۔سیمنٹ فیکٹریاں فروخت کیں تو سیمنٹ مہنگا ہوگیا گھی ملیں فروخت کیں تو گھی مہنگا ہوگیا۔رائس ملیں فروخت کی تو چاول مہنگا ہوگیا پرائیویٹائزیشن کے نام پرلوٹ مار کی جارہی ہے۔

جنگ......ذوالفقار علی بھٹو کے آخری دنوں اور آخری لمحات کے حوالے سے گزشتہ چند ماہ میں دو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں دونوں کتابیں جنگ پبلشرز نے شائع کیں کرنل ریٹائرڈ رفیع الدین کی کتاب ''بھٹو کے آخری 323 دن'' میں بتایا گیا ہے کہ بھٹو صاحب کو پھانسی دی گئی تھی جبکہ صادق جعفری کی کتاب ''کیا بھٹو کو پھانسی سے پہلے قتل کیا گیا؟'' سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بھٹو صاحب کو پھانسی سے پہلے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔یہ سوال یقیناً آپ کے لیے تکلیف دہ

ہے لیکن میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اصل حقیقت کیا ہے کیا بھٹو صاحب کو واقعی پھانسی سے پہلے ہی مار دیا گیا تھا؟

بیگم نصرت بھٹو......پہلی بات تو یہ ہے کہ امریکہ کے سابق اٹارنی جنرل رمزے کلارک اور سری لنکا کے سابق چیف جسٹس راجہ رتنم سمیت متعدد ممتاز ماہرین قانون ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کے فیصلے پر تنقید کر چکے ہیں۔ جن لوگوں نے بھٹو صاحب کا چہرہ دیکھا ان کا کہنا ہے کہ ان کی گردن اور اگلے پر پھانسی کا کوئی نشان نہیں تھا اور نہ ہی گردن ٹوٹی ہوئی تھی۔ بھٹو صاحب کی انگوٹھی بھی ان کے ہاتھ میں نہ تھی جو شاید مزاحمت کے دوران ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

جنگ......بھٹو صاحب پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے دور میں سرحد اور بلوچستان کی صوبائی حکومتوں کو برطرف کیا، نیز بلوچستان میں فوجی ایکشن کیا، اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گی؟

بیگم نصرت بھٹو......1972ء میں لاہور میں سمگلنگ کی روک تھام کے لیے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں چاروں صوبوں کی حکومتوں کو بلایا گیا تھا۔ حکومت سرحد نے اس اجلاس میں کوئی نمائندہ نہ بھیجا۔ بعدازاں سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں نے زرعی اجناس کی افغانستان سمگلنگ کو روکنے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ وزیراعلیٰ بلوچستان عطاء اللہ مینگل نے کوسٹ گارڈز کو صوبائی حکومت کی اجازت کے بغیر سمگلروں کو گرفتار کرنے سے منع کر دیا۔ وزیراعلیٰ بلوچستان نے آئی جی بلوچستان کو حکم دیا کہ ان کے قبیلے کے افراد کو سرکاری رائفلیں دی جائیں تاکہ وہ لسبیلہ میں اپنے مخالف جاموٹ قبیلے پر حملہ کریں۔ آئی جی نے انکار کر دیا تو اسے برطرف کر دیا گیا۔ بعدازاں وزیراعلیٰ مینگل نے اپنے قبیلے کے لشکر کو پولیس کا اسلحہ دلوایا۔ اسی اسلحے سے بعد میں پٹ فیڈر کے علاقے میں نہتے غیر بلوچی افراد کو قتل کیا گیا۔ مینگل قبیلے کے لشکر نے لسبیلہ میں جاموٹ قبیلے کے مکانات جلا دیئے۔ لہٰذا جام آف لسبیلہ نے وفاقی حکومت سے مدد کی درخواست کی، کیونکہ جاموٹ قبیلے کے افراد نے بلوچستان حکومت کے ظلم وستم سے تنگ آ کر

پہاڑوں میں پناہ لی تھی۔ ان پناہ گزینوں کو ہیلی کاپٹروں کے ذریعہ خوراک پہنچائی گئی اور جب فوج امن وامان قائم کرنے آئی تو اس پر حملے کیے گئے، لہٰذا فوج کو بڑا آپریشن کرنا پڑا۔ فوج کو ان بلوچ سرداروں کی درخواست پر بھیجا گیا تھا جو بلوچستان حکومت کے غیض وغضب کا شکار ہو رہے تھے۔ اسی طرح سرحد میں سکولوں اور ہسپتالوں کی زمینیں کوڑیوں کے بھاؤ من پسند افراد میں تقسیم کی جا رہی تھیں اور دونوں صوبوں کی حکومتوں نے وفاقی حکومت کے خلاف کھل کر محاذ آرائی کی، لہٰذا ان صوبوں کی حکومتوں کو مجبوراً برطرف کرنا پڑا۔

جنگ...... کیا یہ سچ ہے کہ بھٹو صاحب کی حکومت میں شامل ایک وزیر رفیع رضا نے انہیں 1976ء ہی میں یہ بتا دیا تھا کہ اگر انہوں نے ایٹمی پروگرام بند نہ کیا تو ان کا انجام برا ہوگا؟

بیگم نصرت بھٹو...... جی ہاں...... بھٹو صاحب نے اس سلسلے میں اپنی آخری کتاب ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' میں ذکر کیا ہے۔ رفیع رضا نے کہا تھا کہ اگر آپ باز نہ آئے تو آپ کی حکومت بھی جائے گی اور جان بھی جائے گی۔

جنگ...... ذوالفقار علی بھٹو کا تعلق جاگیردار خاندان سے تھا لیکن انہوں نے جاگیرداری کے خلاف نعرہ لگایا اس کی کیا وجہ تھی؟

بیگم نصرت بھٹو...... بھٹو صاحب کو غریبوں سے بہت محبت تھی کیونکہ ان کی ماں لیڈی خورشید شاہنواز بھٹو کا تعلق بھی غریب خاندان سے تھا۔ سر شاہنواز کی پہلی بیوی ایک گھریلو عورت تھی انہیں ایک ایسی بیوی کی ضرورت تھی جو ان کے ساتھ شہر میں رہ سکے لہٰذا انہوں نے دوسری شادی کی ایک دفعہ بھٹو خاندان کے ایک ملازم بابو سے چائے کی ٹرے گر گئی تو بھٹو صاحب کی والدہ نے بابو کو سخت سست کہا بھٹو صاحب نے اپنی والدہ سے مطالبہ کر دیا کہ وہ بابو سے معافی مانگیں ایک دفعہ لاڑکانہ میں کچھ جونپڑیوں میں آگ لگ گئی تو بھٹو صاحب نے اپنے ہاتھوں سے آگ بجھائی۔ وہ عید کے دن فرش پر بیٹھ کر نوکروں کے ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ نوڈیرو اور لاڑکانہ میں بہت سے لڑکوں کو تعلیم کا خرچہ وہ خود برداشت کرتے رہے۔

جنگ......زرعی اصلاحات میں بھٹو خاندان نے کتنے ایکڑ زمین ہاریوں میں تقسیم کی؟

بیگم نصرت بھٹو......ہم نے تیرہ ہزار ایکڑ زمین ہاریوں میں تقسیم کی دادو میں ہماری زمینوں پر ایک خوبصورت بنگلہ بھی تھا۔ بھٹو صاحب نے یہ بنگلہ بھی ہاریوں کو دے دیا میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ یہ بنگلہ اپنے پاس رہنے دیں لیکن انہوں نے کہا نہیں غریبوں کو بھی بنگلے میں رہنے کا حق ہے پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہونے کے بعد بہت سے وڈیروں نے اپنی زمینیں ہاریوں سے چھین لیں ان پڑھ ہاریوں کو انتقال جائیداد کے قوانین سے واقفیت نہیں ہے لہٰذا دھوکے اور دھونس سے وہ اپنی زمینوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور پھر فریاد لے کر ہمارے پاس آتے ہیں ہم تو حکومت میں نہیں بس یہی کر سکتے ہیں کہ جو زمینیں ہم نے تقسیم کیں وہ زمینیں کوئی دوسرا ہاریوں سے نہ چھین سکے لوگ حکومت میں آنے کے بعد پہلے سے زیادہ دولت مند ہو جاتے ہیں اور ہم حکومت میں آنے کے بعد خود دولت تقسیم کرتے رہے اب یہ حالت ہے کہ بھٹو صاحب کا مقبرہ بنوانے کے لیے میرے پاس پیسہ نہیں ہے۔ (یہ کہتے ہوئے بیگم نصرت بھٹو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے)

جنگ......بیگم صاحبہ 1981ء میں جب پی آئی اے کا طیارہ اغواء ہوا تو میر مرتضیٰ بھٹو نے اغوا کی ذمہ داری قبول کر لی تھی لیکن بعد ازاں ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ اغوا سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا اصل حقیقت کیا ہے؟

بیگم نصرت بھٹو......میر مرتضیٰ بھٹو کا واقعی طیارے کے اغوا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ عوامی نیشنل پارٹی کے موجودہ سربراہ اجمل خٹک گواہ ہیں اجمل خٹک نے مجھے بتایا کہ جب طیارہ اغوا ہوا تو وہ کابل میں تھے۔ ڈاکٹر نجیب اللہ اس وقت افغان خفیہ تنظیم ''خاد'' کے سربراہ تھے ڈاکٹر نجیب اللہ نے اجمل خٹک کو بتایا کہ پی آئی اے کا ایک طیارہ اغوا کر کے کابل ایئر پورٹ پر لایا گیا ہے ڈاکٹر نجیب اللہ اور اجمل خٹک دونوں فوراً کابل ایئر پورٹ پر پہنچے۔ ہائی جیکروں نے مطالبہ کیا کہ ان کی ملاقات میر مرتضیٰ بھٹو سے کروائی جائے۔ ڈاکٹر نجیب اللہ نے اجمل خٹک کو بتایا کہ میر

مرتضیٰ بھٹو تو طیارے کے اغوا سے لاعلم ہے۔ چنانچہ اجمل خٹک نے میر مرتضیٰ بھٹو کو پیغام بھیجا کہ وہ ہائی جیکروں نے دھمکی دی ہے کہ اگر ان کی ملاقات مرتضیٰ سے نہ کروائی گئی تو وہ طیارے کو بم سے اڑا دیں گے۔ لہٰذا میر مرتضیٰ بھٹو مسافروں کی جان بچانے کی خاطر ہائی جیکروں سے ملنے چلا گیا اس دوران مرتضیٰ پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ طیارے کے اغوا کی ذمہ داری بھی قبول کرے دباؤ بڑھانے کے لیے طیارے کے ایک مسافر طارق رحیم کو قتل کر دیا گیا جو ذوالفقار علی بھٹو کا اے ڈی سی رہ چکا تھا طارق رحیم کے قتل پر مرتضیٰ بھٹو نے چیخ و پکار کی اور احتجاج کیا اور مسافروں کی زندگیاں بچانے کے لیے اغوا کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ پاکستانی قوم کو تو مرتضیٰ بھٹو کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ اس نے سینکڑوں مسافروں کی زندگیاں بچالیں۔ مرتضیٰ نے اپنی ساری سیاست داؤ پر لگا کر مسافروں کی زندگیاں بچائیں طیارے کو دراصل جنرل ضیاء الحق نے اغواء کروایا تھا کراچی ایئر پورٹ کے احکام کی ملی بھگت کے بغیر طیارے میں ریوالور اور دستی بم پہنچانا کیسے ممکن ہے۔ طیارہ اغوا کرنے والوں کا سرغنہ سلام اللہ ٹیپو تھا جس کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا۔ ضیاء الحق نے جماعت اسلامی کے لوگوں کو پیپلز پارٹی کے خلاف استعمال کیا اور سلام ٹیپو نے راجہ انور کے ساتھ مل کر مرتضیٰ اور شاہنواز پر قاتلانہ حملہ بھی کیا تھا ان پر کلاشنکوف کا پورا برسٹ چلایا گیا تھا لیکن وہ بچ گئے تھے۔

جنگ......شاہنواز بھٹو کے قتل میں کون ملوث تھا؟

بیگم نصرت بھٹو......ایک سازش کے تحت میرے دونوں بیٹوں کی شادی ایسی لڑکیوں سے کروائی گئی جن کا باپ ڈبل ایجنٹ تھا۔ شاہنواز کی بیوی ریحانہ اس کے قتل میں ملوث تھی شاہنواز کو اس لیے قتل کیا گیا کیونکہ وہ باپ کی طرح بہت ذہین تھا فرانس کی پولیس نے شاہنواز کے قتل کے الزام میں ریحانہ کے خلاف تحقیقات شروع کر دیں اس کا پاسپورٹ ضبط کر لیا گیا ہمیں پتہ چلا کہ وہ دونوں بہنیں فرانس کے شہر ''کانز'' سے ٹرین میں بیٹھ کر ''مارسے'' جاتی تھیں۔ وہاں انہیں ایک پاکستانی ملتا تھا جو انہیں ایک پیکٹ فراہم کرتا تھا جس میں رقم ہوتی تھی۔ اسی رقم

کی مدد سے دونوں بہنیں فرانس سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئیں۔ فرانس میں موجود بعض پاکستانیوں کے ذریعہ یہ پراپیگنڈہ بھی کروایا گیا کہ شاہنواز کو مرتضیٰ نے قتل کروایا لیکن جس رات شاہنواز کا قتل ہوا اس رات مرتضیٰ بہت سے لوگوں کے ساتھ تھا اس لیے الزام کا تیر نشانے پر نہیں بیٹھا۔

جنگ......کیا پیپلز پارٹی نے سوشلزم کا نعرہ چھوڑ دیا تھا؟

بیگم نصرت بھٹو......سوشلزم کے نعرے کا مطلب تھا غریبوں کو روٹی، کپڑا اور مکان فراہم کرنا۔ ہم آج بھی روٹی، کپڑے اور مکان کے نعرے پر قائم ہیں۔ جب تک دنیا میں غربت اور ظلم و جبر موجود ہے سوشلزم ختم نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہم نے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح متعارف کروائی تھی جو سوشل ڈیموکریسی کے زیادہ نزدیک ہے۔ بے نظیر بھٹو کا نیو سوشل کنٹریکٹ کا تصور بدلتی ہوئی ملکی و بین الاقوامی صورتحال کے عین مطابق ہے۔ پیپلز پارٹی موجودہ استحصالی نظام کی تبدیلی چاہتی ہے جو شہید بھٹو کا اصل مشن ہے۔ پاکستان کی سیاست دراصل دو قوتوں میں کشمکش کا نام ہے۔ ایک طرف بھٹو نواز ہیں اور دوسری طرف بھٹو دشمن ہیں۔ بھٹو نواز نظام کی تبدیلی چاہتے ہیں اور ایک دن یہ نظام ضرور بدلے گا۔

جنگ......آپ کو بھٹو صاحب کی کون سی عادت زیادہ پسند تھی؟

بیگم نصرت بھٹو......وہ غریب پرور اور سخی تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ بزرگوں اور صوفیاء کا بڑا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے لعل شہباز قلندرؒ اور داتا گنج بخشؒ کے مزاروں پر سونے کے دروازے لگوائے۔ نوڈیرو، گڑھی خدا بخش اور لاڑکانہ میں مسجدیں بنوائیں۔ انہیں مذہب سے بڑا لگاؤ تھا لیکن وہ مذہب کے نام پر سیاست کرنے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

جنگ......کیا کبھی مرتضیٰ بھٹو پاکستان واپس آئیں گے؟

بیگم نصرت بھٹو......اجمل خٹک، ولی خان، مصطفیٰ کھر، شیر محمد مری، خیر بخش مری اور عطاء اللہ مینگل پر بغاوت کے مقدمات تھے۔ فوج کے ساتھ مسلح لڑائی کے الزامات تھے لیکن وہ

پاکستان آئے اور انہیں کچھ نہیں کہا گیا۔ مرتضیٰ بھٹو اگر اصولوں پر سودے بازی کر لے تو واپس آ سکتا ہے، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ لاڑکانہ کی جس نشست سے میں کامیاب ہوئی ہوں اس پر میر مرتضیٰ بھٹو کا حق ہے اور ایک دن وہ اپنی نشست سے ضرور کامیاب ہوگا۔

جنگ...... کیا آپ کے داماد آصف علی زرداری حکومت کے ساتھ مفاہمت کے نتیجے میں رہا ہونا پسند کریں گے؟

بیگم نصرت بھٹو...... آصف علی زرداری ایک دلیر انسان ہے۔ حکومت ختم ہونے کے بعد تین ماہ تک وہ گرفتار نہیں ہوا۔ اگر وہ چاہتا تو ملک سے باہر جا سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس پر جھوٹے مقدمے بنائے جائیں گے اس کے باوجود وہ پاکستان میں رہا اور اس نے گرفتار ہونا پسند کیا۔ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا، لہٰذا وہ کسی سودے بازی کے تحت رہا ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

میر مرتضیٰ بھٹو سے انٹرویو

بشیر ریاض

اسلامی کانفرنس کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے صاحبزادے میر مرتضیٰ بھٹو ایک فرض شناس بیٹے اور محبِّ وطن پاکستانی شہری کی حیثیت سے اپنے والد اور پاکستان کے عظیم رہنما کی زندگی بچانے کے لیے محوسفر ہیں وہ دنیا کے کم وبیش تمام دارالحکومتوں میں گئے ہیں اور دنیا کی اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں کی ہیں۔ اس کے علاوہ لندن میں بھی انہوں نے پاکستانیوں سے رابطے کی مہم جاری رکھی۔ وہ بہت بڑے مظاہروں کے علاوہ مختلف شہروں میں پاکستانیوں کے احتجاجی مظاہروں اور دوسرے اجلاسوں میں شریک ہوئے جدوجہد کی یہ ایک طویل داستان ہے یہ مشکلات اور بلند عزائم کی کہانی ہے جسے ایک مشن کے لیے مسلسل سفر کا عنوان دیا جاسکتا ہے۔ ادھر پاکستان کے بعض اخبارات ان کے مشن اور عالمی تحریک کو دھندلانے کے فرضی اسکینڈل شائع کر رہے ہیں جو اس امر کا اعتراف ہے کہ میر مرتضیٰ بھٹو کی مہم تسلی بخش طور پر جاری ہے۔ پاکستانی اخبارات میں ایسے فرضی لوگوں کے جھوٹے بیانات بھی شائع ہوئے ہیں جن کا یہاں وجود نہیں ہے جس کی مثال تحریک پاکستان کے کسی بیرسٹر ظہور الاخلاق کی ہے اس نام کی دونوں چیزوں کا لندن میں وجود نہیں یہ اطلاعات اور من گھڑت خبریں شاید ایک نوجوان کے حوصلوں کو پس کرنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کا حصہ ہیں۔ نوجوان مرتضیٰ ان افواہوں پر ہنس کر اپنے

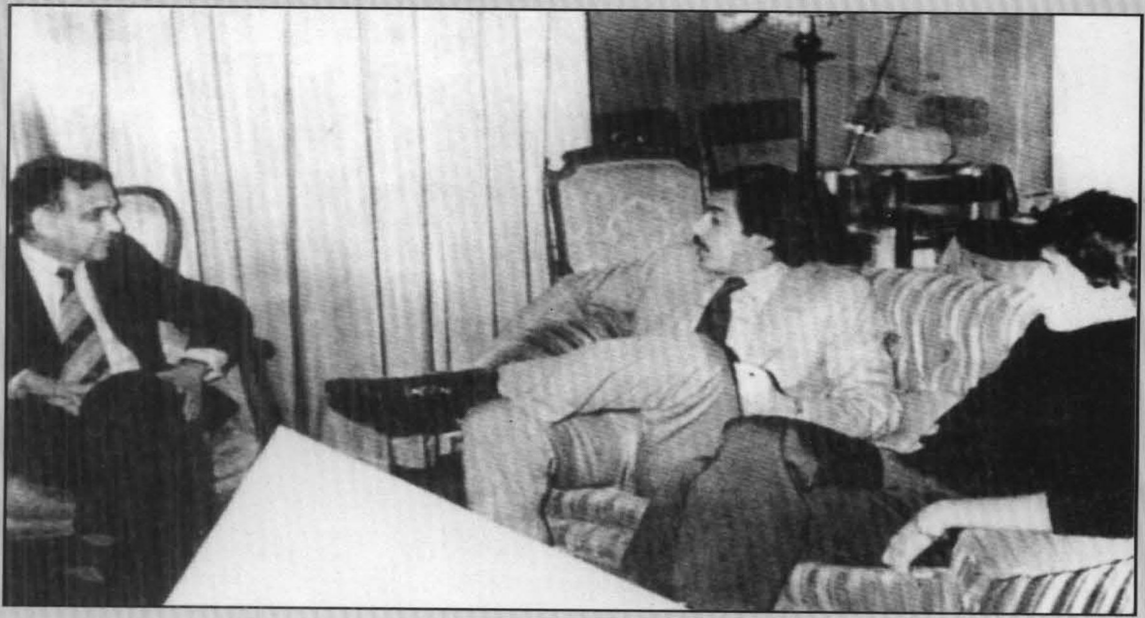

میر مرتضیٰ بھٹو، شاہنواز بھٹو اور بشیر ریاض (لندن، اپریل 1979ء)

مشن کو تغافل کا شکار ہونے نہیں دیتے انہوں نے اپنے عمل و کردار سے ایک بالغ نظر اور ذمہ دار پاکستانی کی حیثیت سے اپنی زندگی کی اہم ترین جدوجہد کو تیز کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔

31 دسمبر 78ء پاکستان کے لیے پرآشوب سال کا آخری دن تھا۔ میر مرتضیٰ بھٹو غیر ملکی دورے سے واپس لوٹے تھے اور ان سے اس سال کی مہم کے بارے میں بات چیت کرنے کے لیے سال کے آخری دن کے آخری گھنٹے طے ہوئے لاہور ہائیکورٹ کے فیصلے کے بعد سے میر مرتضیٰ بھٹو اپنے والد اور سابق وزیراعظم پاکستان کی زندگی بچانے کے لیے جو کوشش کر رہے ہیں اس کا جائزہ لیتے ہوئے میر مرتضیٰ بھٹو نے بتایا کہ ''دنیا کی جن اہم شخصیتوں سے وہ ملے ہیں ان تمام رہنماؤں نے یہی کہا ہے کہ بھٹو کے لیے ہمارے دل میں بہت زیادہ احترام اور عزت ہے۔ بھٹو صاحب کی کوششوں سے ہی ہمارے دلوں میں پاکستان کے لیے بڑی عزت ہے اور اگر بھٹو صاحب کو نقصان پہنچا تو پاکستان کے لیے اس کے نتائج بہت بُرے ہوں گے۔ ہم باتوں کو پبلک طور پر زیر بحث نہیں لا سکتے کیونکہ کئی ملاقاتیں خفیہ تھیں اور کئی وعدوں کو صیغہ راز میں رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اسی بنیاد پر کئی اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوئی ہیں اور ہم اس اعتماد اور اعتبار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اس لیے اپنی عالمی مہم کی مکمل تفصیل اس وقت ظاہر نہیں کر سکتا ہوں۔

گذشتہ سال سے جس عالمی مہم کا آغاز کیا تھا اس سلسلے میں ہماری حکمت عملی کے تین پہلو تھے جس میں سرفہرست لندن سے باہر جا کر دوست اور برادر ملکوں کے دوروں کے علاوہ پاکستان کے خیر خواہ ممالک سے رابطہ پیدا کر کے بھٹو صاحب کی جان بچانے اور حصول انصاف کے لیے دباؤ بڑھانا چنانچہ جن ملکوں میں گیا وہاں گرمجوشی اور ہمدردانہ طور پر پذیرائی کی گئی یہ بھٹو صاحب کی خارجہ پالیسی کی کامیابی اور ان کی ذاتی شخصیت کا سحر تھا کہ جن اہم شخصیتوں نے شرف باریابی بخشا وہ مجھے نہیں جانتے تھے اور ان سے میری ملاقات اس لیے نہیں ہوئی کہ بھٹو صاحب میرے والد تھے یا وہ ذاتی طور پر ان سے آشنا تھا۔ ہم ایک ایسی تحریک سے وابستہ تھے جس کا مقصد پاکستان کے واحد لیڈر کی زندگی بچانے سے اور جہاں بھی گیا تمام اہم شخصیتوں نے

ملاقات میں یہی کہا کہ ان کے دلوں میں بھٹو صاحب کے لیے از حد احترام ہے اور بھٹو صاحب کو نقصان پہنچنے سے پاکستان کے لیے اس کے نتائج بہت سنگین ہوں گے تمام لیڈروں نے اس حقیقت کا اعادہ کیا کہ ان کے دلوں میں بھٹو صاحب کی کوششوں کی بدولت پاکستان کی بہت عزت ہے۔

ہماری حکمت عملی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بھٹو صاحب کے کیس کے بارے میں پاکستان سے جو لٹریچر ہمیں موصول ہوا ہے اس کی عالمی پیمانے پر زیادہ سے زیادہ تشہیر کرنا چاہتے تھے کیونکہ بیرونی ممالک میں پچھلے ایک سال سے پاکستانی سفارتخانوں کا یہی ایک فریضہ رہ گیا ہے کہ وہ بھٹو صاحب کے خلاف ہر قسم کا غلیظ، گمراہ کن اور بے بنیاد پروپیگنڈہ لٹریچر تقسیم کریں اور اس بے سود مہم جوئی پر ملک اور قوم کا کروڑوں روپے کا قیمتی زرمبادلہ ضائع کیا گیا ہے۔ سفارتخانوں کے ذریعے حکومت جو کچھ پروپیگنڈہ کر رہی ہے۔ اگرچہ پاکستان اور غیر جانبدار مبصر اس پر یقین نہیں کرتے ہیں، لیکن چونکہ یہ لٹریچر اس قدرے بڑے پیمانے پر تقسیم ہوا ہے، اس لیے یہ ضروری تھا کہ عالمی رائے اور اندرونی ملک پاکستانی عوام کو سچائی سے آگاہ کرنے کے لیے لٹریچر جاری کیا جائے تاکہ حکومت کے گھٹیا اور غلیظ پروپیگنڈے کی حقیقت ظاہر ہو سکے اس سلسلے میں (Agony of Pakistan) کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں تعصب اور جانبداری کو بے نقاب کیا اس کی ہزاروں کاپیاں تمام دنیا میں تقسیم کیں اور اب ہم عنقریب ایک دوسری کتاب شائع کر رہے ہیں جو حکومت کے جھوٹے الزامات کا بھانڈہ پھوڑے گی۔ مزید برآں پاکستان سے ملنے والا تمام لٹریچر دنیا میں تقسیم کیا ہے، جس کی تازہ مثال بھٹو صاحب کا وہ تاریخی جواب ہے جسے انہوں نے جیل میں حکومت کے وائٹ پیپر کے جواب میں لکھا ہے، پاکستان میں اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی تھی لیکن اسے ہم نے برطانیہ، یورپ اور امریکہ کے تمام اخبارات اور قابل ذکر اہم سیاسی شخصیات تک پہنچایا اور آج کل اسے کتابی صورت میں شائع کیا ہے، بھٹو صاحب کے اس جواب کو پاکستان اور دلچسپی رکھنے والے غیر معمولی دلچسپی لے کر خرید رہے ہیں۔

پاکستانی بھائیوں اور ہم وطنوں کو باخبر رکھنے کے لیے لندن سے ''مساوات'' ویکلی جاری کیا جس میں ملک کی اہم خبریں اور عالمی پریس کا ڈائجسٹ خبرنامہ شامل ہوتا ہے۔ مساوات انگلینڈ کے شہروں کے علاوہ امریکہ، دوبئی، جرمنی، ڈنمارک، فرانس اور کینیڈا میں تقسیم کیا جاتا ہے اور پاکستانی اسے دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ ہماری اس حکمت عملی کا تیسرا پہلو پاکستان کمیونٹی سے رابطے پیدا کرنا تھا چنانچہ پاکستانی بھائیوں سے رابطے پیدا کر کے مظاہروں، جلسوں اور احتجاجی جلوسوں کا انتظام کیا گیا۔ کینیڈا، امریکہ، ڈنمارک، ناروے اور برطانیہ کے کئی شہروں میں مظاہرے ترتیب دیئے گئے اور تینوں امور میں ہمیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اس وقت میں مکمل کامیابی کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کروں گا کیونکہ یہ کامیابی اس وقت ہوگی جب بھٹو صاحب آزاد ہو کر ہم میں ہوں گے۔

اس وقت میں بڑی انکساری سے یہ کہوں گا کہ ابھی تک ہم نے جو کچھ کیا ہے اس سے میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوں، کیونکہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اور انشاء اللہ ہم جلدی یہ کر کے دکھادیں گے۔

یہاں میں پھر کہوں گا کہ ہم اپنے کام سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں اور ہم جدوجہد کو اور تیز کرتے رہیں گے، لیکن جہاں تک گورنمنٹ کا تعلق ہے، وہ عالمی مہم سے بوکھلائی ہوئی ہے۔ یہ شروع سے ہمیں ناکام کرنے کی کوشش میں خود ناکام ہوئی ہے۔ حکومت اور اس کے کارندوں کے پاس اور کوئی راستہ نہیں سوائے ہماری کردار کشی کے۔ ہم پر جھوٹے الزامات لگا کر ہمارا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یوں ہماری کوششوں کو پاکستانیوں کی نظر میں نقصان پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں لیکن بھٹو صاحب، ان کے خاندان، پارٹی اور ساتھیوں کے خلاف اس قسم کے گھٹیا حملے اس قدر کیے گئے ہیں کہ لوگوں نے ان پر اعتبار کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

جب میں نے نیویارک میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل سے ملاقات کی تو پاکستانی اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ کرٹ والڈ ہیم نے مجھے ملنے سے انکار کر دیا ہے، بھٹو صاحب نے جو

تار سیکرٹری کو دیا تھا اور خط سپرنٹنڈنٹ جیل کے نام تھا۔ ان دونوں کو میں نے سیکرٹری جنرل کو پہنچایا اور یو این کے رکن ممالک کو اس کی کاپیاں تقسیم کیں۔ مختلف رسائل و اخبارات کو یہ دستاویزات فراہم کیں جو اہم جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ حکومت نے اس مواد پر ملک میں پابندی عائد کر دی ہے لیکن ہمارے خیر خواہ ہم تک پہنچا دیتے ہیں اور اس کی تشہیر ہماری مہم کا اہم ترین حصہ ہے۔

عالمی سطح پر آپ نے جو کچھ کیا ہے، اس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی کوشش کافی حد تک بارآور ثابت ہوئی ہے۔ لیکن حکومت کے غیر نمائندہ وزیر یا ایلچی غیر ملکی دوروں سے واپسی پر پاکستان جا کر اس قسم کے دعوے کرتے ہیں کہ بیرون ملک صرف حکومت کو حمایت حاصل ہے اور آپ کی مہم ناکام ہو چکی ہے؟ اس پر آپ کیا تبصرہ کریں گے؟

میر مرتضیٰ بھٹو نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ حقائق خود بولتے ہیں جب بھٹو صاحب کو پھانسی کی سزا کا فیصلہ ہوا تو میں اگلے ہی دن مشرق وسطیٰ کے دورے پر چلا گیا۔ میری غیر حاضری میں پاکستانیوں نے اپنے طور پر شدید ردعمل ظاہر کرتے ہوئے بغیر کسی تیاری کے فوری طور پر سفارتخانے کے سامنے ایک تہلکہ خیز مظاہرہ کیا۔ مظاہرہ کے دوران اسلام آباد نے چار مرتبہ ٹیلی فون پر اس کی تفصیل معلوم کی تھی۔ اس سے گھبرا کر مظاہروں کو بند کرانے کا حکم دیا تھا اس کے بعد سفارتخانے کو لاکھوں پونڈ کی رقم دی گئی تاکہ اس پیمانے پر پھر کبھی مظاہرہ نہ ہو۔ ادھر ہم نے ایک بڑے مظاہرے کا پلان بنایا، اسے ناکام بنانا کے لیے سفارتخانے نے بڑی کوششیں کیں ان کا اندازہ تھا کہ پانچ سو مظاہرین بھی جمع ہو گئے تو یہ کامیاب مظاہرہ کہلائے گا۔ سفارتخانے نے اس کا بائیکاٹ کرنے کے حامی اردو روزنامہ میں کئی دن تک اشتہار دیئے۔ ہر قسم کے غلیظ اور گندے پوسٹر نکالے، پمفلٹ جاری کیے، جعلی انجمنیں بنائیں لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود جب مظاہرہ ہوا تو ہائیڈ پارک سے سفارتخانے تک پاکستانی ہی پاکستانی نظر آ رہے تھے اور بی بی سی کے مطابق مظاہرین کی تعداد کئی ہزار کے لگ بھگ تھی۔

اس مظاہرے کے خلاف جوابی مظاہرے کے لیے سفارتخانے نے 18 جون کو فوجی حکومت کے حق میں مظاہرہ کا اعلان کیا۔ روزانہ اشتہار آتا رہا ہزاروں پونڈ خرچ کر کے ضائع کیے لیکن آج تک وہ مظاہرہ نہیں ہوسکا ہے۔ اس کے برعکس ہم بریڈفورڈ، برمنگھم ہڈرس فیلڈ اور دوسرے مختلف شہروں میں پاکستانیوں کے احتجاجی مظاہرہ اور اجتماعات میں شریک ہوئے حال ہی میں نقطہ انجماد کی سخت ترین سردی میں ہم نے پھر سفارتخانے کی کوشش کو ناکام بنا کر زبردست مظاہرہ کر کے عوام کی بھٹو صاحب کے لیے زبردست حمایت کو ثابت کر دیا ہے۔

جہاں تک وزیر کے دوروں کا تعلق ہے، اس بارے میں یہ کہوں گا کہ جنرل چشتی اپنا دورہ مکمل کیے بغیر چلے گئے تھے۔ اس کے بعد جو وزیر یا حکومتی نمائندہ لندن آیا ہے، وہ چھپ کر خاموشی سے لندن میں داخل ہوا سفارتخانے کے علاوہ ان کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔ احمد رضا قصوری کو بھی یہاں بھیجا گیا اور ہزار کوشش کے باوجود کوئی جلسۂ عام نہ کر سکا۔ سفارتخانے کے گوشے میں بیٹھے عملہ سے مل کر واپس بھاگ گیا۔ اس کے بعد مارشل لاء کا جو وزیر یا کوئی اور شخصیت آئی۔ اس نے سفارتخانے کے مخصوص استقبالیہ میں ان چند لوگوں کے ساتھ دعوتیں کھائیں جن کو سفارتخانے نے جعلسازی کے ذریعہ کسی نہ کسی انجمن کا عہدیدار ظاہر کیا تھا جو بند کمروں کے علاوہ عوام کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ جنرل ضیاء انگلینڈ آنے والے ہیں سنا ہے کہ وہ سرکاری مہمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ پرائیویٹ دورہ پر آنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ہم خوش ہیں وہ لندن آئیں اور اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لیں کہ پاکستانی اور کشمیری ان کا کس طرح استقبال کرتے ہیں۔

''سابق صدر یحیٰی خان نے ایک حالیہ انٹرویو میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے مسٹر بھٹو کے مشورہ پر مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی تھی؟ یحیٰی خان کے اس دعوے کی حقیقت کیا ہے۔''

میر مرتضٰی بھٹو نے اس بارے میں طویل جواب دیا اور کہا کہ اصل سوال یہ ہے کہ ایسے

وقت یہ بیان کیوں آیا ہے جب سپریم کورٹ مسٹر بھٹو کے بارے میں آخری فیصلہ کرنے والی ہے۔ یہ بیان وقت کے لحاظ سے کافی اہم ہے میں عدالت عظمیٰ پر کوئی رائے نہیں دینا چاہتا، پوری دنیا میں یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ بھٹو صاحب کے خلاف کوئی کیس نہیں ہے اور ہمیں امید ہے کہ عدالت انصاف کرے گی۔

ہمیں علم ہے کہ حکمران اس سے کافی ہراساں ہیں اور میرا تاثر یہ ہے کہ اس کیس کے بعد مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا دوسرا کیس بھٹو صاحب کے خلاف بنایا جائے گا۔ اس لیے یحییٰ خان سے یہ جھوٹا بیان دلوایا گیا ہے جہاں تک یحییٰ خان کے بیان کا تعلق ہے جو فیصلے کسی خان نے کیے تھے وہ ان کے اپنے فیصلے تھے۔ نہ بھٹو صاحب حکومت میں تھے اور نہ ہی قائد عوام ان کے مشیر تھے۔ بھٹو صاحب کی جدوجہد فوجی آمریت کے خلاف تھی اور پاکستان کی یکجہتی کے لیے تھی۔

فوجی ایکشن کے بارے میں یحییٰ خان کا دعویٰ بالکل شرانگیز ہے، الیکشن کے بعد ہر موقع پر بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ ہمارے مسائل سیاسی ہیں اور ان کا پائیدار حل سیاسی ہی ہوسکتا ہے، بھٹو صاحب نے مکمل طور پر چھ نکات کو اس لیے قبول نہیں کیا تھا کہ اس سے پاکستان کے پانچ ٹکڑے ہو جاتے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس پر بات چیت کر لیں تا کہ پاکستان کا اتحاد قائم رہ سکے۔ بھٹو صاحب ریکارڈ پر ہیں کہ اگر شیخ مجیب پاکستان کے اتحاد کو تسلیم کر لے اور چھ نکات میں ترمیم کرے تو اسی وقت شیخ مجیب کو پاکستان کا وزیراعظم تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ انہوں نے ''مینار پاکستان کی تاریخی تقریر میں اعلان کیا تھا کہ فوج کو کوئی ایکشن نہیں لینا چاہیے اور اس کے لیے دو راستے کھلے ہیں کہ یا تو قومی اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ کو ملتوی کرے یا اسمبلی کے انعقاد پر وقت کی جو پابندی لگائی گئی تھی اسے ختم کیا جائے۔ بھٹو صاحب شیخ مجیب سے ڈھاکہ میں ملے یحییٰ خان خود اس وقت وہاں موجود تھا۔ اجلاس کے بعد انہوں نے شیخ مجیب اور بھٹو صاحب سے کہا کہ ہم کل صبح دس بجے ایک اور ملاقات کریں گے، لیکن وہ فوجی ایکشن کا حکم دے کر اسی رات مغربی

پاکستان فرار ہو گئے تھے 25 اور 26 مارچ 1971ء کی درمیانی رات دو بجے صبح فوجی ایکشن شروع ہوا اور بھٹو صاحب کو اس وقت پہلی مرتبہ فوجی کارروائی کا علم ہوا جب انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے چاروں طرف خانہ جنگی ہو رہی تھی۔

مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی چند اقتدار پرست جرنیلوں کی ملی بھگت تھی جو حکمرانی کے لیے پاکستان کو دولخت کرنے پر تلے ہوئے تھے اور شیخ مجیب کو اسی لیے پھانسی دینا چاہتے تھے تاکہ اقتدار پر قابض رہ سکیں لیکن فوجی شکست کے بعد جب بھٹو صاحب نے شیخ مجیب کو رہا کیا تو خود شیخ مجیب نے یہ اعتراف کیا تھا کہ بھٹو صاحب نے ان کی جان بچائی ہے کیونکہ یحییٰ خان شیخ مجیب کو پھانسی کا حکم دے چکے تھے اور انتقالِ اقتدار کے وقت بھٹو صاحب پر بھی زور دیا تھا کہ ان کے حکم کے مطابق پچھلی تاریخ سے شیخ مجیب کو پھانسی پر لٹکا دیں۔

بھٹو صاحب نے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ تمام پارٹیوں کے مطالبات کے باوجود اس لیے شائع نہیں کی تھی کہ اس سے پاکستانی افواج کا وقار منسلک ہے اور اس کے منظر عام پر آنے سے فوج کی بدنامی ہوتی، اور جرنیلوں کو تمام ذمہ داری اٹھانی پڑتی۔ اگر آج بھٹو صاحب پر بنگلہ دیش بنانے کا الزام عائد کیا جا رہا ہے تو انہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کو شائع کرنا پڑے گا۔

مساوات، ویکلی لندن

ہفت روزہ ''سچائی، کراچی 1978

بیگم نصرت بھٹو کا خط چیف جسٹس انوار الحق کے نام

۷۶-۲ای نمبر۷ اسلام آباد
۳۱دسمبر ۱۹۷۸ء

مسٹر جسٹس انوار الحق
چیف جسٹس
سپریم کورٹ آف پاکستان
راولپنڈی

جناب چیف جسٹس صاحب

۳۰دسمبر ۱۹۷۸ء کے پاکستان ٹائمز میں گذشتہ روز کے آپ کے لاہور کے بیان کو پڑھ کر میں حیران اور ششدر رہ گئی جس میں آپ نے عوام کی منتخب کردہ حکومت سے پُرخاش ظاہر کی ہے اور جس پر آپ نے اسلام سے روگردانی کا جھوٹا الزام لگایا ہے۔ آپ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کھوکھلے نعروں کے خاتمہ پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اپنے سیاسی نظریات ظاہر کئے۔ نتیجہ میں آئینی طریقوں سے حکومت کے قیام سے بے اطمینانی ظاہر کی۔

پاکستان ٹائمز نے لکھا ہے کہ آپ نے ''سابقہ حکومت'' پر اسلامی قوانین کے نفاذ سے ''روگردانی'' کا الزام لگایا ہے۔ آپ نے قائداعظمؒ سے قائدِعوام تک کی تمام حکومتوں کی اسلامی بنیاد پر مذمت کی ہے۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتی ہوں کہ حقائق اس سے بالکل مختلف ہیں۔ پوری دنیا میں اس حقیقت کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے اسلامی مقاصد کی عدیم المثال خدمت کی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب ایک نچلی عدالت نے موت کی سزا سنائی تو مسلم ممالک نے درخواستیں بھیجیں جن میں سے بیشتر میں میرے شوہر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی اسلام اور مسلمانوں کے لیے خدمات کا تذکرہ کیا گیا۔ میرے شوہر کی نمائندہ حکومت نے اسلام کے فروغ کے لیے جو اقدامات کئے تھے ان میں سے آپ کو چند اقدامات کی یاد دہانی کرانا میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتی ہوں۔

۱۔ اتفاق رائے سے اسلامی آئین منظور کیا گیا۔

۲۔ اسلام سے متعلق امور کی دیکھ بھال اور آئین کی اسلامی شقوں کی عمل درآمد کے لیے مذہبی امور کی وزارت بنائی گئی۔

۳۔ اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل دی گئی۔

۴۔ غلطیوں سے پاک قرآن مجید کی طباعت کو قانونی ذمہ داری بنایا گیا۔

۵۔ حج بیت اللہ کا فریضہ انجام دینے سے متعلق تمام پابندیاں اٹھالی گئیں اور اس کوٹہ سسٹم کا خاتمہ ہوا جو اس مقدس سرزمین کے زائرین کی راہ میں رکاوٹ بنتا تھا۔

۶۔ پرائمری سے میٹرک تک اسلامیات کی تعلیم کا مضمون لازمی بنایا گیا۔

۷۔ اوقاف کی وزارتیں بنائی گئیں۔

۸۔ پورے ملک میں عربی کی تعلیم کی ہمت افزائی کی گئی اور اس کی تعلیم کے لیے ابلاغ عامہ کے بصری ذرائع کے استعمال کی ایجاد کی گئی۔

۹۔ عید کے سلسلے میں پیدا ہونے والے اختلافات دور کرنے کی غرض سے رویت ہلال کمیٹی قائم کی گئی۔

۱۰۔ اخوت اسلامی کے استحکام کی غرض سے دوسری اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد کی گئی۔

اس کے برخلاف فوجی حکومت کے نعرے اتنے ہی کھوکھلے ہیں جتنا سڑک پر رہنے والے شخص کا پیٹ خالی ہے۔ حتیٰ کہ پاکستان قومی اتحاد کے نام نہاد سورما بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ نظام مصطفیٰ نافذ نہیں کیا گیا۔

مسٹر چیف جسٹس! جب آپ نے میرے شوہر کو سپریم کورٹ میں حاضر ہونے کی اجازت دی تو ہم نے اس کا یہ مفہوم نکالا کہ شاید انصاف کے خیال سے تعصب کو ترک کیا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے شوہر نے اپنی درخواستوں میں آپ کے تعصب پر زور نہیں دیا اور نہ ہی تعصب کے دیگر نکات بیان کئے جن کا ذکر کر کے میں آپ کو خفیف نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن افسوس کہ آپ کے تازہ ترین بیان سے جس میں آپ نے میرے شوہر کی حکومت پر حملہ کیا ہے اور فوجی حکومت کی قصیدہ خوانی کی ہے، ہماری تمام خوش فہمیاں ختم ہوگئیں۔

جس طریقہ سے فوجی حکومت عالم وجود میں آئی ہے آپ نے اس پر بھی اطمینان کا اظہار کیا ہے اور اس طرح اس جمہوری حکومت سے بغض وعناد کا خاتمہ کرنے کے عمل کو سراہا ہے جس کے لیے براہ راست انتخابات کے ذریعہ دوبارہ وزیراعظم منتخب ہونے کا اعزاز واحد میرے شوہر کو حاصل ہے۔

مسٹر چیف جسٹس! یقین کیجئے کہ اگر آپ اس وقت میرے شوہر کی اپیل پر فیصلہ نہ لکھ رہے ہوتے تو آپ کے ان جھوٹے بیانات سے مجھے تکلیف نہ ہوتی۔ ایسے متنازعہ خیالات کا اظہار کرنے کے بعد کیا آپ میرے شوہر کی اپیل پر فیصلہ لکھنا اپنے لیے جائز سمجھتے ہیں؟ بہرحال بنچ کے دیگر ارکان کے بارے میں اس قسم کا کوئی خیال نہیں ہے۔ لیکن ایسے ناموزوں موقع پر آپ کے ایسے افسوسناک بیان کے بعد آپ کے فیصلے کی غیر جانبداری کو یقیناً شک کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ میں آپ کو انصاف کے مفاد اور عدلیہ کے اداروں کے استحکام کا واسطہ دے کر زور دیتی ہوں کہ آپ میرے شوہر کی اپیل پر فیصلہ نہ لکھیں۔

میں انتہائی افسوس کے ساتھ یہ درخواست کرنے پر مجبور ہوئی ہوں کیونکہ آپ نے ایسے نازک موقع پر اپنے آپ کو مکمل طور پر فوجی حکومت سے وابستہ کیا ہے جبکہ آپ نے ابھی مکمل فیصلہ نہیں لکھا ہے۔

بیگم نصرت بھٹو

Begum Nusrat Bhutto

requests the pleasure of

Mr./Mrs./~~Miss~~ Bashir Riaz *company*

at the marriage of

Benazir

Daughter of Shaheed Zulfiqar Ali Bhutto

to

Asif Ali

Son of Mr. & Begum Hakim Ali Zardari

on Friday, December 18, 1987

at 7-30 p.m.

at Clifton Garden, Karachi.

Regrets only
538233
532151

PLEASE BRING THIS CARD WITH YOU

CONVENTION OF INTERNATIONAL JURISTS
on the trial of Mr Zulfikar Ali Bhutto

If you are not prepared to do this you will never sell a book that is much, much more powerful then "If I am Assassinated."

I have asked Shahnawaz to take over this project. You can help him by putting him in touch with different book distributors, who can read the book

Then Shahnawaz can hold a press conference jointly with Professor Trevor Roper or John Mathew or someone like that. Book distributors can be invited to that press conference too.

Best of luck. Don't give up the fight.

always
Mum

میر مرتضیٰ بھٹو کا خط

CONVENTION OF INTERNATIONAL JURISTS
on the trial of Mr Zulfikar Ali Bhutto

Dear Bashir,

I have enclosed some articles ~~few~~ for your interest. This is ~~the~~ solid news. It confirms Musawaat International's earlier reporting of PLA.

You can reproduce ~~this~~ some of this. And say that these are the beginnings of a ~~good~~ new govt. campaign against the Party and family.

Nawae-Waqt has asked the govt to hang us (me, Suhail, Raja etc). Posters ~~and~~ offering reward have been plastered all over Pakistan Bus Stops and Train Stations with our pictures on it. We are trying to get a copy of this poster and the Nawa-e-Waqt editorial demanding a public hanging.

Every penny of ours is going into ...k for the armed struggle. Those who ...ed to finance us before have decided not do so anymore. So you will just ...ve to sell those books the way books are ...pposed to be sold: i.e., in book shops. but distributors take a 50% commission

Mir Murtaza Bhutto

-2-

Masawaat International remains the onlyxxx official organ of the party outside Pakistan. Its editorials contain the official policy of our party. This newspaper has the blessings of our Chairman, Begum Sahiba, just as it had the blessings of the founder of the party, Martyr Zulfikar Ali Bhutto. Ours is not a sensational paper, it is not a rag; it is not concerned with the gossip of Hyde Park or the tales of Raja Bazar. It is a serioe political paper and should be read by all those interested in the political development of the party. It carries party news and party policy. If the Punjab Working committee xxxxxxxxxxx recomended Begum Sahiba as the Chairman for life and Miss Benazir Bhutto as the Acting Chairman, well then that is final. That is what our newspaper will carry and that is what our newspaper will propergate.

All those traitors who say that this is the descision of the Punjab Working Committee and not the Central or Executive committee should be asked one question: Do you accept the decision of of the Working Committee or not? Those who do not will be sacked from the party without ceremony. The same great man who taught these meek critics also taught Begum Sahiba and Miss Benazir. If our Great Leader taught these scums for eight Years he taught Begum Sahiba for thirty years and Miss Benazir for twenty- six years. Martyrxx Bhutto's family were taught politics by the Great Leader in his own house, and they know this game better than those traitors who call themselves lions of this and that province. They behaved like disgusting mice compared to the bravery of these two great ladies. The blood of Shaheed Badshah flows in our xxxx xxxxx veins, an he taught us things he did not teach outsiders.

Finally, I am sure you will continue with your mission with the same determination you have shown in the past. You have my complete trust, just as you have always enjoyed the trust and confidence of of my entire family. Shaheed Badshah would have been proud of your of the struggle you launched for him.

With best wishes,

MB

Murtaza Bhutto.

میر مرتضیٰ بھٹو کا خط

Mir Murtaza Bhutto

Dear Bashir Riaz,

I have been out of England for a long time and, though I cannot publically disclose where I am presently, I have been upset by talk of dissention withen our ranks in Europe. I would like to offer some guiide lines which I hope will resolve some of the prevailing doubts.

First, our Chairman, Begum Bhutto, is in touch only with Shahnawaz Bhutto, and through him, with you as Editor of Massawat Weekly. Anyone else who claims to be in touch with our Chairman or with Miss Benazir Bhutto is a fraud. People in the past have used and misused the name of our Great Leader, Martyr Zulfikar Ali Bhutto, only to betray him latter. After betraying him they have claimed to remain his close confidantes, which they once might have been. We must recognize all our enemies and traitors so as never to repeat the mistakes of the past. Let our actions and our present and past behavior be the criterion of judgment. Once betrayel enters our blood, loyalty should never be expected. Remember this well.

You must work with great vigour on the Mr Martyr Zulfikar Ali Bhutto Trust. This is the least we can do for the memory of our Great leader. You must not be disturbed by opposotion to this project. Those who oppose this were the same people who opposed Shaheed Badshah. Those who oppose this discreatly were the same people who opposed our Great Leader and stabbed him in the back. Those who call this a "mistrust" are those who are not at peace with their own conscioumce. Some people want to sell the name of Shaheed Badshah, just as they sold his life. They will oppose you because they feel that if they had started this trust before they could have misused it to make money. The fact is that your consciounce is clear. The Memorial Trust is publishing books on our Great Leader, it is peeparing a library on him, it is presenting madels to those who tried to save our Great Mr Martyr's life, it is building monuments in different parts of the world to his memory. You must be proud of this project. Shame on those who have set up an office to collect money over the grave of our Great Leader.

بیگم نصرت بھٹو کا پیغام

Pakistanis and Kashmiris living in Britain have always supported the just cause of Chairman Bhutto Shaheed and the people of Pakistan. Their consistent struggle against the barbaric rule has been a great source of strength for the oppressed people of Pakistan.

This was said by the Chairman Pakistan People Party Begum Nusrat Bhutto in a message to Shah Nawas Bhutto, now living in London.

She said that because of the painful events in Pakistan and continued strangulation of political activities it had not been possible for the high command to pay due attention to the PPP organisations abroad.

It is because of this fact that certain undesirable elements in collaboration with the military junta have started exploiting the genuine feelings of our supporters to achieve their personal goals and missions.

She said that shortly a plan to re-organise the PPP abroad, would be worked out by the central committee so as to give a correct and productive line to the followers of PPP and true supporters of Mr.Bhutto Shaheed.

Shah Nawas Bhutto said that Begum Nusrat Bhutto would be sending a special message for the Pakistanis living abroad, on the eve of independence day.

1) Editor Millat
2) Editor Musawaat

24/7

بیگم نصرت بھٹو کا ایڈیٹر مساوات (لندن) کے نام خط

اس دور میں سچ اور جھوٹ کی پہچان کرادی تو نے
زندگی امر ہوئی موت کی شان بڑھادی تو نے

بشیر ریاض صاحب

آپ کا تعزیت نامہ ملا۔ ہمارے پیارے اور محترم کا بہیمانہ قتل ہماری زندگی کا غمناک ترین سانحہ ہے۔ اس گھڑی میں آپ کے تعزیتی الفاظ نے ہماری غمناک زندگی کے لمحات کو قابلِ عمل بنانے میں مدد دی ہے۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔

انڈس کے شفاف پانی کی مانند ان کی زندگی اعلیٰ ظرفی، عظمت، ہمدردی اور فراخدلی کا بہتا ہوا دریا تھی بھٹو نے جابرانہ طاقتوں کے خلاف انتہائی دلیری سے مقابلہ کیا تاکہ ایک بہتر معاشرے کی تعمیر کر سکیں جو سچائی، انصاف اور مساوات کا عکاس ہو۔ وہ علیؓ کی تلوار کے ذریعے آئے تھے تاکہ عوام کے پیروں میں پڑی ہوئی استحصال کی زنجیریں توڑ دیں۔

انتہائی ایذا رسانی، نفرت انگیز انتقامی کارروائیوں اور موت کی کال کوٹھری میں قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود انھوں نے اپنی ناقابلِ شکست قوتِ ارادی اور ناقابلِ تسخیر جذبے سے دشمن کے ناپاک عزائم کو پامال کر دیا۔ وہ ایک لاثانی اور گرانمایہ شخصیت تھے جنھوں نے عوام سے غداری کرنے کی بجائے جامِ شہادت نوش کرنا پسند کیا۔ یہی ان کی زندگی کا مقصد تھا اور اسی لئے انھوں نے اپنی جان وقف کر دی۔

ذوالفقار علی بھٹو مہر و محبت کی ایک تاباں شخصیت تھے۔ ان کی ہستی کروڑوں بدنصیب انسانوں کے لئے جو اس سرزمین کی اتھاہ تاریکیوں میں زندگی گذار رہے تھے ایک خداداد نعمت تھی۔ جیسے ایک شہاب ثاقب آسمان کو روشن کرتا ہے اسی طرح وہ عوام کی نادار زندگی میں امید، حوصلے، روشن مستقبل، خوشحال زندگی اور مسکراہٹوں کا ایک روشن مینار تھے۔ ان کے کارناموں نے انہیں امر بنا دیا ہے۔

نصرت بھٹو

1979

70. Clifton
Karachi.

15. There has never been any obstruction from my side. I have no intention of providing the Administration with an excuse to deprive me treatment which is available abroad, which is why I wrote to the Ministry of Interior, which is why I agreed to come before the Medical Board, which is why I agreed to the repetition of blood tests and expose myself again within such a short time to the radiation of X-Rays, despite the unethical implications in asking for repeat tests. By asking me to go for a repeat Bronchoscopy you want to disturb the cancer cells hence, hasten my death instead of controlling it. I cannot oblige you. Now whatever happens to me the blame will squarely go to where it belongs - on the shoulders of the Military regime. I do not want them to subsequently lie to my children, to my Party and people to posterity and to the world, "We would have let Begum Bhutto travel abroad for her treatment only if she had agreed to appear before a Medical Board".

16. I do not want any Foreign Exchange, if that is why I have to suffer and go through all this trouble, I only ask for a passport and permission to go for my treatment before my illness becomes fatal. I have friends and relatives who will take care of my medical expenses.

17. When we met on October 31st, you said to me "Begum Sahiba, I am only doing my duty". Your duty as a General or your duty as a Doctor? For a doctor a patient is his Chief ------. Your comments to the press and then asking me to undergo a second operation of Bronchoscopy followed by Biopsy are an upsetting indicator.

18. In the end each person's decision is their own, for which they bear responsibility to their conscience, their people and to Allah.

Nusrat Bhutto

Begum Nusrat Bhutto.

NOTE:—

It has just come to my knowledge that there was a third doctor of the Medical Board who supervised my Tests on Oct. 31. 1982. In para 2. line 6. of my letter, please read "and Dr. S. M. Alam".

N.B

جناب ذوالفقار علی بھٹو کی سالگرہ کے موقع پر مساوات لندن کا اداریہ

یہ ایک اہم اور خوشگوار حقیقت ہے کہ اِس سال اسلامی کانفرنس کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو کی سالگرہ سے پاکستان کی تقدیر وابستہ ہے۔ منتخب عوامی حکومت کے وزیر اعظم کی یہ سالگرہ پاکستان کے مستقبل اور بقا کا یوم تعزیب ہے۔ کیونکہ ہم ۵ رجنوری ۷۹ء کو چیئرمین بھٹو کی سالگرہ ذمی تاریخ کے ایسے نازک ترین موڑ پر منا رہے ہیں کہ برسر اقتدار ٹولہ اپنی حماقت سے ۸۰ء کو پاکستان کے جنازے کے سال میں تبدیل کر سکتا ہے۔

پاکستان سپریم کورٹ میں جناب بھٹو کی اپیل پر فیصلہ محفوظ ہے خدا کرے ہماری یہ خوش فہمی درست ثابت ہو کہ سپریم کورٹ کے فاضل ججوں کے دلوں میں خوفِ خدا موجود ہے۔ وہ انصاف کے تقدس کا احترام کریں گے اور مارشل لار یا ایک آمر کے خوف سے مغلوب ہو کر غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔ تاہم ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اسلامی کانفرنس کے چیئرمین کی یہ تذلیل بجائے خود اس شرمناک سازش سے پردہ اٹھاتی ہے، جو پاکستان اور مسلم اتحاد کے سب سے بڑے علمبردار لیڈر کے خلاف کی گئی ہے۔ سابق وزیر اعظم مسٹر بھٹو کو قومی منظر سے ہٹانے کے لئے ان کے سیاسی قتل کی سازش تیار کی گئی ہے اور ان کے خلاف جھوٹے مقدمہ قتل کا ٹھوس ثبوت یہ ہے کہ اکتوبر ۷۷ء کے اوائل میں ہی جنرل ضیا کے ایک حاشیہ نشین مشیر نے لندن میں اپنے حلقہ خاص میں جناب بھٹو کو پھانسی دینے کے فیصلے کا اعلان کر دیا تھا، جبکہ مقدمہ ابتدائی مراحل میں تھا اور فیصلہ پانچ ماہ بعد ۱۸ر مارچ کو سنایا گیا۔

پاکستان کے سب سے بڑے سیاسی رہنما کے خلاف اس سازش کے علاوہ جنرل ضیا کی مسز بھٹو، بیگم نصرت بھٹو، آنسہ بے نظیر بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف تمام کارروائیاں شرمناک انتقام کی نفرت انگیز داستان ہے۔ یہاں تک کہ مسٹر بھٹو کو ختم کرنے کے لئے قومی مفادات کی مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ گزشتہ ایک سال میں ملک کو جو نقصان پہنچ چکا ہے، اس کا تصور ہی لرزہ خیز ہے۔ بیرون ملک پاکستان کی ساکھ تباہ ہو چکی ہے۔ ۷۱ء کے سانحہ کے بعد مسٹر بھٹو نے پاکستان کے استحکام کی بنیاد ڈال کر ایک سال میں خوشحالی کی راہ پر ڈال دیا تھا، لیکن جنرل ضیا نے گزشتہ ایک سال میں پچھلے پانچ سالوں کے مضبوط اور خوشحال پاکستان کو تباہ کر دیا ہے اور آج عالمی برادری میں پاکستان کی حیثیت زوال پذیر ملک کی رہ گئی ہے، اور خود پاکستانی اپنے ملک کے وجود کے بارے میں خدشات کا اظہار کر رہے ہیں۔

ملک میں آئین کو سلا دیا گیا ہے۔ لیڈر نظر بند ہیں۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی اور جمہوریت ممنوع ہے۔ خود "مومن جرنیل" یہ اعتراف کر چکا ہے کہ وہ عوام کو خوفزدہ کر کے حکومت کر رہا ہے۔ جناب بھٹو کے ساتھ جیل میں شرمناک سلوک جرنیلوں کے شیطانی عزائم کے لئے تو وجہ مسرت ہو سکتا ہے، لیکن انہوں نے دنیا بھر میں پاکستان کی تذلیل کر کے پوری قوم کی نگاہیں شرم سے جھکا دی ہیں۔

اسلامی کانفرنس کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے اصولوں پر سودے بازی کی بجائے اپنے خلاف ظلم و ناانصافی کا جس بہادری، جرأت، ہمت اور بے مثال ثابت قدمی سے مقابلہ کیا ہے، ان کی زندگی کی اہم ترین سالگرہ کے موقع پر جب موت اور زندگی میں فاصلہ بہت کم رہ گیا ہے، ہم ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم جرنیلوں کے اس گھناؤنے منصوبے کو پورا کرنے کی اجازت نہیں دیں گے اور عوام ان قاتلوں کو خون کا غسل دیں گے۔ قائد اعظم کے عوامی جانشین قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کو ان کی سالگرہ کی مبارکباد ان الفاظ کے ساتھ دیتے ہیں۔

قوم آپ کو قاتل نہیں سمجھتی۔ خدائے عظیم آپ کے ساتھ ہے۔ سچائی آپ کے ساتھ ہے۔ پاکستان آپ کے ساتھ ہے اور ملک کے کروڑوں غریب عوام کی دعائیں آپکے شامل حال ہیں کیونکہ آپکی زندگی ان کی زندگی ہے

مصنف کا جناب ذوالفقار علی بھٹو کو خط 20 جولائی 1978ء

لندن
۲۰ . جولائی ۱۹۷۸ء

سائیں ڈیئر بھٹو صاحب ۔ السلام علیکم ۔

آپ کے ساتھ جو ظلم اور ناانصافی کی جا رہی ہے۔ اور آپ جس بہادری اور صبر و استقامت سے تمام تکالیف برداشت کر رہے ہیں۔ اس سے آپ نے یزید کی جانشین قوتوں کو شکست دے دی ہے۔ پاکستان دشمن طاقتوں کے سوا پوری دنیا آپ کے ساتھ ہے۔ پاکستان کے عوام کی دعائیں رائیگاں نہیں جائینگی۔ آپ ان کے دل کی آواز ہیں۔ اور ظالم اپنے عبرتناک انجام کو پہنچیں گے۔

پاکستان کو تباہ و برباد کرنے والے حکمرانوں کا ہم یہاں مقابلہ کر رہے ہیں۔ خداوند کریم اور آپ کی مثال نے ہمیں ثابت قدم رکھ کر یہ ہمت عطا کی ہے۔ کہ پاکستان کے نئے یزید اور ان کے شیطان ساتھیوں کے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھا کر نہ صرف عالمی ضمیر کو بیدار کریں۔ بلکہ آپ کے لئے انصاف کی جدوجہد بھی کریں۔ یہی پاکستان اور عوام کی بھلائی میں ہے۔ اور اس کیلئے ہم سب کچھ نچھاور کر دینگے۔ ہمارا یہ عزم ہے۔ آپ سے یہ وعدہ ہے۔ کہ ہم پاکستان اور آپ کیلئے زندگی کے آخری سانس تک غاصبوں اور پاکستان کے دشمنوں کے خلاف لڑیں گے۔

اس وقت جب یہ سطور آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ زندگی اور موت میں بہت کم فاصلہ ہے۔ زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے اور ہم خدا کی رحمت سے مایوس نہیں۔ میرا یہ یقین ہے۔ کہ گذشتہ سال ۱۳ ستمبر کو آپ سے ملاقات آخری ملاقات نہیں تھی۔ ہم پھر آپ کا خیر مقدم کریں گے۔ اور انشاء اللہ آپ کے شانہ بشانہ ظلم و ستم کے نشانات مٹائیں گے۔

آپ یقین کیجئے۔ جیل کی کوٹھڑی میں آپ اکیلے نہیں۔ ہمارا ہر لمحہ آپ کے ساتھ ہے جس طرح پاکستان کا مستقبل آپ کی زندگی سے وابستہ ہے۔ اسی طرح ہم نے آپ کی زندگی کو اپنی زندگی بنا لیا ہے۔ میں ہزاروں پاکستانیوں کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ خدا آپ کا محافظ ہو۔ آپ کا مخلص

بخدمت جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب

ہزاروں دعاؤں کے ساتھ۔

بشیر ریاض

مصنف کا بیگم نصرت بھٹو کو خط (20 جولائی 1978ء)

58-SUNLEIGH RD.
ALPERTON.
MIDDX.
۲۰-جولائی ۱۹۷۸ء

محترمہ بیگم نصرت صاحبہ۔ دعائیں!

آج میں رنج و غم کے ساتھ آپکی خیریت معلوم کر رہا ہوں۔ آپکے ساتھ جو زیادتیاں اور شرمناک سلوک کیا جا رہا ہے۔ اس سے ہماری گردنیں شرم سے جھک گئی ہیں۔ منافق۔ بددیانت اور جھوٹی قوتوں سے کسی بھلائی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ آپنے پیر پیر کی اولاد کی منافقانہ طاقت کا مقابلہ کر کے جبر پر تاریخ میں بہادری کی مثال قائم کر دی ہے۔ اور ہمارے سر فخر سے بلند ہیں۔ ہم یہاں سے آپ کو ہی خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ کہ پاکستان کے جابر ظالم بددیانت اور عوام کے حقوق کے غاصب حکمران ٹولے کے خلاف سینہ سپر ہیں۔ اور حق و انصاف کی جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

کامیابی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے ارادے اور عزائم نیک اور مخلصانہ ہیں ہماری دعائیں بے لوث ہیں۔ ہم پاکستان کے دشمن اور پاکستان کو تباہ کرنے والے غیر ملکی ایجنٹوں سے ڈرتے نہیں گے۔ پاکستان اور قوم کا مستقبل ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں دیا جا سکتا۔ جو ملک کو تباہ کرنے کا پروگرام رکھتے ہیں۔

آپ کی نظربندی، ظلم اور تشدد فوجی حکمرانوں کی بزدلی کا ثبوت ہیں۔ ہم ملک سے باہر آپ کا پرچم بلند رکھیں گے۔ انشاءاللہ!

یہاں سے مساوات ویکلی شکل میں جاری کر دیا ہے۔ پیر دلفی جبرو صاحب کافی محنت کر رہے ہیں۔ اللہ ان کی کوششوں میں کامیابی دے!

مساوات لاہور کو پریس ٹرسٹ میں لینے کی سازش کی جا رہی ہے۔ آستین کے سانپ سے ہوشیار رہنے کی درخواست ہے۔

آئندہ چند دن بہت نازک ہیں۔ ہم سب کی دعائیں آپکے ساتھ ہیں۔

آپکا نیازمند
بشیر ریاض

بخدمت بیگم نصرت بھٹو صاحبہ
لاہور

وزیراعظم پاکستان کی حیثیت سے جناب ذوالفقار علی بھٹو کا خط

PRIME MINISTER

Prime Minister's Hous
Rawalpindi.

3rd December, 1973

Dear Mr. Bashir Ahmad,

Thanks for your letter setting out your views on the various matters discussed in it. I am touched by your kind sentiments for the popular leadership in your country and by your convictions in the service of your people.

Yours sincerely,

Zulfikar Ali Bhutto

Mr. Bashir Ahmad Riaz,
139 St. Paul Ave,
Slugh, Bucks,
ENGLAND.

بیگم نصرت بھٹو کا خط

PRIME MINISTER'S HOUSE.
RAWALPINDI.

7. 10. '75.

جناب بشیر ریاض صاحب

اسلام علیکم!

مجھے آپکا عید کارڈ ملا - عید کارڈ بھیجنے
کا بہت بہت شکریہ - میری طرف سے بھی
عید مبارک قبول فرمائیے

مخلص

نصرت بھٹو

(بیگم نصرت بھٹو)

www.bhutto.org

PRIME MINISTER'S HOUSE
RAWALPINDI
۱۶ مارچ ۱۹۷۷

محترم شبیر وہامن

السلام وعلیکم

۱۹۷۷ کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کی
شاندار کامیابی پر مبارکباد کا خط بھیجنے پر آپ کا شکریہ۔
حالانکہ اپوزیشن نے قانون کو ہاتھ میں لیکر نظم
و ضبط کو درہم برہم کرنے کی پوری کوشش کی۔ رائے دہندگان
کو خوفزدہ کیا اور پولنگ سٹیشنوں پر دھاندلیاں کرتے رہے۔
مگر عوام کے بھرپور تعاون سے پاکستان پیپلز پارٹی انتخابات میں
بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔
میں دل کی گہرائیوں سے آپ کے نیک جذبا
اور احساسات کا احترام کرتی ہوں۔ نیک تمناؤں کے ساتھ۔

نصرت بھٹو
(بیگم نصرت بھٹو)

www.bhutto.org

بشیر ریاض صاحب

آپکا ۲۲ دسمبر کا تحریر کردہ مکتوب ملا۔ آجکل یہاں ڈاک کی ترسیل میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ اسلئے آپکا خط بھی بہت سے مراحل سے گزر کر مجھ تک پہنچا ہے۔

آپکی تحریریں اکثر و بیشتر مساوات لاہور میں نظر سے گزرتی ہیں۔ عوامی شعور کی بیداری کیلئے آپکی کاوشیں قابلِ ستائش ہیں۔

۲۔ آپکا خط بروقت موصول نہ ہو سکا اسلئے قائداعظم کیلئے پیغام آپکی خواہش کے مطابق آپ تک نہیں پہنچ سکے گا۔ تاہم یوم قائداعظم کیلئے اخبارات کو جاری ہونے والا بیان لف ہے۔

۳۔ جن مسائل کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے انکے سلسلے میں ایڈیٹر مساوات کو ہدایت کر دی گئی ہے۔

نصرت بھٹو

نصرت بھٹو
چیئرمین

PRESIDENT'S HOUSE
RAWALPINDI.

۱۲ دسمبر

مکرمی جناب بشیر ریاض صاحب

تسلیم -

آپکے دو اسے مورخہ 30 نومبر اور ۳ دسمبر کے موصول ہوئے۔
کٹنگ بھیجنے اور معلومات فراہم کرنے کا شکریہ - میں نے بھٹو صاحب
کو بھی ان معلومات سے آگاہ کیا ہے -

صدر صاحب سے انٹرویو کے سلسلہ میں آپ جب پاکستان
تشریف لائیں تو رابطہ قائم کریں - آپکو وقت دینے کی کوشش
کی جائے گی -

نصرت بھٹو
(بیگم نصرت بھٹو)

خاتونِ اوّل کی حیثیت سے بیگم نصرت بھٹو کا مصنف کو پہلا خط (7 ستمبر 1973ء)

PRIME MINISTER'S HOUSE
RAWALPINDI

7th September 1973

Dear Mr Bashir Riaz,

Thank you for your telegram of felicitations on my husband's assuming the office of the Prime Minister of Pakistan.

I very much appreciate your sentiments and good wishes which you have expressed for both of us.

Yours sincerely,

Nusrat Bhutto

(Begum Nusrat Bhutto)

Mr Bashir Riaz,
139 St Paul Ave.
Slough, Bucks (UK)

بیگم نصرت بھٹو کا خط

PRIME MINISTER'S HOUSE,
RAWALPINDI

May 12, 1975.

Dear Mr. Bashir Riaz,

Received your letter of April 28,1975 and the recorded tape you had sent with it for which I thank you.

What can one do with such liars who pose as leaders and make fools of honest people but in reality make fools of themselves?

I have discussed your letter and its enclosures with the Prime Minister. Hope you will keep me informed.

With good wishes,

ours sincerely,

Begum Nusrat Bhutto

Mr. Bashir Riaz,
31-Dolphin Road,
Slough Bucks
<u>United Kingdom.</u>

02- REi 1200 14/08/90 LINES : T=44 P=19

Begum Bhutto thought that the promised elections of 24 October would not take place. An interim government, she said, should have been made up of neutral people, not politicians who seem already busy at widening their influence. She doubted whether any elections would be held for at least a year, and she said the timing of Miss Bhutto's dismissal had been motivated by fear by her opponents of an imminent series of arrests of prominent persons for drug-running. At this point, the Begum said, the army and PPP opponents had decided to act.

Begum Bhutto said that if elections did not take place, or if there were attempts to hinder the activities of the PPP, the Pakistan people would react by rallying behind her daughter and the international community would demand a return to democracy.

ENDS

ADD FOR EASTERN SERVICE

Begum Bhutto said that her son-in-law had already been to the courts to stop the press in Pakistan blacking his name. Why would he do so, she said, if he were not innocent. She also said that the arrest of two of Miss Bhutto's cousins was 'sheer vindictiveness'. The Begum added that if the October 24 elections did go ahead onschedule, she would return to fight the PPP corner with her daughter.

EST REI 1200 14/08/90 LINES : T=44 P=25 1700

=EASTERN TOPICAL UNIT= = BEGUM BHUTTO SPEAKS =
= 14 AUGUST 1990 = = BY BARRY LANGRIDGE (S) =

LEAD IN: Begum Nusrat Bhutto, mother of the dismissed Pakistan Prime Minister Benazir Bhutto, has spoken to the BBC about corruption allegations against the Bhutto family and connections. The Begum denied all allegations and said there had been no deal offered by the new interim government to curb all charges in return for the departure from Pakistan on Benazir Bhutto herself. Barry Langridge of the BBC's Eastern Service reports.

Begum Nusrat Bhutto is chairperson of her daughter's Pakistan Peoples' Party, and was minister without portfolio in the government which was dismissed by the President of Pakistan one week ago. She said she had come to London for medical reasons, leaving early in case her name was put on a list of those denied exit by the new interim government.

It had been widely reported that the interim government had offered the Bhutto family a deal by which no corruption charges would be levelled, on condition that Miss Benazir Bhutto should leave Pakistan. Begum Nusrat Bhutto said that this was nonsense. Her daughter, she said, would stay in Pakistan and fight it out. Allegations of corruption against Miss Bhutto's husband, Mr Asif Zardari, also had no substance, she said. Attacking Mr Zardari was merely a devious way of trying to black the Bhutto and PPP names When asked why it was that the outgoing government had attracted so many allegations of corruption, Begum Bhutto said that it was possible that some ministers had taken commissions. Some mud might stick, she said, and affect the party's reputation. But she defended the government's overall record.

DOCUMENTS

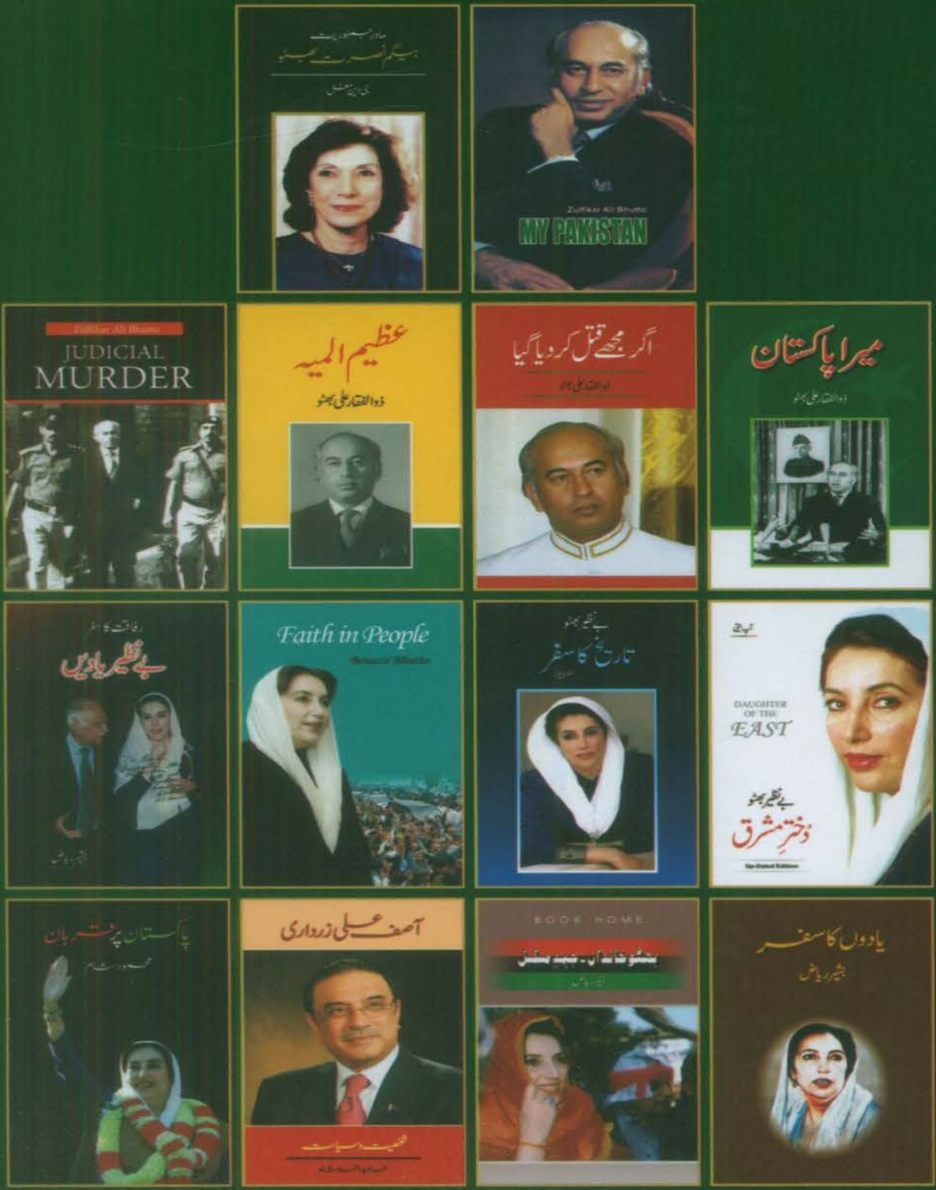

Design By
MUHAMMAD AHSUN **Gull**

بھٹو لیگیسی فاؤنڈیشن
158- سی ماڈل ٹاؤن لاہور
Bhutto Legacy Foundation